"شناختِ استکبار"

تالیف

جواد منصوری

دار الثقافۃ الاسلامیۃ پاکستان

"شناختِ استکبار"

تالیف
جواد منصوری
سفیر کبیر اسلامی جمہوریہ ایران در پاکستان

یکے از مطبوعات
دار الثقافۃ الاسلامیۃ پاکستان
۲ - جے - ۵/۴ ـــــ ناظم آباد ـــــ نمبر ۲ ـــــ کراچی

نام کتاب ________ شناختِ استکبار

تالیف ________ جواد منصوری۔ سفیرِ اسلامی جمہوریہ ایران۔ پاکستان

ترجمہ ________ معین نظامی۔ سید فیضی

طبع اوّل ________ محرم ۱۴۱۲ھ اگست ۱۹۹۱ء

طبع دوّم ________ جمادی الاوّل ۱۴۱۳ھ نومبر ۱۹۹۲ء

تعداد ________ ۲۰۰۰

ناشر ________ دارالثقافۃ الاسلامیہ پاکستان

NAJAFI BOOK LIBRARY
Managed by M'soomeen Welf re Trust (R)
Shop No 11, M L. H ights,
Mirza Ka ej a ig Road,
Soldier Bazar, Karachi-74400, Pakistan

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست

پیش گفتار الف

حصّۂ اوّل: استکبار

از ۱ تا ۵۷

فصلِ اوّل: اِستکبار، استعمار اور امپیریلزم کی تعریف

از ۳ تا ۲۲

○ اِستکباری نظام اور عالمی نظامِ کُفر کا مفہوم ۹

کُفر کے معنی و مفہوم ۱۰

کُفر: قُرآن میں ۱۱

○ اِستکباری نظام کے تشکیل پذیر ہونے کے عوامل ۱۳

۱ــ نسلی و ذاتی برتری پر اعتقاد ۱۶

۲ــ عالمی حقائق کا انکار ۱۷

۳ــ حکومت اور مادّی قُدرت کی کشش ۱۸

○ موجودہ صدیوں میں استکباری نظام کیسے تشکیل پذیر ہوا ۱۸

فصلِ اوّل: چند جُملوں میں ۱۲

فصلِ دوّم: نظاموں کی شناخت کا اُصُول

از ۲۳ تا ۳۵

ابتدائیہ ۲۳

○ نظام کا منبعِ ظہور اور اس کا تاریخی سفر ۲۴

○ سیاسی وقائع اور موضوعات کی شناخت کا طریقہ ۲۵

○ دُنیا میں نظامِ تسلُّط سے متعلق مختلف نظریات ۲۶

الف ــ دُنیا میں نظامِ تسلُّط نہیں ہے اور جو کچھ ہے، اقوام کا ارادہ ہے ۲۷

ب ــ تسلُّط ایک لازمی امر ہے ۲۷

ج — دُنیا ایک واحد معاشرہ ہے ۲۸
دُنیا کے چند مشہور نظریہ پردازوں کا نُقطۂ نظر ۲۹
۱ — کارل مارکس کا نظریہ ۲۹
۲ — ہابسن کا نظریہ ۳۰
۳ — لگزیمبرگ کا نظریہ ۳۲
• فصلِ دوّم: چند جُملوں میں ۳۴

فصلِ سوّم: استکباری نظام کا ثقافتی ڈھانچہ

از ۳۷ تا ۵۷

ابتدائیہ ۳۷
انسان: اِستکباری نظاموں میں ۳۸
۱ — استکباری نظام میں انسانی خصوصیات ۳۸
الف — انسانی قدر و قیمت ۴۰
ب — انسان کا نصب العین ۴۱
ج — دُنیا طَلَبی ۴۱
۲ — اَخلاق کا تناسبی ہونا ۴۳
۳ — انسان، سرمایہ دار اور سوشلسٹ مُعاشرے میں ۴۷
مُعاشرہ: اِستکباری نظاموں کے نُقطۂ نظر میں ۴۹
میکیاولزم ۵۱
دُنیا: استکباری نظاموں کے نُقطۂ نظر سے ۵۲
۱ — دُنیا کی قدر و قیمت ۵۲
۲ — انسان اور دُنیا ۵۳
۳ — قدر و قیمت کے معیارات ۵۴
○ انسان اور دُنیا کے باہمی دو طرفہ رابطے کی یک طرفہ رابطے میں تبدیلی ۵۴
فصلِ سوّم: چند جملوں میں ۵۶

حصّہ دوّم: استکبار کے عملی اور اجرائی طریقے

از ۵۹ تا ۲۱۷

ابتدائیہ ۶۱

فصلِ اوّل: فوجی ہتھکنڈے

از ۶۲ تا ۸۲

۱— براہِ راست فوجی دخل اندازی اور موجودگی ۶۳
۲— سازش اور بالواسطہ موجودگی ۶۶
۳— علاقائی تنازعات اور سرحدی اختلافات پیدا کرنا ۶۷
الف— عربوں کے مقابلے میں اسرائیل ۶۹
ب— نسلی تعصب کے قائدین کو مُسلّح کرنا ۷۲
۴— اسلحے کی تجارت (موت اور فنا کی سوداگری) ۷۳
○ برِصغیر ہند (وپاکستان) ۷۷
○ خلیجِ فارس اور جزیرہ نمائے عرب ۷۸
○ اسلامی انقلاب سے پہل ایران کا خریدا ہوا اسلحہ ۷۹
فصلِ اوّل، چند جُملوں میں ۸۱

فصلِ دوّم: سیاسی چالیں

از ۸۳ تا ۱۰۸

۱— پٹھو ذرائع ابلاغ کے ذریعے رائے عامّہ پر تسلُّط ۸۵
الف— بین الاقوامی خبر رساں ایجنسیاں ۸۶
ب— ریڈیو اور ٹیلی ویژن ۸۷
ج— سینما اور تھیئیٹر ۸۸
د— مطبوعات ۸۸
۲— تفرقہ پردازی اور اتحاد اور قومی وحدت کا خاتمہ ۹۰
۳— بین الاقوامی اداروں اور اسمبلیوں کو آلۂ کار بنانا ۹۶

اقوامِ مُتّحدہ ۹۸
بین الاقوامی اداروں اور کانفرنسوں میں اسلامی جمہوریۂ ایران کی شرکت کے اسباب ۱۰۰
۴— پٹھو حکومتوں کی طرف سے حمایت اور مخالف تحریکوں اور عوامی بغاوتوں کی سرکوبی ۱۰۳
فصلِ دوّم: چند جُملوں میں ۱۰۷

فصلِ سوّم: ثقافتی و معاشرتی چالیں

از ۱۰۹ تا ۱۴۹

۱— ثقافتی بُنیادوں اور انسانی قدروں کی نفی ۱۱۰
۲— نظامِ تعلیم پر کنٹرول اور اس میں نفوذ ۱۱۲
۳— فساد کی ترویج و اشاعت ۱۱۴
الف— منشّیات کا مسئلہ ۱۱۶
ب— فحاشی کا فروغ ۱۱۷
۴— قوم پرستانہ نظریّات کا اِلقاء ۱۱۸
قومیت (نیشنلزم)، بیسویں صدی میں ۱۲۱
۵— کار آمد افراد اور قُوتوں کو اپنی طرف کھینچ لینا ۱۲۴
۶— افسروں اور صاحبانِ اقتدار کی تربیت ۱۲۹
دُنیا میں فری میسنری کا ظہور ۱۳۳
فری میسنری ایران میں ۱۳۳
۷— دین کی سیاست سے جُدائی ۱۳۶
تحریمِ تمباکو کا واقعہ ۱۴۳
علم اور دین میں تضادّ ۱۴۵
فصلِ سوّم: چند جُملوں میں ۱۴۸

فصلِ چہارم: اقتصادی چالیں

از ۱۵۱ تا ۱۸۵

۱— زیرِ تسلُّط مُمالک اقتصاد کو وابستہ اور واحد پیداواری بنانا ۱۵۲

۲۔ قومی اور روایتی اقتصاد کی پراگندگی ۱۵۶
۳۔ بین الاقوامی انحصاری اداروں کا قیام (تجارتی انجمنیں اور ٹرسٹ) ۱۵۹
حکومتوں کی طرف سے کارٹلوں کی حمایت ۱۶۱
دہشت گردی اور طاقت کے ہتھکنڈوں سے فائدہ اُٹھانا ۱۶۲
مارکیٹوں پر اقتصادی غلبے کے نفاذ اور تسلسل کے لیے ذخیرہ کرنے کی پالیسی ۱۶۳
مشین سازی کی صنعت اور کارٹلوں سے وابستہ صنعتوں کی حوصلہ افزائی ۱۶۴
رشوت دہی ۱۶۶
غیر ملکی سرمایہ کاری کا تباہ کُن دور ۱۶۶
۴۔ زیر تسلُّط ممالک کے ذخائر و وسائل کی تاراجی ۱۷۰
۵۔ ممالک کو مقروض بنا کر انہیں زیرِ بار کرنا ۱۷۴
۶۔ تیسری دُنیا کے ممالک کے قرضہ جات ۱۷۷
مریض کے خُون کی مُنتقلی تندرست میں ۱۸۰
بین الاقوامی مالیاتی فنڈ ۱۸۱
فصلِ چہارم: چند جُملوں میں ۱۸۴

فصلِ پنجم: انقلابِ اسلامی کے مقابلے میں استکباری سازشیں

از ۱۸۷ تا ۲۱۷

ابتدائیہ ۱۸۷
اسلامی جمہوریۂ ایران کے خلاف ثقافتی جنگ ۱۹۰
مُخالفین کے مقابلے میں اِستکبار کے ردِّعمل کے عُمومی خصائص ۱۹۱
۱۔ اس کی جامعیت ۱۹۱
۲۔ سازشوں کی منصوبہ بندی ۱۹۱
۳۔ تشدُّد و تمرُّد ۱۹۲
ثقافتی جنگ کی خصوصیات ۱۹۳
۱۔ دراز مُدّت ۱۹۳

۲— بنیادی اور انتہا پسندانہ	۱۹۳
۳— بظاہر حق بجانب اور قانونی	۱۹۴
۴— بالواسطہ	۱۹۴
مُسلّط کردہ جنگ	۲۰۷
فوجی جارحیت کا آغاز	۲۰۸
مُسلّط کردہ جنگ کی ماہیت	۲۰۹
اقتصادی گھیراؤ	۲۱۱
فصلِ پنجم: چند جُملوں میں	۲۱۶
فہرستِ منابع و مآخذ	۲۱۸

پیش گفتار

سماجیات کے ماہروں، تاریخ نگاروں اور ان تمام لوگوں نے، جنھوں نے مختلف لوگوں کی خواہشات کی پروا کیے بغیر، طرح طرح کی گذشتہ اقوام کی سرگذشت میں سے اپنے تجربات، موجودہ اور آنے والی نسلوں کے لیے یادگار چھوڑے ہیں، بالاتفاق، زندگی کے مختلف پہلوؤں کی آگاہی اور شناخت، اس کی خصوصیات کی تشخیص اور آنے والی تحریکوں کے سلسلے میں واضح خطوط کی ترسیم کو اُن اقوام کی کامیابی و کامرانی کا اصل راز قرار دیا ہے۔ حُرّیت، خود اعتمادی اور جسارت جیسی واضح خصوصیات کے بغیر اس پُر خطر راستے کو عبور کرنا اگر ناممکن نہیں تو بھی کٹھن اور طولانی ضرور ہے۔ شاید ہی کوئی قوم اپنی زندگی کے حسّاس اور فیصلہ کن مراحل ان خصوصیات میں سے کسی ایک کے بغیر سلامتی سے طے کر سکی ہو۔

اپنی اور اپنے ہمراہیوں کی خصوصیات سے آگاہی اور ان کی پہچان، نیز جو کچھ مقابلے میں ہے (اس کی پہچان) خواہ وہ راستے کی رکاوٹیں ہوں یا راہزن، نہ صرف مؤرخین نے انہیں باربار بیان کیا ہے بلکہ دینی قائدین اور مذہبی رہنماؤں نے بھی، جو زندگی ساز اور حیات آفرین ہیں، اس کی پر زور تاکید کی ہے۔

امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام کے نزدیک کامیابی کے حصول کے لیے دشمن کی پُوری شناخت اور اس کے سازوسامان اور تیاریوں کا ٹھیک ٹھیک اندازہ انتہائی ضروری ہے۔ اس طرح کی خبروں کا علم رکھنا امور معاشرہ کے ذمہ دار اور صاحبِ اختیار لوگوں پر لازم آتا ہے کیونکہ اس قسم کا علم ان مقاصد کے حصول میں کامیابی کی ضمانت بنتا ہے جن پر وہ مامور ہوتے ہیں۔

ہمارے عہد ساز اسلامی انقلاب کی کامیابی کی وجہ بیکراں خدائی قوت پر بھروسہ، وحدت، قیادت کا اقتدار اور عوامی قوتوں کی شمولیت اور ان کا استحکام سمجھا جانا چاہیے۔ انھی اسباب و عوامل کے تحقق پذیر ہو جانے سے ایرانی معاشرے کے اہم معاملات میں اغیار کے ناپاک

ہاتھوں کی دخل اندازی کا خاتمہ ہو سکا اور اب تک ہماری مجاہد قوم کے لیے عالمی کفر کے مختلف پہلوؤں کے ساتھ اس کے بہادرانہ مقابلوں میں یہی چراغِ راہ روشنی دے رہا ہے۔

اسلامی انقلاب درخشندہ و تابندہ سورج کی شعلہ بھری شعاع کی مانند ہے جو عالمی غلبہ پرست نظاموں کے برفیلے پہاڑ کو پگھلانے آیا ہے، جس نے دنیا کو مضمحل بنا رکھا ہے پگھلا کر رکھ دے اور مظلوم و محروم دلوں کو ایک عمر کی مسلّط کردہ ظلمت و تاریکی برداشت کرنے کے بعد، روشن دنوں کی خوشخبری سُنا سکے!

وہ ثابت و استوار پیغام جو ایسے نظریاتی اور تاریخ ساز انقلاب پر قائم ہے، ہر طرح کی غلبہ پرستی اور غلبہ پذیری کو نیست و نابود کرنے اور اس استکباری نظام کو سرنگوں کرنے کے لیے جدوجہد ایک ایسا اقدام ہے جس نے دنیا بھر کے انسانوں کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر انحراف، ظلم اور تجاوز کا رنگ چھڑک رکھا ہے۔ اگر ہم انقلاب اور اسلامی جمہوریہ کے حقیقی امن و سلامتی کے لیے سازگار فضا چاہتے ہیں تو وہ بلاشبہ دنیا سے دائیں اور بائیں بازو کے جہانخواروں کی مکر و فریب اور غلبہ پرستی کی بساط لپیٹ دینے ہی میں ہمیں مل سکے گی۔

مشرق و مغرب کے تجاوزِ استکبار اور روشِ غارتگری کا یہ عالم ہے کہ کوئی قوم بھی، خواہ وہ دنیا کے مشرق میں ہو یا مغرب میں، ان کے مکر و فریب سے محفوظ نہیں ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ اس ''شجرۂ خبیثہ'' کی جڑیں زیرِ تسلّط ممالک سے حاصل ہونے والے مواد اور قوت سے غذا حاصل کرتی ہیں۔ ذلّت پذیری، ضعفِ شخصیت، قائدین کی خود فروشی اور اس کے نتیجے میں حقیر ترین استکباری مظہر کے مقابلے میں ڈٹ جانے سے پرہیز اور خوف، عوام کی غیر معمولی طاقت پر بے یقینی اور اصولاً اسے کام میں لانے سے پرہیز، خودپرستیوں، ذاتی خواہشوں اور ہوس ہائے نفسانی کی پیروی، خدا اور معنویّات کو اپنی اور قوم کی زندگی کے منظر سے ہٹا دینا، یہ اُن پٹھو حکومتوں کی اہم ترین کمزوریاں ہیں جنہوں نے دنیا کے اکثر ممالک کی زمامِ اقتدار اپنے نااہل اور بے صلاحیت ہاتھوں میں تھام رکھی ہے۔ انہوں نے مرز و بوم اور قوموں کی مادّی و معنوی ہستی کو استکبار کے کامیاب ترین غیر انسانی ہتھکنڈوں کی تجربہ گاہ بنا رکھا ہے۔ ایسے معاشروں میں جو چیز سب پر مقدّم ہے وہ غلبہ پرستوں کے ناجائز اور کبھی نہ ختم ہونے والے مفادات ہیں کہ جن کی حفاظت کے لیے سب نے کمرِ ہمت باندھ رکھی ہے، جیسے یہ کوئی جبر ہو جس کی خلاف ورزی ممکن نہ ہو اور اسی کی

حفاظت کے لئے سب نے کمرِ ہمت باندھ رکھی ہو۔

غلبہ پرستی کا یہ نظام اگر ماضی میں فوج کشی، فتوحات، غلام بنا کر رکھنے اور شہنشاہوں اور سلاطین کی بربریت کی دوسری صورتوں میں جلوہ گر تھا تو اب ——— نئے عالمی تقاضوں سے آگاہی رکھتے ہوئے ——— اس نے ایک ہولناک اور مہیب جن بھوت بن کر، سیاسی و ثقافتی چالبازیوں اور مکر و فریب نیز پراپیگنڈے کے پُر پیچ جالوں کی صورت میں قوموں کی زندگی کے مختلف مظاہر کو پوری طرح اپنے تباہ کن اثر و رسوخ کے سائے میں لے رکھا ہے۔

غلبہ پرست نظام نے نئے اقتصادی راہ و رسم کے لیے مخصوص سیاسی روابط اور سب سے بڑھ کر ایک مخصوص قسم کی ثقافت کی سازش کی ہے تاکہ گمراہ کن زرق و برق کی نمائش سے اسے اصلی اور مقامی بلکہ مختصر لفظوں میں عوامی اور روایتی نظاموں کی جگہ دلا دے۔ اس سازش کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے معلومات و اعتقادات اور دوسرے لفظوں میں قوموں کی ثقافت و اعتقاد، غلبہ پرست نظام کے اقتدار کی پائداری اور استحکام کی راہ میں ایک زبردست خطرہ ہے۔

اب اقوام و ملل خاص طور پر تیسری دنیا کی اقوام میں روابطِ اجتماعی اور پروپیگنڈے کے یہ خوفناک بچھے ہوئے جال اس مقصد سے عبارت ہیں کہ:

عوام کی رائے عامہ پر زیادہ سے زیادہ اثر و رسوخ ڈالا جائے، انہیں اپنے روایتی طرزِ زندگی سے گمراہ اور منحرف کیا جائے، اصلی اور قومی ثقافت کی نفی یا کم از کم اس کی کارآمد قابلیتوں سے انکار ہو، اعلیٰ خدائی اور انسانی اقدار کو مخدوش بنایا جائے، جہاں کہیں بھی خدا کے نام یا اس کے وجود کا کوئی اثر دکھائی دے وہاں الحاد اور مادیّت کا پرچار کر کے اُسے ختم کیا جائے اور آخری کوشش یہ ہو کہ ترقی یافتہ ثقافت کے معیاروں کے نام پر پُرکشش استعماری مظاہر کو اس بہانے رائج کر دیا جائے کہ صرف یہی ایک دوا ہے جس سے پس ماندہ اور فرسودہ معاشروں کی تمام بیماریوں کا علاج ہو سکتا ہے۔

کل تک تو صرف جنگی دلاوروں کے گٹھے ہوئے بازو ہی جابرانہ استعماری حکومتوں میں زلزلہ پیدا کر سکتے تھے اور عوامی غیظ و غضب کی منجنیق سے پھینکے جانے والے پتھر ہی غلبہ پرستوں کے مظالم کے محلّات کو نیست و نابود کر سکتے تھے، لیکن آج عوام کو بیدار اور خبردار

کیے بغیر، بڑی باریک بینی سے سوچے سمجھے ہوئے پروگرام کے بغیر، دشمن کی تعداد اور تیاریوں کے بارے میں چھوٹی سے چھوٹی اطلاعات اور اعداد و شمار سے آگاہ ہوئے بغیر اور دوسرے جنگی اصولوں کو پیشِ نظر رکھے بغیر عالمی تسلّط پرستانہ نظام کا مقابلہ کرنا تو کجا، تھوڑے سے عرصے کے لیے بھی اس کے خلاف جد و جہد جاری رکھنے کا امکان نہیں۔

اگر اسلامی جمہوریۂ ایران کے خلاف عراق کی وساطت سے ٹھونسی جانے والی استکباری جنگ کے نسبتہً طویل عرصے کے دوران ایران کی مسلمان قوم کے عزم و ہمت اور اس کی کامیابی و کامرانی کا بغور تجزیہ کیا جائے تو افواج کا اتّحاد، اسلحے اور صلاح مشورے سے ان کا لیس ہونا، کبھی نہ ڈگمگانے والی روحانی قیادت اور اصلی دشمن کے اہداف اور اس کی ماہیت سے مکمل آگاہی جیسی نمایاں خصوصیات بخوبی واضح ہو کر سامنے آجاتی ہیں۔

اس کتاب میں جو مطالب بیان کیے گئے ہیں وہ "استکبار" اور "عالمی امپیریلزم" کی بہتر اور زیادہ واضح شناخت اور اسلام اور مسلمانوں کے وجود کے حفظ و بقاء کے لیے ایک اور کوشش ہے۔ یہ مطالب اس سے پہلے کتابی شکل میں "امپیریلزم کی خصوصیات" کے نام سے دوبار شائع ہو چکے ہیں تیسری اشاعت میں گذشتہ برسوں کی اہم تبدیلیوں کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے اس پر مکمل نظر ثانی کی گئی اور کچھ اضافے بھی کیے گئے جو شاید کتاب کو زیادہ مفید اور زیادہ مناسب بنا سکیں۔

امید ہے کہ خدائے بزرگ و برتر کی عنایات سے صاحبِ نظر اور دانشور حضرات اس غیر انسانی مظہر کے مختلف پہلوؤں کی تشریح و توضیح پر کمربستہ ہو کر اپنے خدائی پیغام کی نشر و اشاعت میں حصّہ لینگے اور اس رسالے کی تنقیح و تکمیل اور دوسرے مقالات کی تدوین و ترتیب کے ساتھ مستضعفین، غلبہ پرست نظام کے مظلوم محروموں کا وہ قرض ادا کریں گے جو ان کے ذمّے ہے۔ انشاء اللہ

فروردین ۱۳۶۷

جواد منصوری

حصّہ اوّل

استکبار

فصلِ اوّل

استکبار، استعمار اور امپیریلزم کی تعریف

استکبار: (۱)

لغوی اعتبار سے استکبار کا مطلب ہے:

کسی شخص یا چیز کو بڑا سمجھنا، بڑائی جتانا، اپنے آپ کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا اور تکبّر کرنا۔ (۲)

ہمارے زیرِ بحث موضوع میں استکبار سے مراد تکبّر میں مبالغے اور افراط کا پہلو ہے۔ یعنی یہ کہ بعض افراد ہر طرح کی عزّت و عظمت اور مرتبہ و مقام کو محض اپنی ذات تک محدود سمجھتے ہیں اور اسی وجہ سے ان کے اندازِ فکر اور عملی کردار کو "استکبار" کا نام دیا جاتا ہے اور وہ خود "مُستکبر" کہلاتے ہیں۔

قرآنی آیات سے پتہ چلتا ہے کہ استکبار بہت ہی قدیم زمانوں سے چلا آرہا ہے۔ اور حقیقت میں کُرۂ ارض پر انسان کی اجتماعی زندگی کے دورِ آغاز ہی سے اس کا کھوج لگانا چاہیے۔ اس بناء پر جامعیت اور عمومیت استکبار کی خصوصیات میں سے ہیں۔ کیونکہ اس کا کوئی خاص مبدا ء تاریخ نہیں اور یہ ہمیشہ سے تاریخِ بشر کے ساتھ ساتھ چلا آرہا ہے۔ دوسرے لفظوں میں کہا جاسکتا ہے کہ جب سے انسان کا وجود ہے، استکبار بھی موجود رہا ہے۔

اس طرح استکبار، شیطان کے خود پسندانہ استدلال اور اس کی سرکشی سے شروع ہوتا ہے، جب اس نے آدمؑ کو سجدہ کرنے کے حکمِ خداوندی کی اطاعت سے روگردانی کرکے کِبرَ کا

---

(۱)—ARROGANCE

(۲)—اس لفظ کا مادہ کِبْر اور کِبَر ہے۔ عربی زبان میں کِبَر کا لفظ بزرگی، قدر و منزلت اور بلحاظ عمر بزرگی کے بیان کے لئے استعمال ہوتا ہے اور زیادہ تر انسان اور غیر مادی بڑائیوں کے لئے مستعمل ہے۔

تکبّر باب تَفَعُّل سے ہے۔ عربی زبان میں باب تَفَعُّل اس شخص یا چیز کے معنوں میں آتا ہے جو اپنے آپ کو اس صفت سے متصف کرے جو اس میں موجود نہ ہو۔ لہٰذا تکبّر سے یہ معنی مراد لیتے ہیں: اپنے آپ کو بڑا سمجھنا اور غرور۔

اگرچہ حقیقی تکبّر اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص ہے کیونکہ صرف اور صرف وہی ہے جو حقیقی اور انتہائی معنوں میں عظیم اور حقیقی قدر و منزلت والا ہے۔

ارتکاب کیا تو شیطان نے قسم کھائی تھی کہ وہ انسان کو گمراہ کرتا رہے گا، اس وقت سے استکبار کا آغاز ہوا اور یہ قوت کے ساتھ نشوونما پاتا رہا۔ (۱)

استعمار: (۱)

لغت میں اس لفظ کے معنی یہ ہیں: آباد کرنے کا ارادہ کرنا اور آباد کاری کی خواہش کرنا اور سیاسی اصطلاح میں اس سے مراد ہے کسی طاقتور ملک کا، کسی کمزور مُلک پر اس کے قدرتی ذخائر اور افرادی قوت سے استفادے کی نیت سے بظاہر اس کے عوام کی آباد کاری اور انہیں ترقی و خوشحالی کی راہ پر گامزن کرنے کے بہانے قبضہ۔ (۲)

قرآنِ مجید میں استعمار کا لفظ اپنے لغوی معنوں میں استعمال کیا گیا ہے:

" تمہیں چاہیے کہ زمینوں کو آباد کرو اور تمہاری قوت ہی سے زمینیں آباد ہونی چاہئیں"۔ (۳) صاف ظاہر ہے کہ یہ مفہوم اس لفظ کا لغوی اور مثبت معنی ہے۔

اپنی آجکل کی معروف صورت میں استعمار کا ظہور سولہویں صدی میں ہوا جو یورپی ممالک کے صنعتی ہونے کا دور ہے۔ اس دور میں انہیں تجارتی منڈی اور سستے خام مال کی فراہمی کی تلاش کا مرحلہ درپیش تھا۔ استعماری طاقتیں اپنے اثر و رسوخ کو وسعت دینے کے لئے

---

(۱) "قَالَ: فَبِعِزَّتِکَ لَاُغْوِیَنَّھُمْ اَجْمَعِیْنَ اِلَّا عِبَادَکَ مِنْھُمُ الْمُخْلَصِیْنَ"۔

شیطان نے کہا: اے اللہ! تیری عزت و قدرت کی قسم! میں یقیناً تمام انسانوں کو گمراہ کروں گا، سوائے تیرے پاک اور خالص بندوں کے۔

اس سلسلے میں مزید قرآنی آیات سے آگاہی کے لئے سورۂ ص آیات ۷۰ تا ۸۵ اور سورۂ بقرہ آیات ۲۹ تا ۳۹ کی طرف رجوع کیا جائے۔

(۱)—COLONIALISM

(۲)— ڈاکٹر معین، محمد: فرہنگِ فارسی معین، تیسری اشاعت، انتشارات امیر کبیر۔

(۳)— "وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاھُمْ صٰلِحًا قَالَ: یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ ھُوَ اَنْشَاَکُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاسْتَعْمَرَکُمْ فِیْھَا فَاسْتَغْفِرُوْہُ ثُمَّ تُوْبُوْا اِلَیْہِ اِنَّ رَبِّیْ قَرِیْبٌ مُّجِیْبٌ" (سورۂ ہود: ۶۱)

"ہم نے قومِ ثمود (کی ہدایت) کے لئے ان کے بھائی صالحؑ کو بھیجا۔ صالحؑ نے (اپنی قوم سے) کہا: اے میری قوم! خدا کی عبادت کرو (کیونکہ) اس کے سوا تمہارا اور کوئی معبود نہیں ہے اس نے تمہیں زمین سے پیدا کیا اور اسی نے یہ چاہا کہ تم زمین کو آباد کرو۔ پس (اس بناء پر) اس سے بخشش طلب کرو اور پھر اس کی طرف رجوع کر جاؤ بے شک میرا پروردگار قریب (اور) دعائیں قبول کرنے والا ہے۔"

دوسری سرزمینوں کی ترقی و خوشحالی کے بہانے سے اپنے ملک کی سرحدوں سے نکل آئیں اور انہوں نے دوسرے ممالک پر ناجائز قبضے اور لوٹ مار کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ وہ اپنے مقبوضہ علاقوں میں آباد کاری اور ترقی و خوشحالی کی علمبردار ہیں، لہٰذا انہوں نے دُوسرے ممالک پر قبضہ و تسلّط کو "استعمار" ——— بمعنی آباد کاری و خوشحالی ——— کا نام دیا۔ اس یلغار، لوٹ مار اور مقامی ذخائر کی بربادی یا دوسرے لفظوں میں ناجائز اور استعماری بالادستی کو انہوں نے شروع شروع میں تہذیب و تمدن کے فروغ اور بعد میں مختلف شعبوں میں وسعت و ترقی کے لئے ہمدردانہ اقدامات کے نام سے یاد کیا۔

دوسرے لفظوں میں استعمار کا آغاز تہذیب و تمدن عطا کرنے، انسانوں کو بنیادی آزادیاں فراہم کرنے اور انہیں وحشت اور بربریت سے نجات دلانے کے دعوے سے ہوا لیکن درحقیقت اس کا مقصد یہ تھا کہ زیرِ تسلّط ممالک کے وسیع مادّی و قدرتی ذخائر اور سستی افرادی قوّت سے فائدہ اٹھایا جائے۔

امپیریلزم: (۱)

اس لفظ کے لغوی معنی کسی ایسی شہنشاہی حکومت یا سیاسی نظام کی حمایت کے ہیں جس کا نصب العین دوسرے ممالک میں اپنا اثرورسوخ بڑھانا اور اپنی قوّت میں اضافہ کرنا ہو۔ شہنشاہیت کے معنوں میں امپیریلزم کا تاریخی پسِ منظر خاصا طویل ہے۔

بعض لوگوں نے امپیریلزم کے محض یہی معنی مراد لیے ہیں اور وہ موجودہ امپیریلزم اور قدیم شہنشاہیت کی ماہیت میں کسی فرق کے قائل نہیں۔

ماضی میں مختلف ممالک پر قبضہ کرنے کے بعد وہاں کے عوام کو کم و بیش ان کی حالت پر چھوڑ دیا جاتا تھا، ان پر کوئی حاکم مقرر کر دیا جاتا، ان سے ٹیکس وصول کیے جاتے، ان ممالک کے ذخائر کا استحصال کیا جاتا اور اپنے اقتدار کو وسعت دی جاتی تھی لیکن قبضہ کرنے والے وہاں اپنی ثقافت مسلّط نہیں کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ فاتحین اپنے مقبوضہ علاقوں

IMPERIALISM—(۱)

میں اپنے افکار و خیالات اور آداب و رسوم کے پرچار کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔

"مجموعی طور پر امپیریلزم ایک ایسا نام ہے جس کا اطلاق کسی ایسی طاقت (یا حکومت) پر ہوتا ہے جو اپنے قومی دائرے سے نکل کر دوسرے علاقوں پر قبضہ جمانے لگے اور وہاں ممالک کے عوام کو جبراً اپنی اطاعت پر مجبور کرے اور اپنے مفادات کی خاطر ان کے اقتصادی، مالی اور انسانی ذرائع کا ناجائز استعمال کرے۔

تشکیلِ شہنشاہیت کے مفہوم میں امپیریلزم کا وجود تاریخ انسانی کے آغاز سے ہی ثابت ہے" (۱)

قدیم زمانوں میں انبیاءؑ، ان کے جانشینوں، ائمہؑ اور رہبرانِ دین کے سوا کوئی بھی اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کا اہل نہ ہوا کہ وہ کوئی علاقہ فتح کر کے وہاں کے لوگوں کو تعلیم و تربیت دے یا انہیں اپنے دین کی دعوت دے۔ بنیادی طور پر فتوحات کا مقصد یہ نہیں ہوتا لہٰذا جن جنگوں کی نوعیت دینی ہے یعنی ان کا تعلق تبلیغِ دین سے ہوتا ہے، فاتحین کی جنگوں سے ان کا موازنہ نہیں کرنا چاہیے۔ (۲) لیکن آج جب ہم یہ کہتے ہیں کہ مغرب یا مشرق چاہتا ہے کہ پوری دنیا پر اپنی بالادستی قائم کر لے تو اس کا مطلب مغرب یا مشرق سے محض سیاسی و اقتصادی وابستگی نہیں ہے بلکہ کردار و عمل اور زندگی کے دوسرے تمام شعبوں میں مخصوص طرزِ عمل اختیار کرنا یا دوسرے لفظوں میں مغربی یا مشرقی تہذیب و تمدن کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینا ہے۔ درحقیقت امپیریلزم کا اصل مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

جامع اور عمومی معنوں میں ہم "امپیریلزم" کو "استکبار" سے تعبیر کر سکتے ہیں لیکن "استکبار" عمومیت کا حامل ہے جبکہ ایک خاص مقصد کے لیے لفظ "امپیریلزم" کا استعمال اپنا ایک الگ مفہوم اور نیا معنی رکھتا ہے۔ اور تاریخی اعتبار سے اس کی عمر سو سال سے زیادہ نہیں ہوگی۔ لہٰذا اگر اسے استکبار کے نام سے یاد کیا جائے تو یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ

---

(۱) اشوری، داریوش: دانشنامۂ سیاسی، اشاعت اول، انتشارات مروارید، سہروردی، صفحہ۔ ۳۶۔

(۲) ڈاکٹر داوری اردکانی، رضا: انقلاب اسلامی و وضعِ کنونی، انتشارات مرکز فرہنگی علامہ طباطبائی، صفحہ۔ ۱۵۲۔

اس سے ایک خاص قسم کا استکبار مراد ہے۔ (۱)

امپیریلزم، استعمار اور استکبار کے معنی و مفہوم میں ایک قریبی رابطہ موجود ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

جدید معنوں میں امپیریلزم کا لفظ پہلی بار مارکسٹوں نے استعمال کیا۔ لینن (۲) کے زمانے میں لفظ "امپیریلزم" مارکسٹی ادب کی مشہور ترین اصطلاح کے طور پر بہت زیادہ رائج تھا۔

لینن نے نومبر ۱۹۱۴ء میں، جنیوا میں اپنے قیام کے دوران شائع ہونے والے ایک مضمون میں لکھا:

"بہت جلد امپیریل جنگ شروع ہو جائے گی۔"

اپنے اس مقالے میں اس نے امپیریلزم کو سرمایہ داری کا مرحلۂ عروج قرار دیا اور یہ پیشین

---

(۱)۔ امپیریلزم کا لفظ ایک قدیم تر لفظ "شہنشاہی = EMPIRE سے ماخوذ ہے اور یہ لفظ ۱۸۹۰ء کے عشرہ میں انگلستان میں رائج ہوا۔ "جلد ہی یہ لفظ دوسری زبانوں میں استعمال ہونے لگا اور اس سے افریقہ اور دوسرے براعظموں میں کالونیاں حاصل کرنے اور اپنا حلقۂ اثر بڑھانے کے لیے یورپی طاقتوں کی کشمکشوں کے بیان کے لیے استفادہ کیا جانے لگا۔ یہ کشمکشیں ۱۸۸۰ء سے ۱۹۱۴ء تک بین الاقوامی سیاست پر چھائی رہیں اور انہی کی وجہ سے یہ زمانہ "امپیریلزم کا دور" کہلاتا ہے۔ انگریزوں کا بھی یہی دعویٰ تھا اور براعظم یورپ کے دوسرے امپیریلسٹ بھی یہی دعویٰ کرتے تھے کہ ان کا نصب العین یہ ہے کہ وہ تہذیب و تمدن کو فروغ دیں اور پست تر نسل اور ثقافت کے لوگوں تک تمدن کے ثمرات پہنچائیں۔ لیکن پوری انسانیت کے لیے پیغام کے اس احساس کی بنیاد میں سفید نسلوں کی نسلی، مادّی اور ثقافتی برتری کا عقیدہ کار فرما تھا۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد، امپیریلزم کا نظریہ، فاشزم اور نازی ازم کے نظریات میں اپنے کمال کو پہنچ گیا۔"

آشوری، داریوش: دانشنامۂ سیاسی، اشاعت اول، انتشارات مروارید سہروردی، ص ۳۷۔

(۲)۔ ویلاڈیمر ایلچ لینن۔ Veladimir Ilich Lenin (۱۸۷۰ء — ۱۹۲۴ء)

قائدِ انقلاب اکتوبر ۱۹۱۷ء روس، روس میں کیمونسٹ حکومت کا بانی اور ۱۹۱۷ء تا ۱۹۲۴ء تک متحدہ روس کا مردِ اوّل۔

گوئی کی کہ یہی نقطۂ عروج، کیپیٹلزم (۱) کا خاتمہ ثابت ہو گا۔

لینن نے جنیوا میں، ۱۹۱۶ء میں (انقلابِ روس کے زمانے میں) "امپیریلزم، سرمایہ داری کا مرحلۂ عروج" کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں مارکس (۲) کے نظریات کے سلسلے میں ایک نئی تھیوری اور نئے نظریے کی تشریح و توضیح کی۔ اس نے امپیریلزم کی دو خصوصیات و صفات کا ذکر کرتے ہوئے اسے عہدِ سرمایہ داری کا نقطۂ عروج اور نقطۂ اختتام قرار دیا۔ کیونکہ (اس کے خیال میں) امپیریلسٹوں کے مابین حریفانہ کشمکش کا نتیجہ جنگ و نزاع کی صورت میں بر آمد ہوتا ہے۔ جنگ ظہورِ انقلاب کا باعث بنتی ہے اور انقلاب بالآخر سرمایہ داری اور امپیریلزم دونوں کو نیست و نابود کر دیتا ہے۔

لینن کے نقطۂ نظر سے دو مذکورہ خصوصیات (۳) یہ ہیں:

---

(۱)— کیپیٹلزم یا سرمایہ داری = CAPITALISM، ایک ایسا نظام ہے جو صنعتی انقلاب کے ظہور کے ساتھ پہلے مغربی یورپ اور امریکہ میں رائج ہوا اور پھر اسے دوسرے ممالک میں بھی فروغ حاصل ہوتا گیا۔ اس نظام میں سادہ پیداواری طریقوں کے مطابق انسانی و حیوانی قوت کی بجائے، پیداواری آلات کے طور پر مشینی آلات کو مرکزی کردار حاصل ہے اور اجتماعی نظامِ زندگی کا ایک بڑا حصّہ، صنعتی پیداواری ضروریات اور سرمائے کی قوت سے تشکیل پاتا ہے۔ معاوضے کے نقطۂ نظر سے، اقتصادی سرگرمی کا زیادہ حصّہ —— خاص طور پر مالکیت اور مال کی پیداوار کے لیے سرمایہ کاری —— افراد اور پرائیویٹ کمپنیوں (غیر حکومتی) کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ جن کا مطمحِ نظر کاروباری رقابت کی وجہ سے منافع کا حصول ہوتا ہے۔

(۲)— کارل مارکس = Karl Marx (۱۸۱۸—۸۳ء) جرمن فلسفی، ماہرِ اقتصادیات اور ماہرِ سماجیات اور مارکسزم کے سیاسی و فلسفیانہ نظریات کے دو بانیوں میں سے ایک۔

(۳)— مارکسسٹ، امپیریلزم اور اس کی درج ذیل پانچ مشہور شقوں سے مربوط تھیوری کی تشریح و توضیح اور تجزیہ و تحلیل، لینن سے منسوب کرتے ہیں:

الف: پیداوار اور سرمائے کا تمرکز اور ایک جگہ انبوہ بلاشرکت غیرے تجارت/اجارہ داری (Monopoles) کا باعث بنا۔ اس مرحلے میں اجارہ دار، اقتصادی زندگی میں فیصلہ کن کردار ادا کرتے ہیں۔

ب: بینک کے سرمائے اور صنعتی سرمائے مل کر قوتِ سرمایہ اور چند ثروت مندوں کی حکومت (الیگارشی/Oligarchie) کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

پ: پیداوار کی بر آمد کی بجائے سرمائے کی بر آمد ایک خاص اہمیت حاصل کر لیتی ہے۔

ت: سرمایہ داروں کی اجارہ دارانہ انجمنوں اور کمیٹیوں کی تشکیل۔ یہ انجمنیں کارٹلز (Carteles)، ٹرسٹس (Trusts) اور کنسرشیومز (Concersiumes) کی صورت میں دنیا کو اقتصادی لحاظ سے باہم تقسیم کر لیتی ہیں۔

ث: عظیم ترین اور امیر ترین سرمایہ دار حکومتوں کے درمیان دنیا کے خطوں کی علاقائی تقسیم کا خاتمہ اور ان کی نئی تقسیم کا آغاز۔

۱— انحصاری ہونا: یعنی میدانِ رقابت میں داخل ہونا، حریفوں سے مقابلہ، ان کا اور دوسری پیداواری طاقتوں کا خاتمہ اور اس کے نتیجے میں خود ایک انحصاری طاقت کی صورت اختیار کر لینا۔

۲— قریب الاختتام ہونا: یعنی یہ کہ سرمایہ داری اپنے عروج و ارتقاء کے بلند ترین مرحلے میں نقطۂ اختتام تک پہنچ جائے گی اور امپیریلزم اور کیپیٹلزم کی بنیادوں کی تباہی و بربادی کے ساتھ سوشلزم (۱) کا مرحلہ شروع ہو گا۔

بیسویں صدی کے شروع میں لینن کے نظریے کو بہت سے لوگوں کی حمایت حاصل ہوئی اور اس کی اشاعت کے ساتھ ہی (۱۹۱۶ء) پہلی عالمی جنگ (۱۷—۱۹۱۴ء) کے آغاز نے اس مفروضے کو تقویت بخشی کیونکہ مذکورہ جنگ سرمایہ داری کے اوجِ کمال، لمحۂ اختتام اور درحقیقت اس کی تباہی و بربادی کے مرحلے کی نشاندہی کر رہی تھی۔

استکباری نظام اور عالمی نظامِ کفر کا مفہوم

استکبار، کفر کے مجموعۂ صفات میں سے ایک صفت ہے، دوسرے لفظوں میں استکبار، کفر ہی کا ایک حصّہ اور اسی کی ایک کڑی ہے۔ اسے عالمی استکباری نظام کی بجائے عالمی نظامِ کفر کہا جا سکتا ہے۔ اسلامی جمہوریۂ ایران کی سیاسی لغت میں اس اصطلاح کے رواج کی اہم ترین وجہ یہ ہے کہ درحقیقت دنیا کے تسلّط پرست نظاموں کی واضح اور نمایاں کافرانہ خصلت ان کا استکباری پہلو ہے۔ ساتھ ہی وہ خصلت جو اپنے اصطلاحی مفہوم سے سب سے زیادہ ہٹ کر، کفر کی نشاندہی کرتی ہے، وہ اس نظام کا کافر ہونا ہے۔ جو خصلت، حق اور حقیقت کے ساتھ سب سے بڑھ کر مقابلہ کرتی ہے، وہ کفر کا استکباری پہلو ہے۔

---

(۱)— سوشلزم / Socialism: یا معاشرے کا اصل اور خالص ہونا (جامعۂ باوری)۔ یہ لفظ، Social سے نکلا ہے، جس کا مطلب ہے معاشرتی۔ اس کے کئی معانی ہیں۔ لیکن آکسفورڈ انگلش ڈکشنری کے مطابق: سوشلزم ایک ایسا نظریہ یا سیاسی نظام ہے جس کا نصب العین پیداواری وسائل یعنی سرمایہ، زمین، مال اور اس طرح کی تمام اشیاء پر مجموعی طور پر پورے معاشرے کی ملکیت یا سرپرستی کا قیام اور سب کے فائدے کے لیے ان کا انتظام ہے۔

حقیقت میں دنیا پر حکومت کرنے والا سیاسی نظام کفر کی خصوصیات اور ماہیت کا حامل ہے اور اس کی پہچان کے لیے لامحالہ کفر کی شناخت ضروری ہے۔ دنیا میں موجود نظام سے جو کچھ پتہ چلتا ہے وہ یہی ہے کہ کافر اقلیت کی کافر اکثریت پر بالادستی اور حکومت ہے۔ دوسرے لفظوں میں عالمی کفر کا دائرہ محض بڑی اور خود کفیل حکومتوں اور اصلی استعماریوں تک ہی محدود نہیں بلکہ اس میں ان طاقتوں کی بہت سی پٹھو حکومتیں بھی شامل ہیں۔

کُفر کے معنی و مفہوم

جب بھی کافر کے بارے میں بحث کی جاتی ہے تو اس سے مراد کفر کے سرغنے ہوتے ہیں۔ یہ سرغنے جو کافر ہونے کے ساتھ ساتھ، دوسرے کفّار کے مقابلے میں نہ صرف مقام کے اعتبار سے بلند تر بلکہ اہمیت کے لحاظ سے بھی برتر خیال کئے جاتے ہیں۔ یہ اس لیے کہ استکبار کے مقابلے میں کفر کے معنی زیادہ جامع اور زیادہ عمومی ہیں۔ مستکبر، مسلّمہ طور پر کافر ہونے کے علاوہ، دوسرے کافروں کے مقابلے میں کفر کے اعلیٰ درجات و مراتب پر فائز ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں جس طرح ایمان کے درجات و مراتب ہوتے ہیں، ویسے ہی کفر بھی درجات و مراتب کا حامل ہوتا ہے۔ (۱)

لغت میں کفر کے معنی چُھپانے یا ڈھانپنے کے ہیں۔ کفر کا یہ معنی و مفہوم بتدریج، خاص طور پر قرآن مجید کے نزول و ظہور کے بعد تبدیل ہوگیا، اور اس سے زیادہ تر حق کو چھپانے یا حق کا انکار کرنے کے معنی مراد لیے جانے لگے۔ بہ الفاظِ دیگر ظہورِ اسلام کے بعد "کفر" اپنے لغوی معنوں میں کم اور جدید اصطلاحی معنوں میں زیادہ استعمال ہونے لگا۔ (۲)

---

(۱)— مزید مطالعہ کے لیے دیکھیے: اصولِ کافی، کتابِ کفر و ایمان اور اسی طرح قرآنی تفاسیر مثلاً تفسیر المیزان جلد اوّل (تفسیر آیات ۱۳ تا ۲۵ سورۂ بقرہ)۔

(۲)— کافر، کفر کے مشتقات میں سے ہے اور اس کے معنی اس چیز کے ہیں جس سے کسی دوسری چیز کو ڈھانپا جائے یا چھپا دیا جائے۔ دوسرے لفظوں میں کافر وہ ہے جو حق کا انکار کرے یا اس سے چشم پوشی کر جائے۔

کفر اور ایمان بہت قدیم زمانوں سے اور در حقیقت اجتماعی زندگی اور حکومتی نظاموں کے ابتدائی دنوں سے ہی دو متضاد اور مسلسل باہم گر جنگ و جدل میں مصروف عناصر کی حیثیت سے انسانی معاشروں میں موجود رہے ہیں اور مختلف واقعات میں کفر و ایمان کی کم و بیش کچھ نہ کچھ مقدار ضرور پائی جاتی رہی ہے۔ ان دونوں کے مظاہر اور مصداق مختلف ناموں اور مختلف عنوانات سے پہچانے جاتے رہے ہیں۔ مثلاً "عدل" ایمان کا ایک مصداق ہے اور "ظلم" کفر کی علامات میں سے ہے۔ "حق" جو حقیقت کا بیان ہے، ایمان کا مظہر ہے اور "باطل" جو عدم حقانیت کی نشانی ہے، کفر سے متعلق ہے۔

کُفر: قُرآن میں

قرآن مجید میں ایمان اور کفر کی بہت سی نشانیوں کا ذکر ملتا ہے۔ قرآن مجید میں جہاں کہیں بھی مسئلہ کفر اور اس کے مشتقات مثلاً کفران، تکفیر وغیرہ کا ذکر ہوتا ہے، اس سے حقیقتِ کُفر مُراد ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ کفر کا چہرہ اپنے تمام تر پہلوؤں اور مختلف صورتوں سمیت پہچانا جائے اور اس کی حقیقت کی بھرپور تشریح و تفسیر ہو جائے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں ۵۲۲ مرتبہ کفر و ایمان کا موضوع اور ان کی نشانیوں کا بیان کیا گیا ہے۔ اس تاکید کی وجہ مسلمانوں کا گمراہی سے حفظِ ما تقدم اور ان کی نمایاں خصوصیات کی شناخت کا لزوم ہے۔ دوسرے لفظوں میں محض ایمان اور اس کے آثار و علامات کی شناخت ہی کافی نہیں بلکہ کفر اور اس کے آثار و علامات کی شناخت بھی ہونی چاہیے۔ اسی لیے قرآن میں ۵۵۲ مقامات پر براہِ راست کفر کے بارے میں بحث کے علاوہ ۳۰۰۰ ہزار مقامات پر فساد، طغیان، نفاق اور شرک وغیرہ جیسی علاماتِ کفر کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان تمام آیات سے کفر کی تقریباً ستّر صفات کی نشاندہی ہوتی ہے۔ مختصر یہ کہ کفر کے مفہوم میں جامعیت اور عمومیت ہے اور اس میں تمام مذموم اور ناپسندیدہ صفات شامل ہیں جبکہ ایمان حقیقت میں

تمام اچھی اور پسندیدہ صفات و خصائل سے عبارت ہے۔(۱)

یوں جب قرآن کفر اور کافر کی بات کرتا ہے تو اس سے حقیقتِ کفر مُراد ہوتی ہے نہ یہ کہ کافر کے ساتھ لین دین اور رہن سہن کیسے کیا جائے؟ اور یہ کہ آیا کافر پاک ہے یا نجس؟ بلکہ اس سے مراد وہ نفسانی و شیطانی حالات، جذبات، افکار اور خواہشات ہوتی ہیں جو حق کو چھپا کر اس کا انکار کرا دیتی ہیں اور آخر میں استکبار کا ظہور اسی کی علامات میں سے ایک ہے۔

کافر میں یہ خصلت نہ صرف پائی جاتی ہے بلکہ وہ اپنے کفر پر مصر بھی ہوتا ہے اور اسے مستقل جاری بھی رکھتا ہے۔ اسی سبب سے وہ اس بزرگی اور انسانی خصوصیات سے محروم ہو جاتا ہے جو خدا نے انسان کو روئے زمین پر اپنا خلیفہ قرار دے کر اسے عنایت کی تھی اور یوں اس کی ماہیت بدل جاتی ہے۔

ملاحظہ ہو کہ کفّار کے متعلق ایک آیت میں قرآن انہیں ان الفاظ سے یاد کرتا ہے:

"خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ وَعَلٰی سَمْعِھِمْ وَعَلٰی اَبْصَارِھِمْ غِشَاوَۃٌ"(۲)

"(قہرِ) خدا نے ان کے دلوں اور کانوں پر مُہر لگادی اور ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا (کہ وہ حقائق و معارفِ الٰہی سمجھ نہیں پاتے اور سخت عذاب ان کے انتظار میں ہے)"۔

اس بناء پر انکارِ حق کرنا، اسے چھپانا، اس سے چشم پوشی اور اغماض برتنا اور اس سے بے

---

(۱)— راغب اصفہانی، مفردات میں کفر کے معنی کی ذیل میں لکھتا ہے:

جُعِلَ کُلُّ فِعلٍ مَحمُودٍ مِنَ الاِیمَانِ وَجُعِلَ کُلُّ فِعلٍ مَذمُومٍ مِنَ الکُفرِ

(تمام پسندیدہ صفات کا سرچشمہ ایمان اور تمام ناپسندیدہ صفات کی بنیاد کفر ہے)

دوسری اور تیسری صدی ہجری کے اوائل میں ایک نئے علم کو فروغ حاصل ہوا، جسے علمِ لغت شناسی کہا جاتا تھا۔ اس کی ترویج و اشاعت کی وجہ، مسلمانوں میں قرآن کا پیش کیا جانا تھا جو مسلمانوں کا علمی آئین تھا اور مسلمان قرآن کے الفاظ و کلمات کے اصلی مادّے اور معنی سے آگاہی کو ضروری سمجھتے تھے۔

ایک اہم کتاب جو چھٹی صدی ہجری میں ایک عظیم اسلامی مصنّف نے تحریر کی "المفردات فی غریب القرآن" کے نام سے مشہور ہے۔ چونکہ اس کے مصنّف راغب اصفہانی کے نام سے جانے پہچانے جاتے تھے اس لیے اس کتاب نے "مفرداتِ راغب" کے نام سے شہرت حاصل کی ہے۔ لغاتِ قرآن کے مطالعے کے وقت لوگ اس حوالہ جاتی کتاب سے استفادہ کرتے ہیں کیونکہ مصنّف نے تمام قرآنی کلمات پر نہایت غور و فکر اور توجّہ سے دادِ تحقیق دی ہے اور انہیں اس فن میں تقریباً موجد کا درجہ حاصل ہے۔ اب تک اس موضوع پر اتنی جامع کتاب کم ہی لکھی گئی ہوگی!

(۲)— سورۂ بقرہ، آیہ ۷۔

اعتنائی کرنا کفر کی عمومی خصلتوں میں سے ہے، وگرنہ ہم جانتے ہیں کہ کوئی رکاوٹ حائل نہیں ہے۔ ایسی خصلتیں حقائقِ تخلیق سے انسان کی عدم توجہ کا باعث بنتی ہیں اور خاص طور پر ان خصلتوں پر اصرار اور ان میں تسلسل، حقائق سے غفلت و اغماض کا سبب بنتا ہے۔(۱)

علّامہ طباطبائی (قدس سرہ) اس آیہ کی ذیل میں فرماتے ہیں: "جیسا کہ آپ ملاحظہ کر رہے ہیں کہ اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگانے کی نسبت خود اپنی طرف کی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑنے کو خود ان سے منسوب کیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان افراد میں دو طرح کا حجاب پایا جاتا ہے۔ ایک حجاب کا باعث وہ خود ہوتے ہیں اور دوسرا حجاب ان کے کفر اور نافرمانی کے نتیجے میں خدا کی طرف سے ہوتا ہے اور وہ فی الواقع ہمیشہ ان دو حجابوں میں گھرے رہتے ہیں۔"(۲)

استکباری نظام کے تشکیل پذیر ہونے کے عوامل

استکبار کے فکری و نظریاتی نظام کے ستون تین بنیادوں پر قائم ہیں۔

۱۔ نسلی و ذاتی برتری پر اعتقاد

نسل پرستی، عقیدۂ نسل اور نسلی برتری (۳) کے الفاظ اُس عقیدے کو بیان کرنے کے

---

(۱)۔ بطورِ مثال عالمی استکبار کے وڈیرے کسی طرح بھی ایران اور اسلامی انقلاب سے متعلق حقائق تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اس کی وجہ بھی یہی استکباری خصلتیں ہیں جو انہیں حقائق تک پہنچنے سے روکتی ہیں۔ حق و حقیقت کو چھپانے اور اسے الٹا کر دکھانے کی کوشش اور اس پر اصرار ہر طرح کی خلافِ استکبار تحریک کے مقابلے میں ان کے ہمیشہ کے پروگرام میں شامل رہا ہے۔

(۲)۔ ترجمۂ تفسیرِ قرآن، ج۱، ص۶۴۔

(۳)۔ نسلی برتری یا عقیدۂ نسل (Racism)

لیے کہے جاتے ہیں جو موروثی اور نسلی امتیازات کی وجہ سے مختلف انسانی گروہوں میں طبقہ بندی کا قائل ہے، اور ان امتیازات کو انسانی معاشروں اور تمدنوں میں ثقافتی و تاریخی اختلافات پیدا کرنے کا ایسا سبب سمجھتا ہے جو غیر معمولی اہمیت کا حامل ہو، اور جس کے نزدیک انسانی گروہوں کی نسلی و موروثی خصوصیات اور ان کے معیارِ قابلیت اور ثقافتی ابتکار میں براہِ راست رابطہ قائم ہوتا رہے۔

یہ نظریہ اگرچہ سماجیات اور حیاتیات میں تفصیلی بحثوں کا سبب بنا رہا لیکن اس نے انیسویں اور بیسویں صدی میں ایک سیاسی و سماجی طرز فکر کی حیثیت سے نہایت اہم اثرات چھوڑے نازیوں کا نظریہ اور ان کا کردار ایسے ہی اثرات کا عروج تھا، اس کے بعد مختلف نسلوں کو الگ الگ کرنے کے لیے جنوبی افریقہ کی نسل پرست حکومت کی سرکاری پالیسی کو اس نظریے کا ایک اور بھیانک عکس سمجھنا چاہیے۔

حال ہی میں بین الاقوامی اداروں میں اس حقیقت کی تائید کے ساتھ کہ صہیونیت ایک طرح کی نسل پرستی ہے، غاصب صہیونی حکومت بھی دنیا کی نسل پرست حکومتوں میں شمار ہونے لگی ہے۔

مستکبروں کا عقیدہ ہے کہ اللہ نے انہیں خاص قسم کی مخلوق کے طور پر پیدا کیا ہے اور ان کے مقابلے میں دوسروں میں بہت سی خامیاں اور عیوب و نقائص ہیں۔ مخلوقات کا پہلا مستکبر شیطان ہے جس نے فرمانِ خدا سے سرکشی کی اور تکبّر کا ارتکاب کیا۔ (۱)

آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر افراد یا نظاموں میں استکبار کی حالت اسی لیے پیدا ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو نسل یا حسب و نسب کے لحاظ سے بہتر و برتر سمجھتے ہیں۔ کسی نسل کا اپنے آپ کو دوسری نسلوں سے برتر سمجھنا ہی نسل پرستی کا اصل سبب ہے، مثلاً آریائی اپنی نسل پر فخر کرتا ہے اور امریکی اپنی ذہنی زرخیزی کو دنیا کی دوسری اقوام کے مقابلے میں کہیں زیادہ اہمیت دیتا ہے۔

ایک شرمناک ترین سماجی و فرہنگی مسئلہ جس نے محروم اقوام خصوصاً افریقی اقوام کی

---

(۱) — ملاحظہ ہوں سورۂ قصص کی آیات ۷۰ تا ۸۵۔

زندگی پر ناخوشگوار نتائج مرتّب کیے ہیں، نسلی تعصّب و تفریق (۱) کا مسئلہ ہے۔

متمدن یورپی، حتیٰ کہ امریکی جنہیں اپنے ابراہام لنکن جیسے صدرِ مملکت کی نسلی تعصب کے خلاف جدوجہد پر بڑا ناز ہے، قطعاً تیار نہیں ہیں کہ یہ مہلک انسانی بیماری دور کرنے کے لیے کوئی مثبت اقدام کریں، بلکہ وہ اس کے لیے بھی آمادہ نہیں ہیں کہ جنوبی افریقہ پر حاکم سفید فام حکومت کے ظالمانہ اقدامات کی لفظی اور ظاہری طور پر ہی مذمت کر دیں!

قرآنِ کریم میں جہاں حضرت موسیٰؑ کے ابلاغِ سیاست کا اشارہ ملتا ہے، وہاں قومِ بنی اسرائیل کی ہدایت کے سلسلے میں پیغمبرؑ کی ذمہ داری کی یوں تشریح کی گئی ہے:۔۔۔۔۔ "اِلٰی فرعونَ وَ مَلَائِہٖ فَاستَکبَرُوا وَ کَانُوا قوماً عالِین" (۲)۔

"فرعون اور اس کی قوم کے اشراف کی طرف جاؤ، انہوں نے تکبّر و نخوت اختیار کیا اور وہ برتری طلب لوگ تھے"۔ یہاں اپنے آپ کو برتر اور بلند تر سمجھنے کے سلسلے میں قومِ فرعون کے استدلال کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ یا یہ آیہ: "اِنَّ فرعونَ عَلَا فِی الاَرض" (۳) "بے شک فرعون نے زمینِ (مصر) میں تکبّر اور برتری طلبی کا آغاز کیا۔

مذکورہ بحث سے یہ نتیجہ نکلا کہ استکبار کی اصلی بنیادوں اور وجوہات میں سے ایک، اپنی نسل، زبان اور اپنی یا اپنے گروہ کی خصوصیات کو دوسروں کے مقابلے میں برتر سمجھنا

---

(۱)— اپارتھائیڈ: Apartheide اس کے لغوی معنی ہیں جدا جدا اور الگ الگ کر کے رکھنا۔ یہ نسلی تعصّب کی ایک وحشیانہ شکل ہے۔ اصل میں اس سے مراد وہ نسلی سیاست ہے جو جنوبی افریقہ پر حاکم نسل پرست اقلیت کی طرف سے مقامی سیاہ فام اکثریت اور اس علاقے کے انڈینز اور دوسرے غیر سفید فام باشندوں پر مسلّط کی گئی ہے۔ اپارتھائیڈ یعنی غیر سفید فام نسلوں کے باشندوں کو الگ رکھنا، انہیں مخصوص مقامات اور علاقوں میں زندگی بسر کرنے پر مجبور کرنا، انہیں تمام سیاسی حقوق اور ترقی کے ممکنہ ذرائع کے استعمال سے محروم رکھنا۔

عوامی جدوجہد اور اس امر سے متاثر ہونے والی حکومتوں کے اقدامات کے نتیجے میں اقوامِ متحدہ میں اسے سرکاری طور پر غیر قانونی قرار دے دیا گیا ہے اور ہر سال اسے رائج کرنے کے خلاف کئی قراردادیں منظور ہوتی ہیں کہ یہ کھلم کھلا حقوقِ بشر کی خلاف ورزی ہے۔ لیکن استکباری حکومتوں کی سیاست کی وجہ سے، جو درحقیقت خود ہی اس نسل پرست حکومت کے ظہور کا اصلی سبب ہیں، اس کی مسلّط شدہ حکومت اسی طرح جنوبی افریقہ کے مستضعفین پر قائم ہے۔

(۲)— سورۂ مومنون، آیہ ۴۶۔

(۳)— سورۂ قصص، آیہ ۴۔

ہے۔(۱)

۲۔۔۔عالمی حقائق کا انکار

استکبار کی تشکیل پذیری کا ایک اور سبب دنیا کے حقائق پر عدم اعتقاد ہے۔ دوسرے لفظوں میں حقائق و قوانین اور سنّتِ الٰہی کا انکار! کچھ اس طرح کہ جو کچھ مستکبرین کے گرد و پیش میں اور دنیا میں ہو رہا ہے، وہ اس سے غافل ہوتے ہیں اور جو کچھ حقیقی دنیا میں ہوتا ہے اس کی طرف توجّہ نہیں رکھتے بلکہ وہ صرف اور صرف اپنے مفادات اور اپنے مسائل کو واقعیت و حقیقت فرض کر لیتے ہیں۔ (۲)

اسی وجہ سے حضرت امام خمینی (قدس سرہ العزیز) بیت اللہ الحرام کے حجاجِ کرام کے نام اپنے مرداد ۱۳۶۶ ھ ش کے تاریخی پیغام میں خلیج فارس کے ممالک کے سربراہوں سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "جب بھی بڑی طاقتوں کے مفادات کا تقاضا ہو گا، وہ تمہیں اور اپنے قدیم ترین وفاداروں اور دوستوں کو قربان کر دیں گی۔ ان کے ہاں دوستی، دشمنی، نوکری اور سچائی کی کوئی قدر و منزلت نہیں، انہوں نے اپنے مفادات کو اپنا معیار بنا رکھا ہے اور وہ ہر جگہ کھلم کھلا اپنے مفادات کی بات کرتی ہیں۔"

---

(۱)۔۔۔قرآن مجید میں کئی مقامات پر انبیاءؑ اور ان کے مخالفین کے مابین ہونے والی گفتگو بڑی سادگی سے بیان کی گئی ہے لیکن وہ سادہ ہونے کے ساتھ ساتھ گہری اور غور طلب ہے۔ ایسی ہی گفتگوؤں میں سے ایک گفتگو جو بڑی دلچسپ اور جامع ہے، وہ ہے جو حضرت نوح علیہ السلام اور کفار کے ایک گروہ میں ہوئی۔ حقیقت میں یہ گفتگو دنیا، معاشرے اور انسان کے بارے میں بنیادی ترین موضوعات پر ایمان و کفر کے افکار کا مجموعہ ہے۔ اس بحث کے مفصّل مطالعے کے لیے سورۂ ہود کی آیات ۲۵ تا ۴۹ اور ان کی تفاسیر کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔

مرحوم علّامہ محمد حسین طباطبائی (قدس سرہ) نے اس ضمن میں، ان آیات کے تحت تفسیر المیزان میں مبسوط بحث کی ہے۔

(۲)۔۔۔امریکہ اور روس جو آج دنیا میں حقیقی طور پر استکبار کے مظاہر کی حیثیت میں سامنے آئے ہیں اور اس حیثیت میں پہچان لیے گئے ہیں، اپنی برتری طلبی سے پیدا ہونے والے غرور کی وجہ سے عالمی حقائق کے ادراک کی مجال و امکان نہیں رکھتے اور دنیا کے عوام کی تحریکوں کے مقابلے میں ان کی محاذ آرائی ہمیشہ جبر و تشدد پر مبنی ہوتی ہے۔

۳۔ حکومت اور مادّی قدرت کی کشش

استکبار کی تشکیل پذیری کے عوامل میں مادّی وسائل اور حکومتی اقتدار کا نام بھی لیا جا سکتا ہے۔ وہ کچھ اس طرح کہ جونہی غیر مؤمن انسانوں کو اقتدار اور وسائل کا حصول ہوتا ہے، ان میں بے دینی کا جذبہ بتدریج تقویت پانے لگتا ہے اور وہ خدا سے غافل ہو جاتے ہیں۔ جو انسان اقتدار، حکومت اور دولت کا حامل ہے، اسے صرف عنایتِ الٰہی اور مضبوط ایمان ہی گمراہی اور لغزش کی آندھیوں سے بچا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسولِ خدا کے زمانے میں جب بھی مختصر تعداد میں مسلمان کوئی کامیابی حاصل کرتے، فوراً ہی ان کی یاد آوری اور تذکر اور انہیں غرور و خود پسندی سے بچانے کے لیے کوئی آیت نازل ہو جاتی تھی۔ جنگِ بدر میں کامیابی کے بعد سورۂ انفال میں یہ آیت نازل ہوئی:

"وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی وَلِیُبْلِیَ الْمُؤْمِنِیْنَ مِنْہُ بَلَاءً حَسَنًا" (۱)

"جس وقت تو نے تیر چلایا تو اس وقت تو نے نہیں بلکہ خدا نے تیر چلایا۔۔۔۔"

یعنی یہ جنگیں، شکستیں اور کامیابیاں خدا کی طرف سے انسان کے لیے امتحان ہیں لہٰذا جب وہ کامیاب ہو جائے تو اسے مغرور و متکبر نہیں ہونا چاہیے۔

قرآن اسی طرح اس بارے میں سورۂ علق میں فرماتا ہے:

"کَلَّا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰی، اَنْ رَّآہُ اسْتَغْنٰی۔ اِنَّ اِلٰی رَبِّکَ الرُّجْعٰی" (۲)

"پس انسان کفر اور سرکشی سے باز کیوں نہیں آتا اور سرکش و مغرور کیوں ہو جاتا ہے جب اسے کچھ دولت و ثروت ملتی ہے۔ یقیناً تو اپنے رب کی طرف لوٹ کر جائے گا"

البتہ یہ کلّی حکم نہیں ہے کہ ہر انسان مال و دولت یا قوّت و اقتدار کے حصول کے بعد سرکشی اور بغاوت پر اتر آتا ہے، بلکہ جن لوگوں کو خدا کی طرف واپس لوٹ کر جانے کی فکر لاحق ہے، انہیں مال و دولت اور مادّی قوت و اقتدار خدا سے ہرگز غافل نہیں کرتا۔

سیاسی مفاہیم کے اعتبار سے قوت و اقتدار کی تعریف کے ضمن میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ قوت، دوسروں کو ہر ممکن طریقے سے اپنی مرضی کے مطابق مجبور کر دینے کا نام ہے۔

---

(۱)— سورۂ انفال، آیہ ۱۷۔

(۲)— سورۂ علق، آیات ۶، ۷، ۸۔

لیکن جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ جن انسانوں نے اپنی تعمیر و تشکیل کی ہوتی ہے اور جو خدا سے ڈرنے والے ہوتے ہیں، جب انہیں قوت حاصل ہوتی ہے تو وہ اس سے معاشرے کے اعلیٰ اہداف کے حصول کے لیے استفادہ کرتے ہیں اور اس کے ذریعے خدا کی اطاعت کے سلسلے میں انسانوں کے راستے میں حائل رکاوٹیں دور کرتے ہیں۔

یہ بڑی مشکل سی بات ہے کہ انسان مادّی وسائل، سماجی مرتبہ و مقام اور مال و دولت کے ہوتے ہوئے، ایک متقی اور مومن انسان ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے:

"وَ لَا یَحۡزُنۡکَ الَّذِیۡنَ یُسَارِعُوۡنَ فِی الۡکُفۡرِ اِنَّھُمۡ لَنۡ یَّضُرُّوا اللّٰہَ شَیۡئًا یُرِیۡدُ اللّٰہُ اَلَّا یَجۡعَلَ لَھُمۡ حَظًّا فِی الۡاٰخِرَۃِ وَ لَھُمۡ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ" "اِنَّ الَّذِیۡنَ اشۡتَرَوُا الۡکُفۡرَ بِالۡاِیۡمَانِ لَنۡ یَّضُرُّوا اللّٰہَ شَیۡئًا وَ لَھُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ" "وَ لَا یَحۡسَبَنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اَنَّمَا نُمۡلِیۡ لَھُمۡ خَیۡرٌ" لِّاَنۡفُسِھِمۡ اِنَّمَا نُمۡلِیۡ لَھُمۡ لِیَزۡدَادُوۡۤا اِثۡمًا وَ لَھُمۡ عَذَابٌ" مُّھِیۡنٌ" (۱)

کفر میں کافروں کی کوشش اور زیادہ روی تمہیں پریشان اور مغموم نہ کرے یہ لوگ خدا کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ اللہ نے ارادہ کر لیا ہے کہ آخرت میں ان لوگوں کے لیے کوئی حصّہ نہ ہو اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔ جن لوگوں نے ایمان کو کفر کے بدلے میں فروخت کیا وہ خدا کو ہرگز کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ اور جنہوں نے کفر کا ارتکاب کیا (جو کفر میں اصرار اور استمرار رکھتے ہیں) وہ یہ گمان نہ کریں (مال و دولت، وسائل، قوت و اقتدار اور اثر و رسوخ) صرف ان کے لیے اور ان کے نفع کے لیے ہے (ایسا نہیں ہے) اللہ نے یہ حالات صرف اس لیے پیدا کئے ہیں کہ ان کا جرم و گناہ بڑھ جائے اور ان (کافروں) کے لیے توڑ پھوڑ دینے والا عذاب ہے اور (مستکبرین اور ظالموں کے لیے) ذلیل و خوار کرنے والا۔

موجودہ صدیوں میں استکباری نظام کیسے تشکیل پذیر ہوا؟

یورپ میں پیداوار کی مقدار اور حکومتوں کی قوت میں روز افزوں اضافے کے ساتھ ساتھ

(۱)— سورۂ آلِ عمران، آیہ ۱۷۶—۱۷۸۔

یورپ میں بتدریج یہ نظریہ پیدا ہونے لگا کہ یورپین برتر نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور دوسری تمام اقوام کو ان کا غلام اور فرمانبردار بن کر رہنا چاہیے۔ وہ اپنے آپ کو حقیقت میں دنیا کا نظام چلانے کا اہل سمجھتے تھے اور ان کا نظریہ تھا کہ صرف انہی کو انسانی معاشرے کی اقدار کا تعیّن کرنا چاہیے۔ انیسویں صدی میں یورپی معاشرے نے ایک مفصّل تھیوری تیار ہوتے دیکھی کہ دنیا کے لوگوں سے کس طرح فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ مقصد یہ تھا کہ کم سے کم وقت میں مزدوروں سے زیادہ سے زیادہ کام کیسے لیا جاسکتا ہے۔

پیداواری وسائل میں نسبتی ترقی اور حکومتوں کی قوت میں پائداری و استواری کی وجہ سے یورپ کے دانشور اور مفکرین یہ سمجھنے لگے کہ وہ نظامِ کائنات چلانے کا خصوصی مشن رکھتے ہیں۔ اس بناء پر ——— بطورِ مثال ——— اگر یورپین ہونے کے ناطے مارکس یہ اعلان کرتا ہے کہ مذہب، اقتصادی حالات کی پیداوار ہے، چونکہ وہ اپنے آپ کو برتر نسل میں سے سمجھتا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ دنیا بھر کے تمام لوگ بھی مذہب کو بُرا اور ناپسندیدہ سمجھنے لگیں۔ اس سیاست اور طرزِ فکر کو جاری رکھتے ہوئے ——— جو آج تک اسی طرح جاری ہے ——— عالمی استکبار نہ صرف اپنی اقدار کی تعین کی صلاحیت اور دنیا پر حکومت کے حق کا قائل ہے بلکہ اس سے بھی کہیں بڑھ کر اس بات کا بھی مدعی ہے کہ کسی کو بھی یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ عالمی استکبار کے خلاف اُٹھ کھڑا ہو۔ گراناڈا، نیکاراگوا، ایران، افغانستان، کمپوچیہ اور دنیا کے دوسرے خطے گذشتہ چند برسوں میں اس کے عینی شواہد ہیں۔

گذشتہ بحث کے مطابق، ایسی خصلتوں کے وجود میں آنے کی بنیاد، انسان کی خواہشِ نفسانی ہے۔ قرآن فرماتا ہے: "نفس کی پیروی انسان کو سقوط اور اسفل السافلین کی طرف لے جاتی ہے۔"

"لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ، ثُمَّ رَدَدۡنٰهُ اَسۡفَلَ سٰفِلِیۡنَ" (۱)

"ہم نے انسان کو خوبصورت ترین شکل اور مناسب ترین اندازے پر پیدا کیا، پھر ہم نے اسے پست ترین حالت پر لوٹا دیا۔"

پھر تخلیقِ انسان کی نوعیت و ماہیت کے بیان میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

---

(۱)— سورۂ تین، آیات ۴ و ۵

"اِلّاالّذِینَ آمَنُواوَعَمِلُواالصّٰلِحٰتِ فلھُم اَجر" غَیرُ ممنون" (۱)

"ان لوگوں کے سوا جو ایمان لائے اور جنہوں نے اچھے کام کیے پس ان کے لیے کبھی نہ ختم ہونے والااجر ہے۔"

اس لیے اللہ تعالیٰ کی یہ مراد نہیں ہے کہ تمام انسان ایک جیسے ہیں بلکہ آیاتِ شریفہ کے آخر میں خدا پر ایمان لانے والوں کے لیے "الّا" کا حرفِ استثناء استعمال کیا گیا ہے۔ یعنی وہ گروہ جو خدا پر ایمان رکھتا ہے اور عملِ صالح انجام دیتا ہے، وہ اس حلقۂ عمومیت سے خارج ہو جاتا ہے۔ اور انسانوں کا صرف یہی ایک گروہ ایسا ہے جو عذابِ اِلٰہی اور "اسفل السافلین" میں گرنے سے محفوظ رہتا ہے۔ اسی لیے استکبار کی تشکیل پذیری، برتری چاہنے، اس کے فروغ و اشاعت اور وہ بھی زیادہ طلبی کی بنیاد پر استوار ہوتی ہے۔

---

(۱)۔۔ سورۂ تین، آیہ ٦۔

فصلِ اوّل: چند جملوں میں

○ ——— استکبار کا معنی اپنے آپ کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا اور نخوت آمیز کردار و عمل رکھنا ہے۔

○ ——— استعمار، مقامی خزائن و ذخائر کی لوٹ مار، بربادی اور ان پر حملہ آور ہونے کے لیے ایک بہانہ اور ایک پردہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس سے مراد مغلوب علاقوں میں غالب نظاموں کا ناجائز تسلّط ہے۔

○ ——— امپیریلزم ایک ایسا نظریہ اور طریقہ ہے کہ ایک قوت (یا حکومت) اپنے قومی دائرے سے باہر، دوسروں کے علاقوں پر قبضہ کر کے وہاں کے لوگوں کو زبردستی اپنی اطاعت پر مجبور کرتی ہے، اپنے مفادات کی خاطر ان کے اقتصادی مالی اور انسانی وسائل کا استحصال کرتی ہے۔ کشور کشائی اور تسلّط پرستی کو اس کی روایات کا ایک حصہ سمجھنا چاہیئے۔

○ ——— استکبار، کفر کی خصوصیات میں سے ہے۔ اسی لیے عالمی نظامِ کفر کو استکبار کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

○ ——— کفر کا معنی حق کا انکار یا اس سے اغماض ہے اور یہ استکبار کی خصلتوں میں سے ایک ہے۔

○ ——— استکباری نظام کے تشکیل پذیر ہونے کے عوامل یہ ہیں۔ عقیدۂ نسل، عالمی حقائق کا انکار، حکومت اور مادی قدرت کی کشش۔

o ——— جب کبھی فوجی کامیابیوں کے نتیجے میں مسلمانوں میں خود پرستی کے فروغ کا خطرہ لاحق ہوا، قرآن کریم نے انہیں احساس دلایا کہ فاعلِ حقیقی تو خدا کی ذات ہے۔

o ——— سیاسی تعارف کے اعتبار سے، قدرت کا مفہوم دوسروں کو ہر ممکن طریقے سے اپنی مرضی کے مطابق مجبور کر لینے کی قوت رکھنا ہے۔

فصلِ دوّم

نظاموں کی شناخت کا اُصول

ابتدائیہ:

نظام یا سسٹم (System) مختلف اسباب و عوامل کے ایک ایسے مجموعے کا ماحصل ہوتا ہے جو منصوبہ بندی، کسی منتظم کی نُدرت آفرینی اور جدّت طبع اور ایک دوسرے سے متناسب اور ہم آہنگ ہونے کے ذریعے اس کے اہداف کے حصول کے لئے کام میں لایا جاتا ہے۔

سماجی و سیاسی اور اس کے علاوہ دوسرے نظام جن میں طرح طرح کے بے شمار مظاہر شامل ھیں، اسی طرح تشکیل پاتے ھیں اور زندہ متحرک نظام کہلاتے ھیں۔

ھر نظام کی شناخت کے لئے پہلے اس پر حاکم طرز تفکّر کے اصول اور اس کی بنیادوں کی پہچان ہونی چاھیے اور دنیا کے متعلق اس کے نظریات اور دنیا، معاشرے، تاریخ اور انسان کے بارے میں اس کے نقطۂ ھائے نظر کو تحقیق اور تجزیہ و تحلیل کا موضوع بنانا چاھیے۔

افراد کی شناخت کے بارے میں یہی امر صادق آتا ہے کسی فرد کی شناخت کے لیے بھی پہلے اس کے نقطہ ہائے نظر کا مرتبہ و مقام متعین کرنا پڑے گا کیونکہ ایسی اطلاعات، فرد کی شخصیت کی شناخت میں بہت مدد دیں گی۔ گہری اور حقیقت پسندانہ نظر سے اس کے دوستوں بلکہ اس کی پسند و ناپسند کی اقدار اور معیارات تک کا پتہ چلایا جاسکتا ہے۔ وہ اس لیے کہ بنیادی طور پر کسی انسان کے نظام کردار کا دارومدار اس کی پسندیدہ اقدار اور نظریات پر ھی مبنی ہوتا ہے۔ اگر کسی شخص کا یہ عقیدہ ہو کہ اس دنیا میں اُس کی موجودگی کا مقصد انسانی اقدار کو اوجِ کمال تک پہنچانا ہے، یہ دنیا اُس کے لیے جائے آزمائش ہے اور خدا کے سامنے

انسان کی بندگی کے معیار کے جانچے جانے کا مقام ہے اور یہ کہ انسان کو اس مختصر مدّت میں بنیادی طور اپنی زندگی کی قدر و قیمت معلوم کرنا مقصود ہے، تو ایسے شخص کی نگاہ میں غذا، لباس، سامان آرائش اور اشیاء اور امور کے ظواہر کی مقدار و معیار کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی۔ ایسا شخص ان باتوں سے بے نیاز ہو کر زندگی کو کسی اور جگہ اور کسی اور مقام پر پاتا ہے اور اس کا اعتقاد و ایمان اگلے جہان پر ہوتا ہے۔

لیکن اس کے برعکس جس شخص کی زندگی، روزمرہ کی سج دھج، زیب و زینت، دھن، دھونس اور دھوکے بازی سے عبارت ہو وہ صبح سے شام تک اس کوشش میں رہتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح اسکی نفسانی خواہشات پوری ہوتی رہیں۔ ایسا شخص فطری طور پر اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے کچھ بھی کر گزرنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ اصولاً اسکے لیے یہ بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی کہ وہ اپنے مقصد کے حصول کی خاطر جھوٹ بولے، فریب دے، نوسربازی کرے یا رشوت، غبن، کم فروشی اور گرانفروشی وغیرہ کا ارتکاب کرے۔ یہ کام اسکی نظر میں حصولِ مقصد تک پہنچنے کے ذرائع ہیں اور اس لحاظ سے وہ اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتا ہے کہ ان سے حسبِ ضرورت استفادہ کرے۔

اس بناء پر کسی نظام کی شناخت کے لیے اس کے اصول، ارکان اور اس کے آغاز و ارتقاء کی مرحلہ وار تاریخ سے آگاہی انتہائی ضروری ہے۔ جب یہ طے کر لیا گیا ہے کہ اسلام کو بنیادی اور حقیقی طور پر متعارف کرانا ہے تو پھر سب سے پہلے انسان، سماج، تاریخ، اور دنیا کے بارے میں اس مکتب و نظام کے تمام نقطہ ھائے نظر کی جانچ پڑتال ہونی چاہیے۔

نظام کا منبعِ ظہور اور اس کا تاریخی سفر:

جس نظام کا تعارف مقصود ہے، اگرچہ اس کا کوئی خارجی وجود نہیں ہے، یعنی ابھی تک وہ معاشرے میں رواج پذیر نہیں ہوا، تو ایسے نظام کے بارے میں بحث بھی عملی نہیں بلکہ ذہنی اپج "تھیوری" یعنی نظریے کی صورت میں ہوگی۔ مثلاً "جمہوریۂ افلاطون" اور ان خیال پرداز ادیبوں اور نظریہ بازوں کے افکار کے بارے میں بحث، جن کے افکار اور تحریروں

کے لیے کتابوں کے صفحات کے علاوہ اور کوئی میدانِ عمل نہیں ہے۔ لیکن کسی ایسے نظام سے آگاہی کے لیے، جو معاشرے میں موجود ہو اور جس پر عمل کیا جارہا ہو، اس کے بارے میں اطلاعات کے حصول اور اس کی شناخت کے لیے چشم دید اور حقیقت پسندانہ تحقیقات میں مشغول ہونا چاہیے۔ مذکورہ نظام کی شناخت کے سلسلے میں درج ذیل سوالوں کے جواب، اس نظام کو بہتر طور پر سمجھنے میں ہماری رہنمائی کریں گے:

الف — اس نظام کی بنیاد کن اصولوں اور ستونوں پر قائم ہے؟

ب — اپنے ظہور سے لے کر اب تک اس نے کیا کیا مراحل طے کیے ہیں؟

پ — اس کی رپورٹیں کیسی رہی ہیں اور اس نے کیا آثار و مظاہر یادگار چھوڑے ہیں؟

اس بناء پر شناختِ استکبار کے لیے بھی ضروری ہے کہ انسان، سماج، تاریخ، اور دُنیا کے متعلّق اس کے فکری نقطہ ہائے نظر کا مرتبہ و مقام متعیّن کیا جائے اور اس کے عملی اندازِ سیاست اور اس کے اقتصادی و مادّی اہداف کو تجزیہ و تحلیل کا موضوع بنایا جائے۔

اسی لیے بعد کے حصّے عالمی استکبار کے فکری نقطہ ہائے نظر اور اس کے عملی کردار کے مختلف پہلوؤں سے تحقیق کے لیے مخصوص ہیں۔

سیاسی وقائع اور موضوعات کی شناخت کا طریقہ

سیاسی تجزیہ و تحلیل کے اصول سے آگاہی انسان کو یہ صلاحیت عطا کردیتی ہے کہ وہ مسائل کا سامنا کرنے میں، ان کے وقوع سے پہلے ہی انکی پیشین گوئی کرسکتا ہے اور یوں وہ حوادث سے ہمیشہ (حفظ ماتقدم کے لئے) ایک قدم آگے ہوتا ہے۔

۴۹—۱۳۴۸ ھ ش / ۷۰—۱۹۶۹ء کے لگ بھگ ایک ذہین پروفیسر نے، جو نہ غیب کی خبریں دینے والا تھا اور نہ ہی کوئی خاص دعویٰ رکھتا تھا، سادہ لفظوں میں کہا کہ وہ اپنے مطالعات اور تجزیہ و تحلیل کی روشنی میں پیشین گوئی کررہا ہے کہ ۱۳۶۰ ھ ش / ۱۹۸۰ء آخری دہائی میں مُلک میں ایک غیر معمولی تبدیلی آئے گی جس کے بعد خلیجِ فارس کا علاقہ ایک بحرانی علاقے کی

صورت اختیار کر جائے گا اور ان تمام واقعات کا محور بھی اسلام ہو گا۔

اس زمانے میں یہ نظریہ ایک سیاسی و فوجی پیش گوئی کی بجائے خیال آرائی کے زیادہ قریب لگتا تھا کیونکہ مسلّط شدہ حالات کی حقیقت سے بہت ہی کم لوگ واقف تھے اور ستمشاہی آمریت اور ذرائع ابلاغ پر مسلّط کردہ ضُعف کی وجہ سے بھی کسی کو یہ اجازت نہیں تھی اور کسی کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ آنے والے دس برسوں میں ایسے واقعات کے ظہور پذیر ہونے کے خیالات تک ذہن میں پالتا رہے۔

کچھ لوگوں کا یہ خیال تھا کہ اگر ایسا حادثہ وقوع پذیر ہوا بھی تو مستقبل قریب میں نہیں بلکہ بیسیوں سال بعد ہو سکے گا۔ لیکن متجسّس ذہن میں یہ خیال سر اُٹھاتا تھا کہ: اُستاد نے خلیج فارس اور اسلام کا مسئلہ ہی کیوں بیان کیا؟

خَلیجِ فارس کیوں؟ اس لیے کہ ۱۹۸۰ء تک دُنیا کے تمام ذخائر کا استحصال کسی حد تک غیر اقتصادی ہو کر رہ جائے گا اور چونکہ اس علاقے میں دُنیا کے طرح طرح کے بہترین ذخائر موجود ہیں، اس لیے تمام بین الاقوامی لُٹیرے اِس علاقے میں جمع ہو جائیں گے۔

(ان واقعات کا) محور اسلام کیوں ہو گا؟ اس لیے کہ ہم نے حیاتِ اسلام کی تجدید کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔

اس زمانے میں ایسی باتیں کسی حسین خواب کی طرح گزراں لگتی تھیں، جنھیں بہت جلد بُھلا بھی دیا گیا۔ لیکن جب ۱۳۵۶ھ ش/۱۹۷۷ء میں کتاب "سقوط ۷۹" (۱) شائع ہوئی اور اس کے بعد کے حادثات اور تبدیلیوں کا نتیجہ انقلابِ اسلامی کی کامیابی کی صورت میں نکلا تو اچانک استاد کی یاد زندہ ہو گئی اور معلوم ہو گیا کہ اطلاعات و حوادث کی جمع آوری کی بنیاد پر مشرقِ وسطیٰ میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات کے بارے میں اس کی پیش گوئی کس حد تک درست اور حقیقت پسندانہ تھی۔

دنیا میں نظامِ تسلّط سے متعلق مختلف نظریات

آجکل نظامِ تسلّط اور استکبار کے بارے میں مختلف نظریات اور نقطہ ہائے نظر پیش کیے

(۱) The Crash of 79: paul Erdman

گئے ہیں اور کیے جا رہے ہیں جن میں سے اہم ترین درج ذیل ہیں:

الف — دُنیا میں نظامِ تسلُّط نہیں ہے اور جو کچھ ہے، اقوام کا ارادہ ہے

اس نظریے کے حامیوں کا اعتقاد ہے کہ اگر اقوام خود غلبہ پذیر اور غلبہ گر نہ ہوں تو ایسے امر کے وقوع کا احتمال نہیں ہوتا اور اس بناء پر اقوام کا استعمار و استحصال ان کی بعض خواہشات ہی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ وہ یوں استدلال کرتے ہیں کہ جس ملک اور علاقے کے لوگوں نے دوسروں کا تسلّط قبول نہیں کیا وہاں اغیار کی حاکمیت جبراً بھی قائم نہیں ہو سکی۔
مثلاً ویت نام کے باشندوں نے امریکہ کا تسلّط قبول نہیں کیا اور اس کے ساتھ برسرِ پیکار ہو گئے، افغان قوم نے روس کا تسلّط اور اغیار کا اپنے ملک پر قبضہ تسلیم نہیں کیا اور اس کے ساتھ مقابلے پر اُتر آئی۔ اگرچہ یہ مجاہدانہ کوششیں ابھی تک اپنے آخری مقصد تک نہیں پہنچ سکیں لیکن یہ اس بات کی تائید کرتی ہیں کہ تسلّط پرستی کے ضمن میں اقوام کا ارادہ شرطِ اصلی ہے۔ (۱)
یہ گروہ بنیادی طور پر استعمار کی بدنیتی کا مُنکر ہے اور اس کا عقیدہ ہے کہ جو کچھ بھی ہوا ہے، انسانیت کی خدمت و ترقی کے لیے ہوا ہے۔ وہ بطور مثال کہتے ہیں کہ اگر مغربی تمدن افریقہ میں نہ جاتا تو وہاں اُسی طرح جنگلی زندگی کے طور طریقے باقی رہتے اور ہزاروں سال پہلے کی صورتِ حال وہاں برقرار رہتی۔ وہ لوگ افریقیوں کی تمام تر موجودہ ترقی کو اپنی قیادت و عمل دخل کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔

ب — تسلُّط ایک لازمی امر ہے

اس نظریے کے حامیوں کا عقیدہ ہے کہ انسانی معاشروں میں ہمیشہ سے ایک گروہ ضعیف و ناتواں اور ایک گروہ قوی اور صاحبِ اثر و رسوخ چلا آرہا ہے۔ لہٰذا اصحابانِ قوت و قدرت کا کمزوروں پر تسلّط جمالینا فطری بات ہے اور یہ منطقی امر ہے اور ہرگز بُرا اور مذموم شمار نہیں

---

(۱) اس کتاب کی تحریر کے دوران، تازہ ترین خبروں اور رپورٹوں سے ظاہر ہے کہ روس نے زیادہ تر ضمناً اور کبھی واضح طور پر اپنی شکست اور افغانستان کی مجاہد قوتوں کی برتری و کامیابی کا اعتراف کیا ہے اور اس نے اس پر اتفاق کر لیا ہے کہ چند ماہ میں اپنی غاصب فوجیں افغانستان سے نکال لے گا۔

ہوتا۔

یہ لوگ اپنے دعوے کی دلیل کے طور پر نظامِ فطرت کا حوالہ دیتے ہیں کہ نظامِ فطرت کے مطابق بھی کمزور اپنی کمزوری کے باعث طاقتوروں کی طاقت کے سبب ان کے اردگرد حرکت کرتے ہیں (جیسے سورج کے گرد نظامِ شمسی)۔ اس رائے کے مطابق طاقتوروں کا کمزوروں کو زیرِ تسلّط کر لینا ہر لحاظ سے ایک فطری امر ہے اور اصولاً جب اصل کی رعایت نہ کی گئی، یا اس کی مخالفت میں کوئی عمل سرزد ہوا تو گویا ناموسِ تخلیق مخدوش ہو گئی اور دنیا پر غالب نظامِ علّت و معلول کی خلاف ورزی ہو گئی۔

ج — دُنیا ایک واحد معاشرہ ہے

اس نقطۂ نظر کے پیروکاروں کا خیال ہے کہ دنیا میں تسلّط نام کا کوئی مسئلہ سرے سے موجود ہی نہیں، پوری دنیا ایک اِکائی ہے اور ہر ملک اس اکائی کا ایک حصّہ ہے۔

فطری بات ہے کہ ہر علاقہ اپنی مخصوص اور مختلف خصوصیات کا حامل ہوتا ہے۔ مثلاً یورپ میں تمام ممالک، شہر، دیہات اور محلّے بالکل ایک دوسرے کے مساوی اور برابر نہیں ہیں بلکہ ہر جگہ اپنی مخصوص موسمی، سماجی، اقتصادی، ثقافتی .... خصوصیات ہیں۔

یہی اصول عالمی اور بین الملکی سطح پر بھی عام کیا جاسکتا ہے اس صورت میں، ہم دیکھتے ہیں کہ بعض ممالک زیادہ متمدن اور خوشحال نظر آتے ہیں جبکہ بعض ممالک ثقافتی لحاظ سے پس ماندہ اور اقتصادی اعتبار سے زیادہ غربت کا شکار دکھائی دیتے ہیں۔ کچھ ممالک کے افراد کے لیے مختلف شعبوں میں اپنے مسائل کا حل ممکن ہے جبکہ کچھ ممالک ایسے بھی ہیں جن کے پاس اپنے مسائل کے حل کے لیے اپنے آپ کو دوسروں سے وابستہ کر لینے کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں۔

بہر حال یہ امر قابلِ توجّہ ہے کہ استعمار نے اپنے ناجائز جواز کی توجیہ کے لیے طرح طرح کے نظریات کا سہارا لیا ہے اور اس میں وہ یہاں تک بڑھ گیا ہے کہ اپنے مکروہ چہرے کو

"انسانیت کا نجات دھندہ" بنا کر پیش کرتا ہے، اپنی مفاد پرستانہ کارستانیوں کو غربت و بیماری سے انسان کی نجات کا عمل سمجھتا ہے اور کچھ یوں استدلال کرتا ہے کہ اگر وہ نہ ہوتا تو دنیا اب تک غربت، بیماری اور جہالت سے تباہ و برباد ہو گئی ہوتی!

افسوس کا مقام یہ ہے کہ مستضعف اور زیرِ تسلّط دنیا میں بھی ایک گروہ جو استکبار کی بری نیتوں سے آگاہ نہیں ہے، جہالت و نادانی اور قوی ایمان نہ ہونے کی وجہ سے استکباریوں کے ساتھ ہم آواز ہو جاتا ہے اور ان کی بلا اپنے سر لے کر، استعماریوں کی کارستانیوں کی توجیہ کا کام اپنے ذمے لے لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ استکبار اسی طرح اپنی رینگتی ہوئی اور آہستہ ناجائز طریقے سے پھولتی پھلتی ہوئی زندگی جاری رکھے ہوئے ہے اور ذہنوں میں یہ سوال پیدا کر رہا ہے کہ باہمی رابطوں اور ذرائع ابلاغ کی وسعت کی اس صدی میں یہ ظالمانہ اور غیر انسانی نظام اپنا وجود اور حاکمیت ابھی تک کیسے برقرار رکھے ہوئے ہے۔

اس سوال کے جواب کے لیے استکبار کی شناخت اور اس کی گہری اور بنیادی تحقیق لازمی ہے۔

دُنیا کے چند مشہور نظریہ پردازوں کا نقطۂ نظر

۱— کارل مارکس کا نظریہ

مارکس کا نظریہ ہے کہ استعمار کے ظہور کا پہلا مرحلہ جو پسماندہ معاشروں میں ترقی اور انقلابی تبدیلیوں کا باعث بنتا ہے، قابلِ قبول اور پسندیدہ ہوتا ہے، لیکن استعمار کا تسلسل اور اقوام کا استحصال قابلِ مذمت ہے۔ وہ استدلال کرتا ہے کہ استعمار نے شروع میں اقوام کی خدمت کی ہے، اس لیے اس نے ایک مبسوط مضمون میں الجزائر میں فرانسیسی استعمار اور ھندوستان میں انگریزی استعمار کا دفاع کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ اگر برِاعظم امریکہ کے ممالک کو از خود آج کی سرمایہ داری کے مرحلے تک پہنچنا ہوتا تو اس کے لیے انہیں شاید ہزاروں برس کی ضرورت ہوتی، جبکہ استعمار نے یہ مدت گھٹا کر صرف ایک سو پچاس سال کر دی ہے، یا اگر

برصغیر ھند و پاکستان کو فیوڈل ازم کے مرحلے سے آج کے دورِ سرمایہ داری میں پہنچنے تک پانچ سو سال صرف ہوتے تو انگریزی استعمار نے یہ مرحلہ بڑی قابلِ تعریف تیزی سے ڈیڑھ سو سال میں طے کر لیا ہے۔

مارکس کے نظریے میں سب سے بڑی مشکل موضوع کی سطحی تحقیق اور ظہورِ استعمار کی بنیادوں پر عدم توجّہی ہے۔ اس نے مختلف ممالک کے سیاہ و سفید میں استعمار کی دخل اندازی کی وجہ تلاش نہیں کی اور اس پر قطعاً توجّہ نہیں دی کہ اقوام کے مراحلِ زندگی میں آیا یہ ظاہری پیش رفت ان کے مفادات کے لیے تھی؟ اس سلسلے میں استعمار کن کن خساروں اور نقصانات کا باعث بنا ہے؟

یہ کیسے ممکن ہے کہ کسی پسندیدہ اور انسانی ھدف و نیّت کا تسلسل مذموم اور ناپسندیدہ ہو، سوائے اس کے کہ ہم تسلیم کر لیں کہ استعمار کے توسیع پسند اھداف اور پروگرام بنیادی طور پر تغیر و تبدّل کا شکار ہوں۔

مارکس اسی سلسلے میں کہتا ہے: "معاشرہ حرکت و تغیّر کے کُلی قوانین کے تابع ہے اور ڈایالیکٹیکل میٹیریلزم (۱) کے اصول کے مطابق اپنا جبری سفر جاری رکھتا ہے"۔

۲--- ہابسن کا نظریّہ (۲)

جان اے۔ ہابسن، انگریز ماہرِ اقتصادیات جس کی کتاب "غربت اور سرمایہ داری کی تبدیلی کے مسائل" کا شمار اس کی اہم تصانیف میں ہوتا ہے، ان لوگوں میں سے ہے جنہوں نے امپیریلزم اور استکباری تسلّط کے مخالف کی حیثیت سے اپنے نظریات پیش کیے ہیں۔

(۱) ڈایالیکٹیکل میٹیریلزم Dialectical Materialism ایک مابعد الطبیعاتی فلسفیانہ نظریہ ہے، جسے پہلی بار فریڈرک انگلس نے ۱۸۷۸ء میں منظم کیا یہ فلسفہ، اصلاحات کے بعد کمیونسٹ پارٹیوں کے سرکاری فلسفے اور ہسٹرایکل میٹیریلزم Historical Materialism کے تکملے کی صورت اختیار کر گیا۔

Dialectical Materialism کا دعویٰ ہے کہ مادّہ، وجود کی بنیاد ہے اور تمام موجودات ظاہری کی جڑ اور ان کا مبدأ مادّی ہے اور اشکال مادّے کی تبدیلی اور وسعت کی وجہ سے ہیں جو ڈایالیکٹیکل قوانین نامی خاص قوانین کے مطابق تبدیل ہوتی ہیں۔ اس نظریے کا دعویٰ ہے کہ یہ سائنس کے تمام شعبوں کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔

(۲)— جان اے۔ہابسن : John Atkinson Hobson (۱۸۵۸-۱۹۴۰ء)

وہ حقیقت میں مارکسسٹ ہے، مارکس کے نقطہ ہائے نظر پر نظر ثانی کر کے اس نے اپنایہ نظریہ قائم کیا ہے کہ پیداواری قوت اور عوام کی قوتِ خرید میں ہم آہنگی نہیں پائی جاتی۔ اسلئے یہ عدم تطابق سرمایہ داری کی اقتصادیات میں بحران کا سبب بنتا ہے اور استعمار، سرمایہ داری کو ایسے بحرانوں سے نجات دلانے کے لیے یہ کوشش کرتا ہے کہ پیداواری قوت میں اضافہ کے ساتھ ساتھ اپنی تجارتی منڈیوں میں بھی اضافہ کرے۔ اس وجہ سے پیداواری میزان میں اضافہ کے ساتھ اور داخلی مارکیٹوں کے ناکافی ہونے کے احساس کے ساتھ وہ بیرونی علاقوں پر دانت تیز کرنے شروع کر دیتا ہے۔

حقیقت میں استعمار کے ظہور کا آغاز اس مرحلے سے ہوتا ہے اور استعمار اپنے توسیع پسندانہ اہداف کی تکمیل کے لیے دوسروں کے علاقوں اور زمینوں پر قبضہ اور دوسرے لفظوں میں دنیا کو فتح کرنے لگ جاتا ہے۔

ہابسن کا یہ خیال ہے کہ استعمار اپنی روزافزوں پیداوار سے قوت پکڑتا ہے اور پھر امپیریلزم تک جا پہنچتا ہے اور حقیقت میں یہ صنعتیں اور پیداواری کارخانے ہی ہوتے ہیں جو امپیریلزم کو جنم دیتے ہیں۔ اس لیے وہ امپیریلزم کو صنعتی نظام کی پیداوار سمجھتا ہے۔

مارکس کی طرح ہابسن کا بھی خیال ہے کہ پیدافزار کے مالکوں میں زیادہ منافع پرستی کی خواہش، سرمایہ داری کے فروغ اور مزدوروں کی آمدنی میں شدید کمی کا سبب بنتی ہے اور ذاتی ملکیت کی مدافعت کرنے والی بورژوائیت (۱) اس امر کا باعث بن جاتی ہے کہ زمین کارخانے، آلات، خام مال اور صنعتیں سرمایہ دار کے قبضے میں چلی جائیں اور معمول سے زیادہ

(۱) بورژوائیت: لغوی اعتبار سے یہ لفظ جرمن لفظ بورگ (Bourgeoisie) سے مشتق ہے، جس کے معنی شہر کے ہیں۔ یہ لوگوں کے ایک متوسط طبقے کا نام ہے جو نہ تو زمیندار تھے اور نہ کسان۔ یہ آزاد شغل اور پیشے اپنائے ہوئے تھے۔ بعد میں، سیاسی مباحث میں اس لفظ کو وسیع اور مخصوص مفہوم ملا، سترہویں سے انیسویں صدی عیسوی کے دوران ایک منچلا اور انقلابی بورژوا طبقہ روشن فکری کے ساتھ صدیوں کی مسلسل جدوجہد کے بعد فیوڈل ازم کے تسلّط کا خاتمہ کر کے اپنی سیاسی و اقتصادی حاکمیت کے قیام میں کامیاب ہو کر ایک نئے تمدن کا بانی بنا، مارکسٹوں کا خیال ہے کہ سرمایہ دارانہ سماج کے تکامل کے نتیجے میں بورژوائیت ایک رجعت پسند طبقے میں بدل گئی۔

اس مکتبِ فکر میں بورژوا سے مراد سرمایہ دار سوداگر اور ہنرمند ہیں اور ان کے مقابلے میں محنت کش مزدور ہیں جو محض اپنی قوتِ کار فروخت کر کے گزر بسر کرتے ہیں۔

پیداوار کا ذریعہ ثابت ہوں۔ اس طرح کی وافر پیداوار سے ہی عام طور پر اقتصادی اور سماجی بحران جنم لیا کرتے ہیں۔

مارکس کے خیال میں یہی تضاد اور مزدوروں کا یہی استحصال آخر کار مزدوروں کی سرکشی و بغاوت اور جدوجہد کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور بالآخر ان طبقات میں اتحاد کا سبب بن جاتا ہے جنہیں وہ پرولتاری کہتا ہے (۱)، اور اس کا نتیجہ تغیر و تبدل کی صورت میں نکلتا ہے۔ لیکن ہابسن کا کہنا ہے کہ:

"یہ تضاد لازمی طور پر ایسے خلفشار کا باعث نہیں بنتا سرمایہ داری نظام جو اصلاحات اور ریفارم کر رہا ہے اس کی بدولت وہ سرمایہ داری نظام کی خامیاں دور کر سکے گا اور اپنی زندگی جاری رکھ سکے گا"۔

اصولاً ایسا نظریہ عملی طور پر مارکس کے نظریے کے مقابلے میں زیادہ حقیقت پسندانہ ہے اور سرمایہ داری کی بقا بھی اسی کے صحیح ہونے کی نشاندہی کر رہی ہے۔

۳۔ لگزمبرگ کا نظریّہ (۲)

ظہورِ استکبار کے ضمن میں روزا لگزمبرگ کا خیال ہے کہ دولت کی نامنصفانہ تقسیم امپیریلزم کے وجود میں آنے کا سبب بنتی ہے۔ ایسی صورتِ حال سے بچنے کا طریقہ وہ یہ

---

(۱) پرولتاریا (Proletariat) قدیم رومی معاشرے میں اس اصطلاح کا اطلاق غریبوں محنت کش لوگوں پر ہوتا تھا۔ مارکسٹی معنی و مفہوم میں یہ اجرت لے کر محنت مزدوری کرنے والے طبقے کا نام ہے جو ہر طرح کے پیداواری وسائل سے محروم ہوتے ہیں اور اپنی قوت کار، پیداواری وسائل کے مالکوں یعنی سرمایہ داروں کے ہاتھوں فروخت کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

بیسیوں صدی میں اس لفظ کو کمیونسٹ انقلابی تحریکوں کے ادب میں نیز فنکاروں اور دانشوروں میں ایک اہم مفہوم حاصل ہوا۔ مارکسزم کے نقطۂ نظر میں پرولتاریا کا تاریخی مشن یہ ہے کہ درمیانی طبقے اور کسانوں کے پرولتاری ہونے اور معاشرے میں پرولتاریوں کی اکثریت ہوتے ہی سوشلسٹ انقلاب برپا ہو جائے۔ انقلابِ روس اور خاص طور پر انقلابِ چین کے دوران کسان " پرولتاری " یعنی غریب کسان جو زمین اور کھیتی باڑی کے آلات سے محروم تھے، "مزدوروں پرولتاریوں" یعنی پیداواری وسائل سے محروم مزدوروں کے ساتھ مل گئے۔

(۲) روزا لگزمبرگ Rosa Luxemburg

بتاتا ہے کہ دولت کی تقسیم منصفانہ ہو۔ لیکن وہ دولت کی نامنصفانہ تقسیم کی وجوہات کے ضمن میں اور اس سلسلے میں کہ اس کی منصفانہ تقسیم عملی طور پر کیسے ہو سکتی ہے اور کیسے ہونی چاہیے، کوئی وضاحت نہیں کرتا۔

لگزیمبرگ ۔۔ اکثر سیاسی نظریہ پردازوں اور فلسفیوں کی طرح ۔۔۔ ان انسانی خصلتوں کی طرف توجہ نہیں دیتا جو زیادہ طلبی اور استحصال کا باعث بنتی ہیں اور اسی وجہ سے اس کے نظریات میں وہ استحکام نہیں ہے جس کا ہونا ضروری ہے۔

فصلِ دوّم: چند جملوں میں

○ ——— ہر نظام پر غالب فکری اصولوں سے آگاہی، اس نظام کی شناخت کی جانب پہلا قدم ہے۔

○ ——— جن لوگوں کے نزدیک دُنیوی زندگی کا مقصد انسانی اقدار کو اوجِ کمال تک پہنچانا ہے، ان کی نظر میں نمود و نمائش اور ظاہری ٹھاٹھ باٹھ کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔

○ ——— جو سسٹم اور نظام ذہنی مرحلے سے نکل اجرائی مرحلے تک نہیں پہنچا، وہ محض فکری تجزیہ و تحقیق ہی کا اہل ہے۔

○ ——— ایک ایسا نظام، جو معاشرے میں جاری اور زیرِ عمل آچکا ھے اُس کا جائزہ لینے کے لیے یہ سوالات پیدا ہوتے ہیں:

الف:— اس نظام کی اساس کن اصولوں اور ستونوں پر قائم ہے؟

ب:— اپنے ظہور سے لے کر اب تک اس نظام نے کیا کیا مراحل طے کیے ہیں؟

ج:— اسکی رپورٹیں کیسی رہی ہیں اور اس نے کیا آثار و مظاہر یادگار چھوڑے ہیں؟

○ ——— سیاسی مسائل کے اندازِ تجزیہ و تحلیل سے آگاہی، حقیقت میں تجزیہ نگار کو یہ صلاحیت عطا کر دیتی ہے کہ وہ ہمیشہ واقعات سے ایک قدم آگے چلے یعنی حالات دیکھ کر واقعات کی پیش گوئی کر سکے۔

○ ——— بعض لوگوں کی رائے ہے کہ: نظامِ تسلّط صرف انھی علاقوں میں قائم رہ سکتا ہے جہاں کے عوام خود اسے قبول کریں۔ ان لوگوں کے نزدیک استعماری کارستانیاں اپنی نوآبادیوں کی ترقی کے سلسلے میں خدمت ہیں۔

○ ——— کچھ لوگوں کا نظریہ ہے کہ: فطرت میں کمزور اور طاقتور کا وجود، ناقابلِ تردید قوانین تخلیق میں سے ہے، اس لیے کسی ایک کی طرف سے دوسرے کا استحصال اس قانون

کے مطابق متصوّر ہو گا۔ اور نتیجتہً اس کے خلاف کوئی حرکت، دنیا پر غالب نظامِ علّت و معلول کی خلاف ورزی ہوگی۔

o ——— بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دُنیا طرح طرح کے حادثات کا مجموعہ ہے جس کے ہر حصے اور ہر علاقے میں کمزوری اور طاقت، غربت و امارت اور تندرستی و بیماری مختلف خصوصیات لیکن اس علاقے کے تقاضوں کے مطابق موجود ہیں۔ انسان اپنے مسائل کے حل کے لیے کبھی اپنے آپ پر بھروسہ کرتے ہوئے جدوجہد کرتے ہیں اور کبھی طاقتوروں کی طرف دستِ تعاون بڑھاتے ہیں اس لیے ہمیشہ ان سے وابستہ رہ کر اپنی زندگی جاری رکھتے ہیں۔

o ——— مارکس، ظہورِ استعمار کے پہلے مرحلے کو جو پس ماندہ معاشروں کی ترقی اور ان میں انقلابی تبدیلیوں کا باعث بنتا ہے، قابلِ قبول اور پسندیدہ سمجھتا ہے لیکن وہ استعمار کے تسلسل اور اقوام کے استحصال کی مذمت کرتا ہے۔

o ——— ہابسن کی رائے ہے کہ استعمار اپنی بڑھتی ہوئی پیداواری شرح سے تقویت پاتا ہے اور امپیریلزم تک جا پہنچتا ہے۔

o ——— لگزمبرگ کے خیال میں دولت کی نامنصفانہ تقسیم امپیریلزم کے وجود میں آنے کا سبب بنتی ہے۔

فصلِ سوّم

استکباری نظام کا ثقافتی ڈھانچہ

ابتدائیہ

دُنیا پر حاکم امپیریلسٹک نظریات کی بنیاد اصولاً خُدائی اور دوسرے لفظوں میں ماورائے مادّہ وحس بنیادوں کی نفی پر قائم ہے۔ کمیونسٹ دنیا میں یہ نفی کھلم کھلا کی جاتی ہے، اسے نظام کو تشکیل دینے والی بنیادوں اور ستونوں کا نام دیا جاتا ہے اور اسی کو فلسفہ میٹریلزم،(۱) جس

---

(۱) تاریخی میٹیریلزم (Historical Materialism) یا تاریخی عقیدۂ مادّہ، مادّہ پرستی کے تاریخی نقطۂ نظر کا نام ہے اور تاریخ کے بارے میں کارل مارکس کے نظریے کی بنیاد سمجھا جاتا ہے۔

اس نے ۱۸۵۹ء میں کتاب "تنقیدِ اقتصادِ سیاسی" کے دیباچے میں یہ نظریہ یوں بیان کیا ہے۔

"مادّی زندگی میں طریقۂ پیداوار، سماجی و سیاسی خصوصیات اور معنوی زندگی کی اقدار متعین کرتا ہے۔ لوگوں کی بصیرت و آگاہی انکی زندگی کا تعین نہیں کرتی بلکہ اس کے برعکس انکی اجتماعی زندگی ہے جو انکی بصیرت و آگاہی کا تعین کرتی ہے: اجتماعی کام اور پیداوار سے لوگ مُعیّن روابط میں داخل ہوتے ہیں جن کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہوتا اور جو ان کے ارادے سے جداگانہ ہوتے ہیں۔۔۔۔۔۔یہ تمام پیداواری روابط معاشرے کی اقتصادی ساخت کی تشکیل کرتے ہیں۔ یعنی ایک ایسا حقیقی ستون بن جاتے ہیں جس پر ایک قانونی و سیاسی عمارت بنتی ہے اور اجتماعی آگاہی کی معین صورتیں اس سے ہم آہنگ ہو جاتی ہیں۔ طریقۂ پیداوار، مکمل طور پر سماجی، سیاسی اور فکری زندگی کی جہات مُعیّن کرتا ہے"

مارکس کی طرح فریڈرک انگلس نے بھی بارہا اسکی تائید کی ہے کہ ان دونوں کا نظریہ "تمام تاریخی واقعات اور افکار اور تمام سیاسی و فلسفیانہ اور دینی امور کو اس عہدِ تاریخ کے اقتصادی اور مادّی حالات کے حوالے سے زیرِ بحث لاتا ہے"

لیکن آخری عمر میں اس نے اس سلسلے میں یہ ہٹ دھرمی چھوڑ دی تھی۔ ۱۸۹۰ء میں اس نے ایک خط میں یاد دھانی کرائی کہ: "مارکس اور وہ بے چون وچرا اقتصادی عقیدۂ جبر (Determinism) کے قائل نہیں کہ تمام تاریخی تغیر و تبدل کو اقتصادی اسباب و عوامل سے ختم کر دیا جائے۔ بالائی عمارتوں (Superstructure) کے مختلف عناصر بھی تاریخی تغیر و انقلاب پر اپنا اثر چھوڑتے ہیں اور بعض حالات میں ان کی شکل کی تعیین میں اپنا وزن ڈالتے ہیں۔ ان تمام عناصر میں متضاد تاثیر موجود ہے۔۔۔۔۔۔۔"

کا اعلان کیا گیا ہے، کی بنیاد قرار دیا گیا ہے حالانکہ سرمایہ داری کی دنیا میں ایسی کوئی صراحت موجود نہیں اور ظاہری طور پر مذہب کا وجود ہے، یہاں تک کہ حکومتیں بظاہر آزادیِ مذہب کی حامی بھی ہیں۔ لوگ گرجا گھروں میں جاتے ھیں اور انہیں اپنے اعمال و فرائض کی انجام دھی میں مکمل آزادی حاصل ہے، لیکن عملی طور پر جس کی حاکمیت ہے اور تمام سیاست بازیوں اور فیصلوں میں جو چیز حتمی توجہ کا مرکز بنتی ہے وہ مادّہ پرستانہ (میٹیریلسٹک) بنیاد ہے، اگرچہ نظام کے چلانے والے بہ وجوہ۔۔۔۔۔۔ جن پر بعد میں بحث ہو گی۔۔۔۔۔ اپنے دین دار ہونے اور مسیحیت پر اعتقاد رکھنے کا محض ڈھونگ رچاتے ہیں۔

ہر مذہبی اور سماجی نظام کی شناخت کے لیے، انسان، دنیا، سماج اور تاریخ کے بارے میں اس نظام کے نقطہ ہائے نظر کی واقفیت اور ان پر بحث و تنقید ہونی چاہیے۔ (۱)

انسان: استکباری نظاموں میں

۱ — استکباری نظام میں انسانی خصوصیات

انسان کے بارے میں استکباری نظام کے نقطۂ نظر کی بنیاد تین اصولوں پر قائم ہے، جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، وہ اصول جو نظامِ کفر کی اہم خصوصیات یا تفکرِ کُفر کے نام سے پیش کیے گئے ہیں۔ اس طرح کے اندازِ فکر پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ استکبار کی نظروں میں انسان کس طرح کی مخلوق ہے:

استکباری نظام میں انسان کی اہم ترین خصوصیت اس کی مادّی حیثیت ہے نہ کہ انسانی۔ دوسرے لفظوں میں انسان ایک مادّی وجود کے طور پر قدر و قیمت اور جائزے کا موضوع

---

(۱) ممکن ہے یہ کہا جائے کہ خدا کے بارے میں نظام کے نقطۂ نظر پر بحث کیوں نہیں ہونی چاہیے جو پوری دنیا کا خالق اور مُدبر ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ دنیا اور انسانی خصوصیات سے متعلق بحث میں فطری طور پر اور ضرورت کے تحت یہ موضوع مرکزِ توجہ بنتا ہے اور اسی وجہ سے ایک الگ موضوع کے طور پر اس پر بحث نہیں ہوتی۔

بنتا ہے اور اگر انسان اور تمام مخلوقات کے ساتھ ان نظاموں کے طرزِ سلوک کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو کوئی اہم اور واضح فرق نظر نہیں آتا۔ فطری سی بات ہے کہ انسان کو مادّی سمجھنے سے کئی اثرات و مسائل پیدا ہوں گے۔ جب کسی انسان سے روحانی، مذہبی اور اعلیٰ قدروں کی اہمیت سلب کر لی جائے تو ظاہر ہے کہ ایسے انسان کا دائرۂ فکر محض مادّی اور آسائشی مسائل کے محور تک محدود ہو کر رہ جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ کے اکثر فلسفی، انسان کو کسی مشین کی مانند سمجھتے ہیں جو مشکل سے مشکل کام بھی کر سکتی ہے۔ حالانکہ مذہبی نقطہ ہائے نظر اور خاص کر دینِ اسلام میں اگرچہ انسان کے مادّی پہلو بھی فراموش نہیں کیے گئے، لیکن انسان کے محض مادّی ہونے کی تردید کی گئی ہے اور امر و نہی، واجبات و مستحبات اور مکروہات و محرّمات جیسے اس کے بہت سے اعمال اعلیٰ غیر مادّی اقدار ہوتے ہوئے اپنی اہمیت کے باعث موردِ توّجہ قرار پائے ہیں۔

جب تک دنیائے استکبار اپنے خیال میں انسان کو محض ایک مادّی وجود سمجھتی رہے گی، اس وقت تک وہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کر سکے گی جو اس نے کیا ہے۔ اسی لیے جہاں کفر کی بات آتی ہے، قرآنِ مجید کا وہاں ارشاد ہے:

"زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُونَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا" (۱)

ترجمہ: "وہ جن لوگوں نے کفر اختیار کیا، ان کے لیے دنیا کی (ذراسی زندگی) خوب اچھی کر کے دکھائی گئی ہے۔ اور ایمان داروں سے مسخرہ پن کرتے ہیں"۔

یعنی کافروں کے لیے صرف دنیا کی اس مادّی زندگی ہی کی اہمیت ہے، اسے ان کی آنکھوں کے لیے خوبصورت بنا دیا گیا ہے اور ان کے لیے اور کسی چیز کی کوئی حیثیت نہیں۔

امام خمینیؒ بیت اللہ الحرام کے حُجّاج کے نام اپنے تاریخی پیغام میں اعلیٰ انسانی اقدار کی بابت ارشاد فرماتے ہیں:

"۔۔۔ اور اس بات کی یاد دہانی (ضروری ہے) کہ دولتمندوں کو اپنی مالی اکڑفوں کی وجہ سے حکومت، حکمرانوں اور اسلامی مملکت کے کام چلانے والوں میں ہرگز اثر و رسوخ پیدا نہیں کرنا چاہیے نہ وہ اپنے مال و دولت کو اظہار فخر و مباہات کا ذریعہ بنا لیں اور نہ ہی اپنے

---

(۱) سورۂ بقرہ، آیہ ۲۱۲۔

خیالات اور اپنی خواہشات کو غریبوں، حاجت مندوں اور محنت کشوں پر زبر دستی ٹھونسیں۔ یہ بات عوام کو امور میں حصہ لینے، اخلاق کریمہ اور اعلیٰ اقدار کی طرف ان کے میلان اور چاپلوسوں سے دور رہنے کا بہت بڑا سبب بنتی ہے اور یہاں تک کہ بہت سے دولتمندوں کو اس امر سے خبر دار کرتی ہے کہ اے کاش وہ یہ سوچیں کہ ان کا مال اور ان کے وسائل، بارگاہِ خداوندی میں ان کے اعتبار کی دلیل ہیں۔"

اس لحاظ سے استکباری نظام میں انسان کے اصلی معیار یوں بیان کیے جاسکتے ہیں۔

الف — انسانی قدر و قیمت

مذہبی اور اسلامی قدروں کی بنیاد پر انسانوں کی قدر و قیمت کا معیار علم، تقویٰ، ایثار، انفاق فی سبیل اللہ اور جہاد وغیرہ ہے۔ جبکہ استکباری نظام میں اقدار مختلف ہیں اور یہاں قدر و قیمت کا معیار، انسان کی پیداواری مقدار اور مصرف کا اندازہ ہے۔ استکباری معیارات میں انسان کی پیداواری اور صرف کرنے کی مقدار جتنی زیادہ ہوتی ہے اتنا ہی اس کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اُسے نہ صرف عمدہ پیداواری مقدار دینے والا بلکہ اس کا زیادہ صرف کرنے والا بھی ہونا چاہیے تاکہ مادّی نظام کے پہیے حرکت کرتے رہیں، اقتصاد کی گرم بازاری ہو اور نظام کے مالکوں اور اربابِ بست و کشاد کو بڑے بڑے منافع ملیں۔

امام خمینیؒ، اسلامی حکومت میں انسانی قدر و قیمت کے سلسلے میں اپنے مرداد ۱۳۶۶ھ ش /۱۹۸۷ء کے تاریخی پیغام میں یوں فرماتے ہیں:

"مختصراً یہ حقیقت ہے کہ اسلامی حکومت میں اُس شخص کی قدر و قیمت زیادہ ہے جو تقویٰ رکھتا ہے نہ کہ مال و دولت اور قوت، لہٰذا نظام و حکومتِ عدل کے جملہ افسران، کارکنان، قائدین اور علماء پر فرض ہے کہ وہ امراء اور آسودہ حال کے بجائے غریبوں، حاجت مندوں اور مفلوک الحال لوگوں کے ساتھ زیادہ میل جول، اُٹھنا بیٹھنا، آنا جانا اور دوستی و محبت رکھیں، غریبوں مسکینوں کے ساتھ مل جُل کر رہنا اپنے آپ کو ان میں سے سمجھنا اور محسوب کرنا بہت بڑا فخر ہے جو اولیاء کو نصیب ہوا ہے اور عملاً گمراہوں کے

پروپیگنڈے اور شبہات کا خاتمہ کر دیتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اسلامی جمہوریۂ ایران میں اس اندازِ فکر کی بنیاد رکھی جا رہی ہے۔"

ب۔۔۔انسان کا نصب العین

کفر کے نظام، انسانی زندگی کے لیے جو آخری ہدف مقرر کرتے ہیں وہ مادّی آسودگی اور زندگی میں لطف و لذّت اُٹھانا ہے۔ تمام کوششیں اسی محور کے اردگرد گھومتی ہیں۔ گویا اگر ایک انسان روحانیت و تقویٰ سے سرشار لیکن مال و دولت سے بے بہرہ ہے اور سادہ زندگی گزارتا ہے تو وہ مکمل اور متمدن انسان نہیں سمجھا جائے گا، کیونکہ ان کے نقطۂ نظر سے تو انسان ایک ایسی مخلوق ہے جسے بہت اچھی غذا حاصل ہونی چاہیے اور جسے زیادہ سے زیادہ لذّت اُٹھانی چاہیے، اور معاشرے کے تمام انفرادی و اجتماعی مادی وسائل سے، اس سلسلے میں کام لینا چاہیے۔ اصولاً جو معاشرہ اپنے باشندوں کے آرام و آسائش اور لطف و لذّت کے لیے اُس نقطۂ نظر سے زیادہ سہولتیں فراہم کر سکتا ہے، وہ زیادہ ترقی یافتہ سمجھا جاتا ہے۔ اسی لیے آج کی دنیا طرح طرح کی اشیائے مصرفی کی نمائش و تشہیر کے لیے ہونے والے پُرفریب اور بیزارکن پروپیگنڈے کی دنیا بن چکی ہے۔ (۱)

ج۔۔۔دُنیا طلبی

مستقبل سے بے توجہی اور فقط حال کو دیکھنا اور لمحۂ موجود کو غنیمت جاننا اور قرآنی لغت کی تعبیر میں محض فکر دنیا کے چکّر میں رہنا ان خصوصیات میں سے ہے جو استکباری نظام، انسان کے لیے قرار دیتے ہیں۔ استکبار کا اندازِ فکر کچھ ایسا ہے کہ دولت جمع کرنے اور زندگی کے لمحات سے لذّت اُٹھانے کے ہر موقع سے فائدہ اُٹھایا جائے۔ کیونکہ

---

(۱) افسوس کہ اسلامی انقلاب کے بعد اب بھی ہمارے معاشرے کے بعض طبقوں میں یہ اندازِ فکر موجود ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ شہنشاہی کفر کی گھٹیا ثقافت کی باقیات کو ختم کرنے کے لیے اور سنجیدہ اقدامات کیے جائیں۔

کسی آنے والے کل، قیامت، آخرت اور حساب وکتاب پر انہیں قطعی یقین نہیں ہے۔

اس طرح جب بُرے اور ناپسندیدہ کاموں، ناجائز اعمال، تباہ کاریوں اور فساد بازیوں کے لئے کوئی بدلہ اور سزا ہی نہیں ہے تو پھر کوئی چیز راستے کی رکاوٹ نہیں بنے گی اور نہ ہی ہر طرح کا کام کرنے میں کسی مشکل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہ سوچ تعلیماتِ الٰہیہ اور اسکے معیار کے منافی ہے۔ کیونکہ خدا کی نظروں میں کوئی کام بھی اثر اور جزا و سزا کے بغیر نہیں، خواہ وہ کتنا ہی کم اہم اور کم اثر کیوں نہ ہو۔ جیساکہ ارشادِ قرآنی ہے:

"فَمَن يَّعمَل مِثقَالَ ذَرَّۃٍ خَیراً یَّرَہ" (۱) اور اس کے ساتھ ہی اضافہ کرتا ہے: "وَمَن یَّعمَل مِثقَالَ ذَرَّۃٍ شَرّاً یَّرَہ"—(۲)

"جس نے ایک مثقال کے برابر بھی کوئی نیک کام کیا وہ اس کا اجر دیکھ لے گا اور جس نے ایک مثقال کے برابر کوئی بُرائی کی وہ اس کا بدلہ پالے گا۔"

قرآن میں اگر قیامت اور روزِ آخرت کے بارے میں صرف یہی ایک آیت ہی ہوتی اور کوئی دوسری آیہ نازل نہ ہوئی ہوتی تو بھی بنی نوع انسان کی ہدایت کے لیے صرف یہی ایک آیہ ہی کافی تھی۔ کیونکہ یہ آیہ کریمہ اس حقیقت کی نشاندہی کرتی ہے کہ ہر شخص قیامت کے دن اپنے اعمال کو مجسم ہوتا ہوا دیکھنے کا خود گواہ ہوگا۔

گزشتہ دہائیوں میں یہ نظریہ کہ وڈیو ٹیپ ریکارڈر نامی آلۂ فلم برداری مختلف مناظر اور انسانی اعمال اور حرکات و سکنات کی تصویریں بنانے پر قادر ہوگا، اور اس کی تصاویر سالوں بعد بھی دیکھی جاسکیں گی محض خواب و خیال ہی تھا لیکن اب علم و دانش کی ترقی کے ساتھ انسان متحرک فلمیں بلکہ سہ بعدی فلمیں بھی بنانے اور انہیں منعکس کرنے کے علاوہ مصنوعی سیّاروں اور ریڈار کے نظام کے ذریعے آواز اور تصویر کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتا بھی دیکھ رہا ہے۔

موجودہ زمانے میں ایسے آلات موجود ہیں جو ہزاروں سال پہلے کے بنے ہوئے برتنوں کی خراشوں اور درزوں میں ثبت شدہ امواج کو آواز میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ مثلاً صدیوں پہلے کے یادگار تانبے اور مٹی کے برتن، جن کی درزوں میں اپنی ساخت کے وقت کاریگر کی آواز یا آس پاس کی اشیاء کی آوازیں ثبت ہوگئی تھیں، انہیں آواز میں تبدیل کر دیتا ہے، یہ آلہ

---

(۱)، (۲) سورۂ زلزال، آیات ۶، ۷۔

اس شخص کی آواز ریکارڈ کرکے، فی الواقع اس آواز کو گراموفون کے ریکارڈ پر منتقل کر سکتا ہے۔ لہٰذا اس پوری کائنات کو گراموفون کے ریکارڈ سے تشبیہ دی جا سکتی ہے کہ جو عمل بھی واقع ہو گا، اس پر ریکارڈ ہو کر محفوظ ہو جائے گا، اس طرح انسانی اعمال کے بارے میں مستکبرین کے مفروضوں کا ناقابلِ اعتبار اور جھوٹا ہونا ظاہر ہو جاتا ہے۔

ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ آخرت اور روزِ حشر پر اعتقاد عملی زندگی کی مصروفیات اور حصولِ معاش کے لیے جدوجہد کی راہ میں رکاوٹ بن جائے اور کچھ لوگ اس استدلال کے ساتھ محنت اور جدوجہد سے ہاتھ کھینچ لیں کہ یہ دنیا عارضی سرائے ہے اور آخرت کی فکر کرنی چاہیے! حضرت امیر علیہ السّلام فرماتے ہیں.

"کُن لِلدُّنیا کَاَنَّکَ تَعِیشُ اَبَداً کُن لِلآخِرَۃِ کَاَنَّکَ تَمُوت غداً" (۱)

اس لیے دنیا و آخرت میں اعتدال روا رکھنا ہی خدائی وسائل اور نعمتوں سے صحیح اور منطقی فائدہ اُٹھانے کی بنیادی شرط ہے۔ (۲)

۲۔ اَخلاق کا تناسبی ہونا

اجتماعی زندگی میں اقداری معیاروں کا مجموعہ ایسی حالت اور کیفیت پیدا کر سکتا ہے کہ افراد اور

---

(۱) "اپنی دنیا کی زندگی کے لیے ایسے رہو کہ گویا تمہیں ہمیشہ اس دنیا میں رہنا ہے اور اپنی اخروی زندگی کے لیے یوں رہو کہ جیسے تمہیں کل ہی مرجانا ہے۔"

(۲) "خواہش نفس کی پیروی کے سلسلے میں حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

"ایّھا النّاس اَنّ اخوف مااخاف علیکم اثنان اتباع الھویٰ و طول الامل فامّا اِتّباعُ الھَویٰ فَیَصُدّ عَنِ الحَقِ وَ اَمّا طُولُ الاَمَلِ فَیُنسی الآخرۃ"۔

"اے لوگوں! مجھے تمہارے بارے میں دو چیزوں کا ڈر ہے، ایک خواہش نفس کی پیروی اور دوسرا خواہشات اور آرزوؤں کا بڑھتے رہنا اس لیے کہ خواہش نفس کی پیروی حق بات قبول کرنے سے روکتی ہے اور دین کو نہیں مانتی اور نہ ہی اس کے بوجھ تلے چلتی ہے۔ اور لمبی چوڑی خواہشات اور آرزوئیں قیامت و آخرت کو بُھلا دینے کا باعث بنتی ہیں۔" (نہج البلاغہ، خطبہ ۴۲)

حقیقت میں دنیائے کفر دو وجوہات کی بنا پر انبیاءؑ اور خدائی ادیان کے راستے کے خلاف حرکت میں آجاتی ہے، ایک یہ کہ وہ خواہشات نفس کی تابع ہے اور دوسری یہ کہ اسے آرام و آسائش اور شان و شوکت والی بے افراط مصارف زندگی گزارنے کی آرزوئیں ہوتی ہیں جن کی تکمیل کے لیے کسی بھی جرم کا ارتکاب کیا جاسکتا ہے۔

بالآخر معاشرہ کو آزادی و خود مختاری یا وابستگی کی طرف لے جاتا ہے۔

اخلاقی خصائل میں سے ہر خصلت اپنی اپنی باری پر آثار و مظاہر کے ایک سلسلے کا منبع اور خالق ہوتی ہے۔ مجموعی طور پر یہی خصلتیں ہوتی ہیں کہ طویل عرصے میں معاشرے کی عمومی حالت کی تشکیل و تعیین کرتی ہیں۔

جو قوم مثبت اور تعمیری اخلاقی اقدار کے سلسلے میں جد و جہد نہیں کرتی، فطری طور پر وہ اپنی روحانی احتیاجات اور ضرورتوں کی تکمیل کے لیے پیشرفت نہ کر سکے گی اور ثمرات سے بے بہرہ ہوگی۔ ظاہر ہے کہ ایسی قوم میں مصائب و آلام کے مقابلے میں صبر، قناعت اور جد و جہد کا جذبہ نہیں پایا جائے گا۔

اور چونکہ معاشرہ کی اخلاقی بنیاد کا دارومدار اس معاشرے کی ثقافت اور اعتقادی مسلک پر ہے اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ اقوام کے عقائد، اقدار اور نظریات ہی ہوتے ہیں جو ان کی حالت کا تعین کرتے ہیں اور ان کی تقدیر بناتے ہیں۔ عالمی استکبار' معاشروں میں اخلاق، ثقافت اور اعتقادی مکتب کے کردار کی اہمیت کا اندازہ کرتے ہوئے، انسانی و مذہبی اخلاق کو کمزور کرنے اور قابل قدر انسانی خصوصیات کی بجائے معاشرتی مفاسد کو رواج دینے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتا۔

مغرب کے صنعتی معاشروں میں گزشتہ دہ سالہ دور کے آخر میں مشینی زندگی، طرح طرح کی اشیاء کے استعمال اور زرق برق تجمّل نیز مادّی زندگی کے ظواہر نے لوگوں اور معاشرے پر حاکم ثقافت کے بنیادی ستونوں کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔ جدید استعمار پوری قوت سے اپنے زیر تسلط معاشروں کو کفر و الحاد اور بے لگامی کے مظاہر ترقی یافتہ مغربی تہذیب کے نام پر تحفے کے طور پر پیش کر کے فروغ دے رہا ہے اور شر و فساد، بے حیائی اور طرح طرح کے چسکوں خصوصًا منشیات اور شراب کی ترویج سے اقوام کی اخلاقی خصوصیات کو تباہ و برباد کر دینے کی کوشش کرتا رہا ہے اور کر رہا ہے۔ کیونکہ استعمار کا فلسفہ حکومت جو مادّیات پر مبنی ہے، ایسے معاشروں میں موجود انسانی اخلاق و اقدار کے متضاد ہوتا ہے اور حقیقت میں حکومت کی بنیادیں مضبوط کرنے کے لیے، وہ اپنے زیرِ تسلّط معاشروں میں سے خدائی اخلاق کے خاتمے کو اپنی ثقافتی سرگرمیوں کی بنیاد اور اپنے عزائم میں کامیابی کی لازمی شرط قرار دیتا ہے۔

اس طرح وابستہ حکومتیں معاشرے میں بے حیائی، شر و فساد، مادی ثقافت اور مصرفیت کی ترویج سے تعلیم یافتہ طبقے کو جو آرام و آسائش اور شان و شوکت کا زیادہ آرزومند ہوتا ہے، وسوسہ و فریب میں ڈال دیتی ہیں اور انہیں امتیازات عطا کر کے پوری طرح اپنا تابعفرمان بنا لیتی ہیں، دوسری طرف مصرفی زندگی کا پروپیگنڈا کر کے معاشرے میں مصرفی ثقافت کو رواج دیتی ہیں اور معاشرے کے طبقات کو اس غور و فکر سے روک دیتی ہیں کہ وہ ان حالات و واقعات کے بارے میں کوئی سوال کر سکیں جو انہیں بے وقوف بنانے اور پٹھو بنائے رکھنے کے لیے وقوع پذیر ہو رہے ہیں۔ (۱)

اگر استکبار اپنی اور اپنی قوت کی بقاء اور اپنی حکومت کے دوام کا خواہاں ہے تو اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ قومیں کمزور، احمق، فساد آمادہ اور بے فائدہ کاموں میں مشغول اور سرگرم رہیں۔ استعماری حکومتوں کے دوام کے لیے خصوصاً تیسری دنیا کے ممالک میں بہترین طریقہ، زہر آلود اور مذموم مقاصد کے حامل پروپیگنڈے کا حربہ آزمانا ہے۔ (۲)

---

(۱) ایسی ثقافت کی باقیات، انقلاب کے کئی سالوں بعد بھی تاحال معاشرے میں نظر آتی ہیں۔ اسلامی معاشرے میں آج بھی ایک گروہ مسلمان عوام کی محبوب اسلامی اقدار کی پروا کیے بغیر اپنی غلاظتوں کی بقاء کے لیے سرگرم عمل ہے اور بے حجابی اور بے شرمی و بے حیائی کو اپنی زندگی کا اٹوٹ انگ سمجھتا ہے۔ اسلامی انقلاب کے آغاز میں شراب خانوں، جوأخانوں اور عیاشی کے اڈوں کو بند کر دینا کوئی معمولی کام نہیں تھا۔ استعمار پسندوں نے ان امور میں سے ہر ایک کے لیے اچھا خاصا سرمایہ لگا رکھا تھا۔ انہوں نے ایرانی عوام کی ثقافت پر انہیں مسلط کرنے کے لیے پچاس سال محنت کی وہ معاشرے کے کچھ طبقات کو اپنی انسانی، اسلامی اور روحانی ثقافت سے نکال کر مغرب کی ساختہ پرداختہ تہذیب و تمدن کے رنگارنگ مظاہر کا اسیر کر دینے میں کم و بیش کامیاب بھی ہو چکے تھے۔

(۲) پروپیگنڈا: Propaganda سے مراد ہے حقائق کا بیان یا واقعات کا ذکر جو عام طور پر سیاسی ہوں یا ذہنوں پر اثر چھوڑنے اور لوگوں کو کوئی خاص طرزِ عمل اپنانے پر اکسانے کے لیے سیاسی حالات و واقعات کے بارے میں کسی خبر میں کمی بیشی کر کے پیش کرنا۔ اگرچہ پروپیگنڈا کوئی نئی چیز نہیں ہے اور بہت عرصے سے مختلف شکلوں میں موجود ہے لیکن موجودہ دور میں ذرائع مواصلات کی وسعت و ترقی اور ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخبارات و رسائل جیسے ذرائع ابلاغ کی ایجاد کے پیش نظر، جن کا استعمال اور اہمیت و افادیت بہت زیادہ اور غیر معمولی حد تک وسیع ہے، کہنا چاہیے کہ پروپیگنڈا فی الواقع حکومتوں، گروہوں اور پارٹیوں کی سرگرمیوں کے ایک مستقل اور اہم حصے کی شکل اختیار کر گیا ہے۔

کہا جاسکتا ہے کہ مشرق و مغرب بلکہ دنیا کی چھوٹی طاقتوں تک نے اس میدان میں وسیع سرمایہ کاری کر کے پوری فضا کو ریڈیو اور ٹی وی کی موجوں سے پر کر دیا ہے اور اس سلسلے میں بے پناہ توانائیوں کا ثبوت دیا ہے۔ پروپیگنڈا اگر جھوٹی خبریں بنانے اور اقوام کی رائے عامہ کو منحرف کرنے کی کوششوں میں مشغول نہ ہو تو اس سے آگاہی بھی ملتی ہے لیکن بالکل فاشزم اور نازی ازم جیسی ماضی کی غیر انسانی پارٹیوں کی طرح آج بھی صیہونزم، کمیونزم، امریکی نظامِ تسلّط اور اس کے یورپی حامیوں ایسے فاسد تر نظاموں نے خبر رسانی کے امپیریلزم کے خوفناک نظام کو جنم دیا ہے اور طرح طرح کے پروگرام نشر کر کے خاص طور پر دنیا کی انقلابی اقوام پر عظیم "پروپیگنڈا جنگ" اور "نفسیاتی جنگ" کو مسلّط کر رکھا ہے۔

تجربہ سے ظاہر ہے کہ اخلاق کے نسبتی تناسبی ہونے کا نظریہ پیش کر کے استکبار کی کوشش یہ ہے کہ وہ برائیوں اور مفاسد کو ترقی و تمدن کے مظاہر قرار دے اور اس طرح ایسے اعمال کی قباحت کا خاتمہ کر کے انسان کی خدائی اقدار کو نیست و نابود کر دے۔

جھوٹ بولنا اور طرح طرح کا مکر و فریب کرنا، اگر اس سے کوئی فائدہ ہو تو جائز ہے۔ آزادی کی نعمتوں سے محظوظ ہونے کے نام پر خود فروشی نہ صرف جائز ہے، بلکہ اسے قانون اور رائے عامہ کی حمایت بھی حاصل ہے اور کبھی یہ باعثِ افتخار بھی بن جاتی ہے۔ خطرناک منشیات کا استعمال، محض اس لیے کہ انسان کو چند منٹوں یا گھنٹوں کے لیے بے خود کر دے اور عالمِ مخموری و بے خبری میں لے جائے، قابلِ توجیہ ہو جاتا ہے۔

در حقیقت استعماری نقطۂ نظر کی بنیاد پر اچھی اخلاقی و اجتماعی روایات کی پابندی مستحسن نہیں سمجھی جاتی اور اسے ایک طرح کے جمود اور رجعت پسندی کا نام دیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حالیہ صدیوں میں استعمار کے زیر تسلّط ممالک میں خاص طور پر انسانی معاشروں کے بدن پر سنگین اخلاقی ضربیں لگائی گئی ہیں اور اسی لیے ایسے ممالک کے اکثر علاقوں میں شر و فساد اور بے حیائی کی طرح طرح کی صورتیں رائج نظر آتی ہیں۔ (۱)

استکبار یہ جانتے ہوئے کہ شر و فساد اور کفر و الحاد کی حفظ و بقاء کے لیے ایک طاقتور ہتھیار ہے، قوموں کے جذبۂ مزاحمت کو ختم کرنے کے لیے، ان میں فساد کو رواج دیتا ہے۔

اسلامی علاقوں خصوصاً اندلس پر سپینی استعمار کے دوبارہ تسلط کی تلخ حکایت، ہر معاشرے کے طاقتور ترین طبقے، یعنی نوجوانوں کو گمراہ کرنے کے لیے اس غیر اخلاقی ہتھیار کے کامیاب مظاہرے کی نشاندہی کرتی ہے۔

اس میدان میں عالمی استکبار نے حالیہ چند صدیوں میں بہت زیادہ سرمایہ کاری کی ہے اور کسی حد تک اپنی منصوبہ بندی بلکہ ناجائز مفادات کے تحفّظ کے لیے سازش میں کامیاب بھی رہا ہے۔

---

(۱) افریقہ کے غیر ترقی یافتہ ممالک میں، جو انتہائی غربت اور بھوک کا شکار ہیں، کچھ ایسی عورتیں نظر آتی ہیں جنہوں نے یورپی طرز کے ملبوسات پہن رکھے ہوتے ہیں، وہ یورپیوں کی طرح میک اپ کرتی ہیں، الکحل والے مشروبات کے استعمال اور بے حیائی اور برے اور ناپسندیدہ کاموں میں افراط کو اپنے متمدن اور جدّت پسند ہونے کی دلیل سمجھتی ہیں اور اس میدان میں یورپیوں سے بھی بازی لے گئی ہیں۔

اس حقیقت کے پیشِ نظر کہا جاسکتا ہے کہ: مستکبرین نہ صرف خود فساد میں مبتلا ہیں بلکہ مفسد بھی ہیں۔ کیونکہ وہ اپنے، اپنے ماحول اور اپنے معاشرے کے فساد ہی پر اکتفاء نہیں کرتے بلکہ دوسرے انسانوں اور معاشروں کو بھی فساد و تباہی کی طرف کھینچ لاتے ہیں۔

قرآنِ مجید میں ہے: "وَاِذَا قِیلَ لَھُم لَا تُفسِدُوا فِی الاَرضِ، قَالُوا: "اِنَّمَا نَحنُ مُصلِحُونَ" اَلَا اِنَّھُم ھُمُ المُفسِدُونَ وَلٰکِن لَا یَشعُرُونَ۔" (۱)

"جب ان (منافقین اور کفار) سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ پھیلاؤ، تو کہتے ہیں "ہم تو اصلاح کرنے والے (اور نیک) ہیں" ہوشیار! یقیناً یہی مفسدین ہیں لیکن وہ جانتے نہیں" (یا جان بوجھ کر نادان بنے رہتے ہیں)

۳ــ انسان، سرمایہ دار اور سوشلسٹ مُعاشرے میں

اصولی طور پر مشرق اور مغرب کے امپیریلزم کے نقطۂ نظر کی بنیاد میں کوئی نمایاں فرق نہیں ہے، اور جیسا کہ بعد میں بیان کیا جائے گا، ان کے اندازِ سیاست بھی ایک دوسرے سے مشابہ ہیں لیکن ہو سکتا ہے کہ بظاہر، شکل، قوت اور ضعف میں فرق ہو۔

مشرق و مغرب کے استکباری نظام، ایک مسئلے میں اصولی اختلاف کا دعویٰ کرتے ہیں اور وہ فرد اور معاشرے کی قدر و منزلت اور مرتبہ و مقام کی تعیین کے طریقۂ کار کا مسئلہ ہے۔ اصولاً دنیائے سرمایہ داری میں انسان کی منزلت و آزادی کی حاکمیت ہے جبکہ دنیائے سوشلزم میں شرف و منزلت اور آزادی معاشرے کا حق ہے۔

اگرچہ انفرادیت کا نظریہ آج کل کے نام نہاد جمہوری معاشروں میں زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آیا ہے لیکن یہ قدیم زمانوں سے موجود ہے۔ اصالتِ فرد یا "انڈیویجوئلزم" (۲) کی

(۱) سورہ بقرہ، آیات ۱۱، ۱۲۔

(۲) "اصالتِ فرد" یا "انفرادیت پرستی" (Individualism) سے مراد ہے معاشرے پر فرد کو برتر سمجھنا اور معاشرے کے مقابلے میں فرد کی اصالت و اہمیت کا قائل ہونا، چنانچہ انڈیویجولسٹوں کا نعرہ یہ ہے: "پہلے فرد اور پھر معاشرہ"!

ایگزسٹینشلزم (Existentialism) (اصالتِ وجود) اور پراگمیٹزم (Pragmatism) (اصالتِ عمل) جیسے تمام فلسفوں کی بنیاد (individualisticPhilosophy) "انفرادیت پرستی" ہی ہے۔

تعریف میں کہا گیا ہے کہ: ''انڈیو یجؤ لزم'' ایک ملائم و لطیف احساس ہے جس کی وجہ سے انسان معاشرے سے کنارہ کش ہو کر اپنے اہلِ خاندان اور دوست احباب سے دوری اختیار کر لیتا ہے اور خود اپنی ذات میں مختصر سی بزم آرائی کر کے، اپنی مرضی سے، معاشرے کو اس کے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔''

مذہبی تعلیمات کے لحاظ سے گوشہ نشینی اور کنارہ کشی قابلِ قبول ہے اور دینِ مسیحی میں فرد کے بلند و برتر مقام پر ایمان، دینی تعلیمات میں شامل ہے۔ لیکن ''قابلِ احترام فرد'' وہ نہیں ہے جو دوسروں سے الگ تھلگ ہو کر گوشۂ تنہائی میں جا بیٹھا ہو، بلکہ اس کا مقام اور اہمیت صرف اور صرف دینی بھائیوں کی خدمت ہی سے ثابت ہوتی ہے۔ عیسائیوں کی تعبیر کے مطابق ''سوشلزم'' اور ''انڈیو یجؤلزم'' واضح فرق کے باوجود، مسیحیت میں ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتے۔

دینِ اسلام میں، فرد کا احترام و مقام خواہ وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو، محفوظ اور باحرمت ہے، اہلِ کتاب کا ایک گروہ یعنی دین یہود و مسیح کے پیروکار بلحاظِ عقیدہ، انہیں آزادی عطا کی گئی ہے لیکن ان کے لیے اسلام کی سیاسی شہریت قبول کرنا ضروری ہے، تاکہ اس کے بعد ان کی حفاظت و حمایت مسلمانوں کے ذمے ہو جائے۔ اسی لیے انہیں ''اہلِ ذمہ'' کہا جاتا ہے۔

دینِ اسلام میں نسلی و طبقاتی اختلاف کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں اور عوام میں آزادی و مساوات کو سرکاری طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ کیونکہ بنیاد یہ ہے کہ تمام لوگ خدا کے بندے ہیں اور بندگیِ خدا میں اختلاف نہیں ہو سکتا۔ اس کے ساتھ ہی اسلام تحریف شدہ مسیحیت کے برعکس ''لا رھبانیۃ فی الاسلام'' کی بنیاد پر گوشہ نشینی، تنہائی پسندی اور اجتماعی زندگی سے عدم دلچسپی کی ممانعت کرتا ہے اور مسلمانوں کو اجتماعی ذمّہ داریاں قبول کرنے کی ترغیب دیتا ہے اور عیسائیوں اور دوسرے تمام ادیان کے ماننے والوں کے لیے بھی اسلام کی سیاسی شہریت ایک لازمی فریضہ سمجھتا ہے۔ اس بناء پر دینِ اسلام کا ''انڈیو یجؤلزم'' سے کوئی تعلق نہیں۔ فی الواقع یہ کہا جا سکتا ہے کہ صرف اسلام ہی وہ دین ہے جس نے فرد اور معاشرے کے مابین حقیقت پسندانہ اور منطقی راستہ منتخب کیا ہے، وہ نہ فرد کو معاشرے کی بھینٹ چڑھاتا ہے اور نہ ہی معاشرے کو فرد پر قربان کرتا ہے بلکہ ہر ایک کے لیے اصالت،

حدود، احترام اور مناسب آئینی مقام کا قائل ہے۔

ہر معاشرہ، عظیم انسانی معاشرے کا ایک جزو ہوتے ہوئے بھی، اپنی حد میں ایک ایسا کُل ہے جو عینی (مادّی) اور ذہنی (غیر مادّی) روابط کے نظاموں پر مشتمل (ایک مکمل معاشرہ!) ہے۔ ہر تاریخی عہد میں ہر معاشرے کی خصلت، اس کی ماہیت سے جنم لیتی ہے اور یہ ماہیت اس کے داخلی روابط کی کمیت و کیفیت سے نشو و نما پاتی ہے۔

معاشرے کے داخلی روابط متعدد، کثیر اور پیچیدہ ہیں لیکن ان میں سے کچھ مستقل اور مسلسل باقی رہتے ہیں مثلاً پیداواری روابط اور کچھ ذیلی اور عارضی نوعیت کے ہوتے ہیں مثلاً گروہی روابط۔

معاشرہ: استکباری نظاموں کے نقطۂ نظر سے

مسلّط عامل پر اعتقاد اور ایک ہی عامل سے تمام وضعی تبدیلیوں اور تغیّرات کی تفسیر مادّی طرز فکر کی بنیاد پر تشکیل پاتی ہے۔ کیونکہ یہ دنیا کے تمام معاملات کی تحقیق اور تجزیہ و تحلیل مادّی حوالے سے کرتا ہے۔ چونکہ مادی افکار استکباری نظام کے عقائد و نظریات کی بنیاد ہوتے ہیں، اس لیے ایک عامل والی تحقیقات کا غلبہ، اس نظام کے نقطۂ نظر کی اہم ترین خصوصیت ہوگا۔

مارکس کے فلسفے کی بنیاد "ڈایالیکٹیکل میٹیریلزم" اور اس کے ضمن میں "ہسٹاریکل میٹیریلزم" پر ہے۔ تاریخ کا مادی مفہوم اس خیال کے گرد چکّر لگاتا ہے کہ انسان کا تاریخی ارتقاء، پیداواری وسائل کے ارتقا کا نتیجہ ہے اور انسان کی مادّی ضروریات کی تکمیل کے وسائل اور اجتماعی روابط اسی بنیاد پر قائم ہوتے ہیں۔ معاشرے اور معاشرتی تبدیلیوں کی بنیاد اور مذہب، اخلاق، دولت و سیاست، تعلیم و تربیت، اصولِ عقائد اور خاندان وغیرہ جیسے تمام معاشرتی شعبے اسی واحد مسلّط عامل کی بنیاد پر تشکیل پاتے ہیں اور معاشرے کے بالائی شعبوں کو ترتیب دیتے ہیں۔ ہر معاشرہ اپنے اقتصادی

ڈھانچے اور اپنی مادّی ضروریات کے طریقۂ تکمیل کے مطابق، مخصوص نوعیت کے بالائی شعبوں کا حامل ہوتا ہے جو بنیادی شعبے کی تبدیلی، مثلاً زراعت سے صنعت، میں بدل جاتے ہیں۔

مارکسزم کی سماجیات کا اہم ترین حصّہ، بورژوا طبقے کے ظہور اور سرمایہ دارانہ معاشرے میں اس کے طریقہ کار (میکانزم) کا تجزیہ و تحلیل ہے۔ مارکس کے خیال کے مطابق بورژوائیت نے فیوڈل (۱) معاشرے کے زیرِ سایہ تربیت پائی اور زراعت کی جگہ تجارت و صنعت کو ترقی دے کر معاشرے کے بنیادی شعبے میں تبدیلی پیدا کی اور فرانس کے انقلابِ کبیر جیسے انقلابات سے سیاسی قوت حاصل کر کے حاکم طبقے کی شکل اختیار کر لی۔

سرمایہ داری نظام میں معاشرہ ایک مکمل اقتصادی تاریخی مظہر کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے جس کا اصل مقصد سرمائے اور مالی قوّت کا پھیلاؤ ہے۔ ایسے نظاموں میں اقتصادی قوت ہی معاشرتی تبدیلیوں کا تعیّن کرتی ہے۔ گہری تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ معاشرے کے متعلق سرمایہ داری اور غیر سرمایہ داری نظاموں کا نقطۂ نظر ایک دوسرے سے مشابہ ہے اور بظاہر ایک پیداواری روابط اور دوسرا پیداواری قوّت پر زور دیتا ہے، لیکن دونوں مادّہ پرستانہ بنیادوں پر قائم ہیں۔

دنیائے استکبار میں، معاشرہ مختلف سیاست بازیوں کو جامۂ عمل پہنانے کے لیے ایک ہتھیار کے طور پر، خدمات پیش کرنے، اجناس کی فروخت اور سود و منافع کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اس سلسلے میں اربابِ حکومت کی تمام تر کوششیں حکومت کے منافع کے حصول، زیادہ منڈیاں حاصل کرنے، نفع بخش میزان میں اضافے اور آخری مصرف (۲) کی تشویق کے لیے ہوتی ہیں۔

استکبار اپنے مفادات کی خاطر ثقافت اور علم کو بھی اپنی خدمت کے لیے استعمال کرتا ہے اور معاشرتی و انسانی علوم اور اپنے زیر تسلّط اقوام کے آداب و رسوم پر تحقیق کے نتائج سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، لوگوں کو فریب دینے اور اپنی مطلوبہ ثقافت کی ترویج، اپنے تسلّط کے

---

(۱) Fudalism

(۲) اس سے مراد مصرفی اشیاء ہیں جو تبدیل نہیں ہوتیں اور واسطہ نہیں بنتیں اور جو حقیقت میں پہلی اور آخری بار ایک ہی مرتبہ مصرف میں آتی ہیں۔

فروغ اور زیادہ منافع کے حصول کے لیے بہتر اور سادہ طریقوں سے استفادہ کرتا ہے۔

میکیاولزم

معاشرے کے بارے میں مادّہ پرستانہ نقطۂ نظر کی بہتر شناخت اور استکباری افکار کی گہرائی تک پہنچنے کے لیے مناسب ہو گا کہ معاشروں کے نظم و ضبط کے لیے حکومتوں کی سیاست کے سلسلے میں سیاسی مکتب "میکیاولزم" (۱) اور معاشرے کے متعلق اس کے نقطۂ نظر کا مختصر تذکرہ ہو جائے۔ کیونکہ امپیریلسٹک معاشروں اور استکباری نظاموں میں اس کے نظریات اور آئیڈیالوجی تمام سیاست بازیوں، منصوبہ بندیوں اور پروگراموں کی اساس اور محور ہے۔

میکیاولی کا نظریہ ہے کہ اگر حکمران اپنی بقاء اور کامیابی چاہتا ہے تو اسے نہ تو شرارت سے ڈرنا چاہیے اور نہ ہی اس سے احتراز کرنا چاہیے۔ کیونکہ اس کے بغیر حکومت کی حفظ و بقاء ممکن نہیں ہے۔ حکمران کی قساوتِ قلبی کے لیے اسکی سیاسی کامیابی اور روز بروز بڑھتی ہوئی طاقت کے سوا کوئی اور آلہ یا پیمانہ نہیں۔ طاقت کے حصول، اس کی افزونی اور اس کے حفظ کے لیے حکمران کو اجازت ہے کہ وہ دھونس دھاندلی، مکر و فریب، خیانت، گندم نمائی و جو فروشی اور وعدہ خلافی جیسے تمام اعمال کا سہارا لیتا رہے۔

میکیاولی کے لیے اس مسئلے کی کوئی حیثیت نہیں ہے کہ اخلاقی لحاظ سے کون سے اقدامات اچھے یا برے ہیں، بلکہ اس کے خیال میں حکمران کو چاہیے کہ وہ ملکی مصلحتوں کی خاطر حکومت

---

(۱) میکیاولزم (Machiavelism) میکیاولی (۱۴۶۹—۱۵۲۷ء) جو اٹلی کا عظیم سیاستدان اور دانشور سمجھا جاتا ہے۔ جمہوریہ فلورانس کی وزارتِ خارجہ کے ملازم اور فرانس اور جرمنی میں سیاسی مامور کی حیثیت میں کام کرتا تھا۔ وہ اپنی مشہور کتاب "پرنس" یا "شہریار" میں سیاست میں حصولِ مقصد کے لیے ہر حربہ آزما لینے کو جائز سمجھتا ہے اور اس طرح اس کے نزدیک سیاست مکمل طور پر اخلاق سے بے تعلق ہے۔ اس لحاظ سے میکیاولزم کا مطلب حصولِ مقصد کے لیے غیر اخلاقی ہتھکنڈوں کا استعمال ہے۔ میکیاولی سے پہلے ارسطو، قدیم یونان کے رواقی فلسفی اور عیسائی ادیبوں کا عقیدہ تھا کہ حکومت کو اخلاقی اصولوں پر مبنی ہونا چاہیے، تاکہ وہ لوگوں کو نیکی کی ہدایات کرے اور کامل فضیلت کے ساتھ زندگی گزارنے کے سلسلے میں ان کی مدد کرے۔

کے مقصد کو سب چیزوں سے مقدم جانے اور اس اجتماعی مقصد کے حصول کے سلسلے میں اس کے لیے تمام وسائل کا استعمال جائز ہے۔ (۱) اس طرح میکیاولی نے ایک نیا نظریہ پیش کیا جس کی بنیاد یہ تھی کہ اخلاق اور سیاست ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ میکیاولی کے نظریے میں کوئی جدّت نہیں بلکہ دنیا میں استکباری حکومتوں کی تشکیل کے آغاز سے اسی روش پر عمل ہوتا چلا آیا ہے، حقیقت میں میکیاولی نے ایسے سیاستدانوں کے لیے سب سے پہلے ایک ترتیب و تدوین شدہ دستورالعمل چھوڑا ہے۔

دنیا-استکباری نظاموں کے نقطہ نظر سے

دنیا کے بارے میں استکباری نظاموں کے نقطہ ہائے نظر کے جملہ خطوط درجِ ذیل عنوانات سے عبارت ہیں:

۱— دُنیا کی قدر و قیمت

دنیا کو دیکھنے کے بارے میں استکبار کا اہم ترین نقطۂ نظریہ ہے کہ دنیا کی حیثیت محض مادّی ہے اور روحانیت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس کے ہاں نہ اعلٰی خدائی، انسانی اور مادّے سے ماورا اقدار کی کوئی قدر و قیمت ہے اور نہ ہی وہ ان کی پرواکرتا ہے۔ دنیا کے بارے میں مشرق و مغرب کے نقطۂ نظر میں کوئی فرق نہیں کیونکہ دونوں نظاموں کی اعتقادی بنیادیں مادّی ہیں اور دنیا کے متعلق ان کی تعبیرات محض الفاظ اور معاملات کے ظواہر کی حد تک ایک دوسرے سے مختلف ہو سکتی ہیں، لیکن گہرے تجزیہ و تحلیل سے ان کا مکمل اشتراک سامنے آجائے گا۔

اگرچہ مغربی لوگ اپنے آپ کو مسیحی، ادیانِ الٰہی کے معتقد اور حضرت مسیحؑ کے پیروکاروں میں سے سمجھتے ہیں، لیکن عملی طور پر مادہ پرستانہ افکار کی گہرائی، روحانیت اور

---

(۱) ڈاکٹر علومی، رضا: اصولِ علومِ سیاسی، جلد اوّل، مؤسسہ مطالعات و تحقیقات اجتماعی، صفحہ ۴۷

احکامِ الٰہی سے ان کے ہر طرح کے رابطے میں سدّ راہ بنی ہوئی ہے، اسی لیے حضرت مسیحؑ کے پیرو کار عملاً آپؑ کے احکامات میں سے کسی ایک پر بھی عمل پیرا نہیں ہوتے۔

حضرت علی علیہ السّلام فرماتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ بہت کم کھانا کھاتے تھے۔ کثرت سے عبادت کرتے اور روزے رکھتے تھے اور اپنا کھانا غریبوں میں بانٹ دیا کرتے تھے، لیکن آج ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ کے آئین کی پیروی کا دعوی کرنے والے اپنی دُنیوی لذت اور استفادہ کرنے کے لیے پوری دنیا کے وسائل اپنانا چاہتے ہیں اور محروم قوموں کا استحصال کر کے اپنے لیے آرام و آسائش اور عیش و عشرت کے سامان فراہم کرتے ہیں۔

۲۔ انسان اور دُنیا

دنیائے استکبار میں دنیا کا وجود انسانی ضروریات اور ہوا و ہوس کی تکمیل کے لیے ہوتا ہے۔ جبکہ ہمارا ایمان یہ ہے کہ انسان اور دنیا دونوں کی تخلیق اس لیے کی گئی ہے کہ دونوں ایک طے شدہ اور معقول رابطہ رکھتے ہوئے ایک دوسرے کی زندگی کو برقرار رکھنے، انسان کے روحانی کمال اور اسکی قدر و قیمت کو مکمل کرنے اور انجام تک پہنچنے، قربِ الٰہی پانے اور اعلٰی خدائی قدروں کو اپنانے کا راستہ طے کریں۔

دنیا میں انسانی اعمال سے حاصل ہونے والے نتائج اور ردِ عمل سے بے توجہی دنیائے استکبار کے دیگر خصائص میں سے ایک خصوصیت کہی جا سکتی ہے حالانکہ اسمیں کوئی شک نہیں کہ ہر کام کا انجام دہندہ نہ صرف اپنے عمل کی انجام دہی کا ذمہ دار ہے بلکہ اس کام کے نتائج و اثرات کے سلسلے میں بھی جواب دہ ہے (۱) دنیائے استکبار میں انجام پذیر ہونے والے اعمال کی ذمہ داری کا کوئی تصور موجود نہیں، لہٰذا ہم دیکھ رہے ہیں کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی مدد سے

(۱) اسی سلسلے میں قرآن کریم سورۂ یٰسین کی آیہ، میں فرماتا ہے، "اِنَّا نَحۡنُ نُحۡیِ الۡمَوۡتٰی وَ نَکۡتُبُ مَا قَدَّمُوۡا وَ اٰثَارَہُمۡ" "بے شک ہم مُردوں کو یقیناً زندہ کریں گے اور جو کچھ انہوں نے انجام دیا ہے اور ان کے آثار کو ہم لکھتے ہیں، (اور ہم ان کا محاسبہ کریں گے)"

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص نہ صرف اپنے کیے ہوئے کام بلکہ اس کے اثرات کے سلسلے میں بھی جواب دہ ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی تحقیق اور محاسبہ کرے گا۔

ایٹمی پلانٹ لگائے جارہے ہیں، بچا کھچا ایٹمی مواد شورہ زمینوں اور سمندروں کے پانیوں میں دفن کیا جارہا ہے، ایٹمی تجربے کیے جارہے ہیں اور ان کے آثار و نتائج اور ان نقصانات کی طرف مطلقاً توجہ نہیں دی جارہی جو ہو سکتا ہے انسانی معاشرے کو متاثر کریں۔

۳— قدر و قیمت کے معیارات

اقدار کی بنیاد اور کوششوں کا مقصد، مقدار کے حصول تک رسائی ہے۔ ایسے نظاموں میں ہر کام کی انجام دہی کی بنیادی اہمیت کا محور تعداد میں افزونی اور مقدار میں اضافہ ہوتا ہے۔ فی الواقع ''مقدار'' کی طرف دھیان تمام اقدار کا محور ہے۔ پیداوار، دولت اور وسائل کا پیمانہ ہی کامیابی کا اصلی معیار سمجھا جاتا ہے۔ بنیادی توجہ اعداد و شمار پر مرکوز رہتی ہے۔ آبادی، منڈی، پیداوار اور کھپت قدر و قیمت کا معیار قرار پاتی ہے اور منافع، سود اور بچت کا مسئلہ مرکزِ توجہ بنا رہتا ہے۔ معیار پر صرف اس وقت توجہ دی جاتی ہے جب وہ مقدار میں اضافے کا سبب ہو۔ اگر بعض اشیاء کا معیار اچھا ہے اور بعض کا بہت ہی اچھا تو اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مقدار میں اضافے کا ہدف حاصل کرنے کے لیے، وہ مال کے معیار پر توجہ دینے پر مجبور ہیں اور اپنے منافع کے حصول کے لیے، کاروباری حریفوں کو نیچا دکھانے اور منڈی پر تسلّط جمانے کے لیے مال کا معیار بھی مرکزِ توجہ بنے گا۔ گویا بنیادی مسئلہ اور حقیقی مقصد ''مقدار'' ہے اور معیار پر صرف اسی صورت میں توجہ دی جاتی ہے، جب اس کے بغیر اور کوئی چارۂ کار نہ ہو۔

انسان اور دنیا کے باہمی دو طرفہ رابطے کی یک طرفہ رابطے میں تبدیلی

پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ در حقیقت انسان اور دنیا میں دو طرفہ اور تعمیری رابطہ موجود ہے یہ رابطہ ایسے ذخائر و وسائل کے لحاظ سے، جو اپنی خدمات کو بآسانی طویل عرصے میں سامنے لاسکتے ہیں، ایک دوسرے کی بقائے حیات کے امکانات کو وجود میں لانے سے ظاہر ہوتا

ہے۔

اس لیے ایسے وسائل سے استفادہ کرتے وقت نہایت احتیاط اور امانت کی ضرورت ہے جو طویل عرصے میں پیدا ہوئے ہیں، تاکہ فضول خرچی نہ ہو اور بڑی اچھّی طرح ان سے کام لیتے ہوئے اخلاف اور آنے والی نسلوں کے لیے استفادے کا موقع محفوظ رہے اور وہ ان سے مستفید ہوتے رہیں۔ (۱) جبکہ عملی طور پر ہم دیکھ رہے ہیں کہ فطری اور زیر زمینی وسائل سے استفادہ کرتے وقت، جو محدود بلکہ ختم ہونے کو ہیں، صرف اقتصادی استحصال کی طرف توجہ دی جاتی ہے، اور آنے والی نسلوں کی ضرورت اور ان میں بچت کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ اس بناء پر یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ استکباری نظام میں دنیا سے انسانوں کا رابطہ مکمل طور پر یک طرفہ، تسلط پرستانہ اور استحصالی ہے اور اس کا کوئی اصول اور ضابطہ نہیں۔

---

(۱) ماہرینِ ارضیات کے نظریے کے مطابق زمین کی تہوں میں فاسلز کو تیل میں تبدیل ہونے میں تقریباً ایک کروڑ سال لگتے ہیں، اس لیے ایسے سرمائے کی حفاظت پر توجہ ہونی چاہیے۔ لیکن گزشتہ چند صدیوں کے دوران جب سے اس حیاتیاتی مادّے کی دریافت ہوئی ہے اور اسے نکالا جارہا ہے، اس کی کھپت یہاں تک بڑھ گئی ہے کہ پیش گوئی کی جارہی ہے کہ اگلے چالیس برس میں تیل کے موجود ذخائر ختم ہو جائیں گے۔ اسی طرح جنگلات، لکڑی کے ذخائر، زمینی وسائل اور ہر وہ مادہ جس سے آرام و آسائش میں مدد مل سکتی ہے یا جو قوت اور اسلحے میں اضافے کا سبب بن سکتا ہے اسے بے پروائی سے اور سوچے سمجھے بغیر زیادہ سے زیادہ استعمال کرنے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔

فصلِ سوم: چند جملوں میں

- دنیا پر مسلّط امپیریلسٹک نقطہ ہائے نظر کی بنیادیں اصولی طور پر الٰہیہ اور اصطلاحی زبان میں ماورائے مادّہ و حسّ قدروں کی نفی پر استوار ہیں۔
- استکباری نظام میں انسان کی اہم ترین خصوصیت اس کی مادّی حیثیت ہے نہ کہ اس کی انسانیت۔
- اسلامی نقطۂ نظر میں انسان کے مادّی پہلوؤں پر بھی توجہ دی جاتی ہے لیکن انسان کے محض مادّی ہونے کے تصوّر کو ردّ کر دیا جاتا ہے اور اعلیٰ انسانی اقدار پر زیادہ توجّہ دی جاتی ہے۔
- علم، تقویٰ، ایثار، انفاق اور جہاد وغیرہ کا شمار اسلام کے اقداری معیارات میں ہوتا ہے۔
- نظام ہائے کفر میں حیاتِ انسانی کا انتہائی مقصد زندگی میں مادّی استفادہ، آرام طلبی اور لذّت پرستی ہے۔
- حضرت علی علیہ السلام کام اور دنیوی مشاغل میں عزم و ہمت اور اس کے ساتھ ساتھ اُخروی معاملات پر توجّہ دینے کی نصیحت فرماتے ہیں۔
- جو قوم اخلاقی پہلوؤں کے حصول کی کوشش نہیں کرتی، ظاہر ہے کہ وہ روحانی ضروریات کی تکمیل کے سلسلے میں کوئی پیشرفت نہیں کرے گی۔
- جدید استعمار نے شر و فساد، بے شرمی و بے حیائی اور طرح طرح کی منشیات کے حربے سے اقوام میں اخلاقی عقائد کے خلاف جنگ برپا کر دی ہے۔
- مُستکبر صرف فاسد ہی نہیں مُفسد بھی ہوتا ہے کیونکہ وہ انسانوں اور دوسرے معاشروں میں فساد و تباہی پھیلاتا ہے۔
- مردِ مسلمان، ذمّہ داری سنبھالنے والا اور فعّال انسان ہے اور اسلامی تعلیمات نے رہبانیت اور گوشہ نشینی کی نفی کی ہے۔
- اسلام ہی صرف وہ مکتبۂ فکر ہے جس نے اعتدال و توازن کو ملحوظ رکھتے ہوئے فرد

اور معاشرے کا قانونی مرتبہ و مقام معیّن کیا ہے اور ہر ایک کے لیے ایک خاص حد، اور احترام کا قائل ہے۔

o — فرد کی شخصیت نقوش کے اس مجموعے سے تشکیل پاتی ہے، جنہیں وہ خود قبول کرتا ہے یا جو اسے معاشرے کی طرف سے ملتے ہیں۔

o — ڈایالیکٹک میٹیریلزم جو مارکسٹوں کے فلسفے کی بنیاد ہے، یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وجود کی بنیاد مادّہ ہے اور زندگی کے تمام مظاہر ——— بشمول انسان اور معاشرہ ——— مادّی بنیاد کے حامل ہوتے ہیں، اور اشکال مادّے کے تغیر و تبدل اور ارتقاء کی وجہ سے ہیں جو ڈایالیکٹک نامی مخصوص قوانین کے مطابق متحوّل ہوتے ہیں۔ ہسٹاریکل میٹیریلزم بھی اسی طرزِ فکر کا حصّہ اور نتیجہ ہے۔

o — سرمایہ داری نظام میں معاشرہ ایک مکمل تاریخی اقتصادی مظہر کی صورت میں سامنے آتا ہے جس کا بنیادی مقصد مالی قوت میں وسعت و اضافہ ہے۔

o — استکباری نظام میں، دنیا سے انسانوں کا رابطہ، بالکل یک طرفہ، خود غرضانہ اور استحصالی ہے اور اس کا کوئی ضابطہ اور معیار نہیں۔

حصّۂ دوّم

استکبار کے عملی اور اجرائی طریقے

ابتدائیہ:

جیسا کہ گذشتہ باب میں ذکر ہو چکا ہے کہ استکبار اپنی اغراض کے حصول کے لیے میکیاولی کے مرتّب و مدوّن کیے ہوئے سیاسی اصولوں پر عمل کرتا ہے اور اپنے ہدف تک پہنچنے کے لیے ہر ذریعے کی توجیہ کر لیتا ہے، اس لیے وہ اپنے مقاصد کی کامیابی کی خاطر تمام شعبوں میں ہاتھ پاؤں مارتا ہے اور تمام ممکنہ وسائل و ذرائع کا سہارا لیتا ہے، ساتھ ہی وہ کم مدت، درمیانی مدت اور طویل مدت کی معیّنہ منصوبہ بندیوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے مطلوبہ عزائم کو زیرِ عمل لاتا ہے۔ استکبار کے عملی طریقوں کو ---- اس کے مقاصد تک پہنچنے اور انہیں حاصل کرنے کے لیے ---- دو پہلوؤں سے قابلِ توجہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

الف: استکبار اپنی سرگرمیوں اور اقدامات کو کسی ایک شعبے تک محدود نہیں رکھتا، بلکہ فکر و تجزیے کے ساتھ تمام فوجی، اقتصادی، سیاسی، ثقافتی اور پروپیگنڈے کے حربوں سے کام لیتے ہوئے اپنے پورے وسائل استعمال کرتا ہے اور مختلف شعبوں میں جنگی اقدامات کا حق ہمیشہ اپنے لئے محفوظ رکھتا ہے۔

ب: وہ طویل مدت کی منصوبہ بندیوں سے، مختلف مراحل میں معیّنہ منصوبوں کے مطابق اپنے مقاصد کا اجراء کرتا ہے۔ اگر اس کا ایک کم مُدّت والا منصوبہ شکست سے دوچار ہو گیا تو وہ درمیانی مدّت یا طویل مدّت کی منصوبہ بندی میں اس پر عمل کر گذرتا ہے۔

استکبار اسی طرح اپنے بعض عزائم کو، جو زیادہ تر ثقافتی و اعتقادی پہلو کے حامل ہوتے ہیں ---- اس کے اہداف کا خیال رکھتے ہوئے ---- شروع ہی سے طویل مدت کی منصوبہ بندیوں میں منظم و مرکوز کرتا ہے۔

استکبار کی عملی صورتوں اور اس کے مختلف پہلوؤں کو فوجی، سیاسی، ثقافتی اور اقتصادی چار حصّوں میں تحقیق اور تجزیہ و تحلیل کا موضوع بنایا جاتا ہے:

فصلِ اوّل

فوجی ہتھکنڈے

پندرہویں اور سولہویں صدی (عیسوی) میں یورپ میں سائنس اور ٹیکنالوجی کا جو انقلاب رونما ہوا، اس کے نتیجے میں آتشیں اسلحہ مغربی طاقتوں کے اختیار میں چلا گیا۔ قطب نما اور راڈار سے آشنائی، اس بر تر اسلحے پر مزید اضافہ تھی جس کے سبب مغربی ممالک کے لیے نئی دریافتوں کے راستے کُھل گئے اور ان کی توسیع پسندی نے مزید سرمائے کے لیے بصورتِ تجسّس انہیں تازہ امکانات اور نئے مراحل میں داخل کر دیا۔

مغربی طاقتوں کو جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ ان کی دلچسپی کے اموال پر ان کے تسلّط کے استحکام اور ان کی روز افزوں خواہشات کے لیے محض تجارت کافی نہیں ہے۔ اس لیے وہ اسلحے کے بل بوتے پر اپنا تسلّط جمانے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے اور یوں پرتگال اور ہالینڈ کے باشندے ہندوستان اور جزائر سونڈ (۱) پر سیاسی تسلّط حاصل کر کے اپنی تجارتی اجارہ داریاں قائم کرنے میں لگ گئے۔ سپینیوں نے برِاعظم امریکہ پر سیاسی و مذہبی تسخیر کا آغاز کیا، اپنی اپنی باری پر فرانسیسیوں اور انگریزوں نے بھی سیاحوں، کشتی رانوں اور تاجروں کی صورت میں، نئے علاقے دریافت کرنے کے لیے مشرق و مغرب کی طرف کھلی ہوئی راہیں طے کیں۔ یورپ سے باہر کے ساحلوں کو جلد ہی آہنی ٹوپیاں پہنے، مسلّح سفید فام غیر ملکیوں کی روز بروز بڑھتی ہوئی امواج کا سامنا کرنا پڑا اور یوں دنیا پر سفید فام انسانوں کا غلبہ بڑھتا گیا۔ اس طرح انگلستان کی طرف سے شمال مشرقی امریکہ کے کچھ حصّے، فرانس کی طرف سے کینیڈا اور سپین کی طرف سے میکسیکو پر استعماری قبضے سے تمام ملکوں پر یورپ کا تسلّط شروع ہو گیا۔

---

(۱)—Sonde Islands

مشرق پر تسلّط کو ابتدائی طور پر ایران، ہندوستان اور ملائیشیامیں، جن کی آبادی زیادہ تھی اور جو نسبتاً طاقتور حکومتیں تھیں، ان ممالک کی شرکت سے وہاں تجارتی کمپنیاں قائم کر کے نمائندگی دی گئی اور وقتی طور پر اسی کو کافی سمجھا گیا۔

وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ انیسویں صدی میں یورپی تکنیک میں جدید ترقیاں ہوئیں، صنعتِ اسلحہ سازی کو کمال فروغ حاصل ہوا۔ اور یوں استعماریوں کا تجاوز نئے ہتھکنڈوں سے آراستہ ہو گیا۔

۱۔ براہِ راست فوجی دخل اندازی اور موجودگی

ابتداء میں استعمار کے فوجی ہتھکنڈوں کا آغاز اپنی کالونیوں میں براہِ راست دخل اندازی اور موجودگی سے ہوا، اور وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اس میں تبدیلیاں آتی گئیں۔ داخلی عوامل سے استفادہ، براہِ راست موجودگی میں کمی اور نئے مکر و فریب سے کام لے کر استکبار نے اپنے تسلّط کو برقرار اور اپنے اقتدار کو جاری رکھا۔

سب سے پہلے پرتگالی سیاحوں نے —— تیرہویں اور چودہویں صدی عیسوی میں —— طاقتور بحری قوت کی مدد سے توسیع پسندی کا آغاز کیا اور چودہویں صدی کے اوائل میں موروں (۱) پر اپنا غلبہ جمایا۔ پندرہویں اور سولہویں صدی میں آتشیں ہتھیاروں کے استعمال قطب نما اور راڈار سے واقفیت نے مغربی طاقتوں کے لیے نئی دریافتوں کا راستہ کھول دیا۔

سولہویں صدی میں پرتگال نے توسیع طلب پالیسی کا آغاز کیا اور ماورائے اوقیانوس علاقے میں بڑے پیمانے کی تجارتی سرگرمیوں میں ہراوّل دستہ بنا رہا۔ توسیع پسندی اس دور میں —— دور افتادہ علاقوں کی دولت لوٹنے کے لئے —— جدید و تازہ امکانات کے مرحلے تک پہنچ چکی تھی۔

---

(۱)— مورو (Maroans) مسلمان عربوں اور خاص طور پر ان لوگوں کا لقب جنھوں نے مراکش کے راستے جزیرہ (ایبری) سپین پر قبضہ کیا۔ سپینی لغت میں آج بھی اس لفظ کا مطلب ہے: ''بُرا''۔

پرتگال کے بادشاہ نے ۱۴۸۶ء میں بارتولومے دیاز (۱) نامی پرتگالی ملّاح کو ازراہِ تجسّس بحری سفر کے حقائق معلوم کرنے کے لیے ہندوستان روانہ کیا۔ پُرتگالی ایڈمرل واسکوڈے گاما (۲) ۱۴۹۸ء میں اس کے ہمراہ جنوبی افریقہ کے راستے بحیرۂ ہند میں داخل ہوا اور اس راستے سے ہندوستان وارد ہوا۔ یوں پُرتگالیوں نے افریقہ کا چکر کاٹ کر ہندوستان کا بحری راستہ دریافت کرلیا۔ (۳)

اس وقت تک بحیرۂ ہند اور مشرقِ بعید کی اجناس (ادویات، عطریات اور ابریشم) عرب جہاز رانوں کی اجارہ داری میں تھیں جو انہیں سوئز پہنچایا کرتے تھے۔ عربوں نے پرتگالیوں کے مقابلے میں اپنی اجارہ داریوں کا بڑی ہمت سے دفاع کیا لیکن زیادہ دیر نہیں گذری تھی کہ انہوں نے عاجز آکر شکست تسلیم کرلی۔

اس طرح پرتگال کی شہنشاہیت، ممالک پر دست اندازی اور ان کی تجارت کی اجارہ داری میں لگ گئی اور ہندوستان کی تجارت اس نوخیز شہنشاہی کی منصوبہ بندیوں میں سرِفہرست قرار پائی۔ پرتگالی حکومت نے افریقہ اور بحیرۂ ہند کے ساحلی کناروں پر مستحکم قلعوں کا ایک جال بچھا دیا جو بیک وقت بندرگاہ کے طور پر بھی استعمال ہوتے تھے اور وہیں تجارتی لین دین بھی ہوتا تھا۔ ۱۵۸۰ء میں سپین کے بادشاہ فلپ دوم نے پرتگال پر قبضہ کر کے اسے اپنی قلمرو میں شامل کرلیا۔

سترہویں صدی میں ہندوستان کی تجارت میں ہالینڈ کے باشندے پرتگالیوں کے حقیقی جانشین بن گئے۔ انہوں نے ۱۶۰۲ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی اور ۱۶۰۸ء میں ایمسٹرڈم بینک کی بنیاد رکھی اور مشرقی جزائرِ ہند (موجودہ جاوہ اور انڈونیشیا) میں اس غاصب حکومت نے اپنے آپ کو ۱/۵ حصہ زمینوں اور ۱/۶ حصہ مقامی لوگوں کی محنت کا مالک قرار دیا۔

ہالینڈیوں کے بعد، انگریزوں اور فرانسیسیوں نے استعماری طور طریقے جاری رکھے۔ اٹھارویں صدی میں برطانیہ نے ایک عظیم بحری قوّت کی حیثیت سے سمندروں میں پہلا مقام حاصل کرلیا۔ مشرقی ہند سے تجارت کرنے کے لیے پہلی انگریز کمپنی ۱۵۵۹ء اور پہلی فرانسیسی کمپنی ۱۶۰۴ء میں قائم ہوئی۔

---

(۱)— بارتولومے دیاز (Bartolome Diaz)

(۲)— واسکوڈے گاما (Vasco de Gama)

(۳)— ڈاکٹر بہار، مہدی: میراث خوار استعمار، پندرہواں ایڈیشن، انتشارات امیر کبیر، ص ۲۴۲۔

ایسٹ انڈیا کمپنی جو بظاہر ایک تجارتی کمپنی تھی، عملاً ہندوستان پر حکومت کرتی تھی۔ ہندوستان پر انگریزوں کا سیاسی غلبہ جو بظاہر فروغِ تجارت کے لیے تھا، اصل میں یہاں کی دولت لوٹنے کا بہانہ تھا۔ اس لیے ہندوستان نے انگریزوں کے اقتصادی ڈھانچے میں اہم ترین ستون کی حیثیت حاصل کرلی اور جلد ہی ہندوستان، جو اکیلا روس کے سوا پوری یورپی سرزمین جتنا وسیع تھا، انگریزوں کے استعماری تسلّط میں چلا گیا۔

ہمارا ملک بھی ہندوستان کے ساتھ ہی مغربی استعماریوں کے وسیع افق میں آگیا تھا۔ خلیجِ گوادر پر پُرتگالیوں کا حملہ، ایران میں مغربی استعمار کی آمد کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ شروع میں پرتگالی تنگنائے ہرمز پر چڑھ دوڑے اور پھر انگریزوں اور ہالینڈیوں نے خلیجِ فارس کے علاقے میں تجارت اور اس کے ساتھ ہی اپنے سیاسی و ثقافتی اثرورسوخ کی بساط بچھالی۔

یوں امپیریلزم نے دنیا پر اپنا تسلّط جمالیا۔ ۱۸۷۰ء کے بعد یورپی تہذیب و تمدّن دنیا کے دور دراز کے علاقوں تک پہنچا دیا گیا۔ مغربی یورپ کے ممالک نے ایشیا، افریقہ اور سمندری و دریائی جزائر میں اپنی اپنی کالونیاں بنالیں۔ نتیجتہً یورپی اقوام کی تاریخ پوری دنیا کی تاریخ میں شیروشکر ہوگئی۔ پس ماندہ اقوام جو یورپی یلغار کا سامنا کررہی تھیں، نہ ان میں میکینیزم کی بڑھتی ہوئی موجوں کا مقابلہ کرنے کی طاقت تھی اور نہ وہ اپنے ممالک کے دروازے نئے عقائد و نظریات پر بند کر سکتی تھیں۔ دوسری طرف عظیم ایشیائی حکومتیں، اپنے استبدادی نظامِ حکومت کے زیرِاثر بتدریج فساد کا شکار ہوتی گئیں اور یورپی مصنوعات کے تباہ کن سیلاب کے مقابلے میں اپنی اکثر مقامی مصنوعات سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔

یورپ کے صنعتی انقلاب کے بعد ریاستہائے متحدہ امریکہ بھی صنعتی ممالک کی صف میں شامل ہوگئیں۔ دوسری عالمی جنگ نے ریاستہائے متحدہ امریکہ کے لیے دنیا پر اقتصادی

تسلّط کا موقع فراہم کیا۔ ستّر کی دہائی میں، ویت نام (۱) میں امریکہ کی فوجی مداخلت اور جنوری ۱۹۸۰ء میں، افغانستان میں روس کی فوجی مداخلت، تیسری دنیا کے ممالک میں بڑی طاقتوں کی تازہ ترین براہِ راست مداخلت میں شمار ہوتی ہے۔

۲— سازش اور بالواسطہ موجودگی

۱۸۵۰ء میں یورپ کے صنعتی انقلاب کے بعد خام مال کی کھپت کافی حد تک بڑھ گئی تھی۔ اس لیے حدود یورپ سے باہر کی سرزمینوں پر ——— ان علاقوں کے بھرپور قدرتی زمینی ذخائر و وسائل کے ساتھ ——— قبضے کا میلان، یورپ کی استعماری حکومتوں کے عزائم میں شامل ہوگیا۔ چونکہ تمام مقبوضہ علاقوں میں فوجی موجودگی عملاً ممکن نہیں تھی، اس لیے استعمار نے پختہ ارادہ کرلیا کہ مخصوص ہتھکنڈوں سے اپنے مقبوضہ علاقوں کی حدود سے باہر کے زمینی ذخائر پر بھی اپنی اجارہ داری قائم کرلے یا ان کے استحصال کے سلسلے میں اپنے لیے مخصوص مراعات حاصل کرلے۔

مغرب نے گذشتہ صدیوں میں مسلسل یہ کوشش جاری رکھی ہے کہ تیسری دنیا کی غربت کو ان اقوام کی ذاتی سستی و کاہلی اور جہالت و نادانی کا نتیجہ قرار دے، اس لیے اس نے کمتر نسلوں اور برتر نسلوں کی تھیوری پیش کرکے اقوام کے معیارِ زندگی میں اختلاف کی توجیہ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن جلد ہی ان پروپیگنڈوں اور مفروضوں کا جھوٹ کُھل کر سامنے آگیا۔ کیونکہ یہ تمام فریب کاریاں ترقی پذیر ممالک کے سرمایہ اور ان کے ذخائر کو ناجائز

---

(۱)— ویت نام جنوب مشرقی ایشیا کے آخری حصے میں واقع ہے۔ ۱۹۷۹ء کے اعداد و شمار کے مطابق اس کی آبادی ۵۳ ملئین نفوس سے زیادہ ہے۔ ۱۸۴۰ء سے ویت نام پر فرانسیسی جارحیت کا آغاز ہوا۔ فرانس نے ۱۸۸۳ء میں اپنی مسلح افواج ویت نام بھیجیں اور ۱۸۹۳ء میں اس نے اپنی دوسری کالونیوں لاؤس اور کمپوچیہ کے ساتھ ملاکر اتحادیہ ہند وچین قائم کی۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران ہند وچین پر پانچ سال تک جاپانیوں کا قبضہ رہا۔ ۱۹۵۴ء میں فرانسیسیوں نے بہت زیادہ نقصانات اُٹھاکر اپنی فوجی موجودگی محفوظ رکھی اور بتدریج اپنی جگہ امریکہ کے لیے چھوڑتے گئے۔ ۱۹۷۳ء میں ویتنامی قوم کی مجاہدانہ مزاحمت کے بعد امریکہ ویت نامی لیڈروں سے مذاکرات پر مجبور ہوگیا اور ۳۰—اپریل ۱۹۷۵ء کو جنوبی ویت نام کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا اور ویت نام امریکہ کے ہاتھ سے جاتا رہا۔ آجکل ویت نام ایک سوشلسٹ جمہوریہ کی صورت میں چل رہا ہے۔

طور پر ترقی یافتہ علاقوں میں منتقل کرنے اور ان کے اموال و وسائل کو لوٹنے کا بہانہ ہیں۔(۱) اس مقصد کے حصول کے سلسلے میں، تمام ممالک میں اپنے مالی مفادات کے تحفظ کی خاطر، استکبار کو جہاں براہِ راست فوجی موجودگی و مداخلت سے کام بنتا دکھائی نہیں دیتا وہاں وہ بالواسطہ چالوں سے کام لیتے ہوئے، فوجی مشیر بھیج کر اور پٹھو حکومتیں قائم کرکے، بااثر عوامل اور اندرونی حامیوں سے استفادہ کرتے ہوئے ایسی صورتِ حال بنا دیتا ہے کہ اس کا عملی و استعماری تسلّط ممکن ہو جاتا ہے۔

چونکہ مکر و فریب کا یہ جال استکبار کے اقتصادی و ثقافتی غلبے کو یقینی بنانے کے لیے پھیلایا جاتا ہے، اس لیے متعلقہ حصّوں میں اس سلسلے پر مزید وضاحت سے تحقیق کی جائے گی۔

۳ــــ علاقائی تنازعات اور سرحدی اختلافات پیدا کرنا

عالمی استکبار ہمیشہ کھچاؤ، اختلاف اور تنازع کو اپنی موجودگی کے جواز کے اہم عوامل میں سے سمجھتا ہے اور دنیا کے مختلف خطّوں میں بحرانی علاقے پیدا کرکے، ممالک کے باہمی اختلافات کی آگ کو ہوا دے کر، اپنی مداخلت اور استحصال کے عوامل کے لیے میدان ہموار کرتا ہے۔ جب سے تیسری دنیا کے ممالک یکے بعد دیگرے استعماری قید و بند سے آزادی و رہائی کے خواہاں ہوئے ہیں، استعمار اُن کے ذخائر اور خام مال کو حسبِ سابق لوٹتے رہنے کے لیے نت نئے حربے آزمانے لگا ہے۔

بعض ممالک مصنوعی طور پر وجود میں آئے ہیں۔ ان معنوں میں کہ ان ممالک کی سرحدیں لازماً جغرافیائی، تاریخی اور نسلی مطالعات کی بنیاد پر متعین نہیں کی گئیں اور یوں ہر لحاظ سے ایک مستقل دشمنی اور نفاق کا بیج بو دیا گیا۔ گذشتہ صدیوں میں استعماری نظاموں کی

---

(۱) ــــ ڈاکٹر بہار، مہدی: میراث خوار استعمار، پندرہواں ایڈیشن، انتشارات امیر کبیر۔

کارستانیوں کے پیشِ نظر، دنیا کے مختلف حصوں میں بہت سے شواہد اس حقیقت کی تائید کرتے ہیں۔

نئے ممالک اور نئی سرحدوں کی تشکیل استعمار کی عظیم ترین اور پیچیدہ ترین خیانتوں میں سے ہے جو اس نے ان علاقوں کی اقوام اور باشندوں کے حق میں روا رکھی ہے۔ ان سرحدوں کی تعیین کچھ اس طرح کی گئی ہے کہ یہ عام طور پر مختلف اقوام و قبائل کے درمیان میں سے گذر رہی ہیں۔ ان انسانی گروہوں کے دو یا تین حصوں میں بٹ جانے سے، مختلف سرحدی، انسانی، ثقافتی اور اقتصادی مسائل پر کشمکش و اختلاف نے ابدی اور دائمی صورت اختیار کرلی ہے۔ اس میں سے نئے ممالک کے لیے جو کچھ بچا ہے وہ بڑا ہی منحوس ورثہ ہے، کیونکہ انہیں اپنا تمام سرمایہ، اپنی تمام کوششیں اور اپنے تمام وسائل، سرحدی و علاقائی کشمکشوں، اختلافات اور جنگوں کی بھینٹ چڑھا دینے ہوں گے۔

معاہداتی اور خود ساختہ سرحدوں کا ملاحظہ کرنے سے بآسانی پتہ چل سکتا ہے کہ ان میں سے اکثر کی تعیین، انسانی اور حقیقت پسندانہ مطالعات کے بغیر، جیومیٹری کے آلات کی مدد سے جغرافیائی نقشوں پر کی گئی ہے۔ وہ یوں کہ ان میں سے بیشتر خطوطِ مستقیم اور بعض قائمہ زاویوں سے تشکیل پاتی ہیں ——— جس سے ٹرائی سرکل کے بھرپور استعمال کا پتہ چلتا ہے۔ برِاعظم افریقہ کے سرحدی خطوط کے سلسلے میں خاص طور پر یہ امر زیادہ واضح اور نمایاں ہے۔

برصغیر ہند (و پاکستان) کو دورِ آزادی سے لے کر اب تک کبھی امن و سکون کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہوا اور یہ علاقہ ہمیشہ جنگ و جدل کا مرکز رہا ہے۔ پاکستان اور بھارت میں گاہے بگاہے ہونے والی جنگ و خشونت، کشمیر کا لاینحل مسئلہ، سکھوں سے متعلق مسائل، مشرقی و مغربی پاکستان کی علیحدگی اور بنگلادیش کی تشکیل، سری لنکا میں تاملوں سے متعلق مسائل اور پاکستان اور افغانستان کی سرحدوں کا واضح نہ ہونا، یہ ان اختلافات کا ایک حصہ ہیں جو برِصغیر میں پائے جاتے ہیں۔

مشرقِ وسطیٰ، نئے آزاد ہونے والے ممالک کے مابین موجود اختلافات کے علاوہ، اسرائیل (مقبوضہ فلسطین) جیسے سرطانی غدود کے وجود سے مستقل طور پر جنگ اور بدامنی کی کشاکش ہیں سلگ رہا ہے۔ جنوبی افریقہ میں وہاں کی نسل پرست حکومت —— عالمی استکبار کے نمائندے کے طور پر —— مقامی اور سیاہ فام باشندوں کا قلع قمع کر رہی ہے اور دنیا کے اس حصّے کے وسائل و ذخائر کی لوٹ کھسوٹ میں مشغول ہے۔ لاطینی امریکہ میں پٹھو اور امریکی کارٹلز اور ٹرسٹوں سے وابستہ حکومتیں وہ تمام عظیم دولت ہتھیا کر امریکی بنکوں میں بھیج رہی ہیں جو اس وسیع برِّاعظم کے زمینی اور زیرِ زمینی وسائل سے اب تک حاصل کی جاسکی ہیں۔ ایک اور مضبوط پیوند —— یعنی بھاری بیرونی قرضوں —— کے ذریعے، جو لاطینی امریکہ کے مقدر کی استعمار سے وابستگی کا سبب ہے، اس علاقے کے ممالک کے تمام قیمتی ذخائر ہڑپ کیے جارہے ہیں۔

استکباری طریقۂ واردات کی بہتر طور پر شناخت کے لیے، دنیا کے دو علاقوں میں موجود کشیدگی کے دو عوامل یعنی مشرقِ وسطیٰ میں مقبوضہ فلسطین اور افریقہ کے جنوب میں جنوبی افریقہ پر مزید تحقیق کی جاتی ہے:

الف — عربوں کے مقابلے میں اسرائیل

مشرقِ وسطیٰ کے مسلمان اور عرب ممالک کے بیچوں بیچ، مملکتِ فلسطین کے اہم ترین حصّے پر مشتمل یہودیوں کے ملک یا اسرائیل کے قیام کو بجا طور پر برطانیہ کی استعماری حکومت کا ایک منحوس ترکہ سمجھا جاتا ہے۔ (۱)

(۱) — برطانیہ نے اپنے استعماری دور میں دو عظیم کامیابیاں حاصل کی ہیں، ایک تو اسلامی ممالک کے دل میں اسرائیل کی غاصب حکومت کی تشکیل جس میں مسلمانوں کا قبلۂ اولؔ بھی شامل ہے، اور دوسری سعودی خاندان کو آگے لاکر جزیرہ نمائے عرب اور سرزمینِ حجاز پر ان کی حکومت کا قیام ہے، یہ جانتے ہوئے کہ اسلام اور مسلمانوں کے لیے حرمین شریفین کتنی غیر معمولی اہمیت کے حامل مقامات ہیں۔

برطانوی شہنشاہیت کے غلبہ و نفوذ میں کمی نے رفتہ رفتہ اس علاقے کو چار بڑی طاقتوں یعنی برطانیہ، فرانس اور پھر روس اور امریکہ کے میدانِ رقابت میں تبدیل کر دیا۔ ان میں سے ہر ایک نے متحارب فریقین کے لیے اسلحہ اور جنگی ساز و سامان کے ڈھیر لگا دیے۔ (۱)

شروع شروع میں ہتھیار نسبتاً کم اور محدود تھے اور اسلحے کی اجارہ داری صرف انگریزوں کے پاس تھی۔ لیکن ۱۹۵۳ء میں فرانسیسیوں نے بتدریج موجود تناسب درہم برہم کر دیا اور مارشل داسو کمپنی کی مصنوعات نے فرانس کے لیے یہ امکان روشن کر دیا کہ وہ اپنے آئندہ سیاسی عزائم کے لیے اسلحہ اور دیگر جنگی ساز و سامان کی فروخت سے فائدہ اٹھائے۔

فرانس نے داسو کمپنی کے بنے ہوئے ۲۴ "اوراگن" جنگی طیارے اور اس کے ایک سال بعد "مسٹر" طیارے فروخت کر کے علاقے کی اسلحہ مارکیٹ میں اپنی موجودگی کا اعلان کر دیا۔

شروع میں برطانیہ اور امریکہ کی حکومتیں، عربوں کے تیل اور مغربی دنیا کے لیے ان کے مخصوص اہم جنگی محلِ وقوع کے پیشِ نظر ان کی دشمنی و خصومت مول نہیں لینا چاہتی تھیں اور بظاہر اسرائیل کو مسلح کرنے میں کوئی خاص جھکاؤ بھی ظاہر نہیں کر رہی تھیں، لیکن خفیہ طور پر وہ اسے تحریک میں لانے اور اسے استحکام دینے میں لگی ہوئی تھیں۔

مصر میں جمال عبدُ النّاصر کے برسرِ اقتدار آنے، فرانس سے الجزائر کی جنگِ آزادی میں اس کی طرف سے الجزائر سے تعاون اور اس کی طرف سے عرب نیشنلزم کی حمایت سے فرانسیسیوں کو اسرائیل کی صورت میں اپنا ایک فطری ساتھی مل گیا اور انہوں نے اسرائیل میں جنگی طیاروں اور ٹینکوں کے ڈھیر لگا دیے۔ اس کے مقابلے میں روس نے مصر کو اسلحہ، جنگی ساز و سامان اور لڑاکا طیارے دیے اور علاقے کے عرب ممالک میں اپنی پوزیشن مضبوط کرنے میں لگ گیا۔ امریکہ، مشرقِ وسطیٰ میں اپنے عرب دوستوں کی ناراضی سے بچنے کے لیے اپنے اتحادیوں پر دباؤ ڈالتا تھا کہ اسرائیل کو اسلحے کی ترسیل کے لیے بالواسطہ راستے اختیار کیے جائیں اور اس سلسلے میں مغربی جرمنی نے خاص طور پر نہایت اہم کردار ادا کیا۔

ہٹلر کی نازی حکومت نے یہودیوں کا جو قتلِ عام کیا تھا، جرمنی اخلاقاً اپنے آپ کو اس کا ذمہ دار سمجھتا تھا، چنانچہ وہ امریکہ اور برطانیہ کے اس دباؤ کے مقابلے میں فرض شناسی کا ثبوت دیتے ہوئے یوں ظاہر کرتا تھا کہ جیسے اسرائیل کی امداد میں خود جرمنوں نے پیشقدمی

(۱) — سیمپسن، انتھونی: بازارِ اسلحہ، ترجمہ از فضل اللہ نیک آئین، ص ۱۸۹۔

کی ہے۔

۱۹۶۳ء میں اسرائیل کے لیے بھیجی جانے والی اسلحے کی ایک بہت بڑی کھیپ پکڑی گئی جو دو سو امریکی ٹینکوں پر مشتمل تھی، امریکی وزارتِ خارجہ کو اس سے مجبور ہو کر سرکاری طور پر یہ اعتراف کرنا پڑا کہ اسرائیل کی امداد کو اس کی حمایت حاصل ہے۔

حکومتِ اسرائیل کے قیام کے بعد (۱) گذرنے والی چند دہائیوں میں اور عربوں اور اسرائیل میں ہونے والی چار جنگوں کے بعد، دنیا کے اس خطّے میں موجود اسلحہ سازی کے کارخانوں میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ اب پورے مشرقِ وسطیٰ میں جنگی ساز و سامان کی خریداری کے لیے دوڑ لگی ہوئی ہے۔ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۱ء کے عرصے میں (۲) اس علاقے میں اسلحے کی خریداری میں سالانہ اضافے کی شرح، عالمی اضافے کی اوسط سے تقریباً دُگنی ہے یعنی ۵/۶ فیصد کے مقابلے میں ۵/۱۱ فیصد ہو گئی ہے۔ ۱۹۶۱ء کے بعد اس اضافے کی اوسط شرح ۲۰ فیصد تک پہنچ گئی تھی جو عالمی شرح یعنی ۸/۲ فیصد سے تقریباً سات گنا زیادہ ہے۔

۱۹۷۴ء تک مشرقِ وسطیٰ میں ناخالص قومی آمدنی ۸۴۵ ڈالر فی کس تھی، جس میں سے ۱۳۵ ڈالر فی کس کے حساب سے فوجی اخراجات میں صَرف ہوئے ہیں۔

---

(۱)— برطانیہ کے صہیونیوں نے "حیم وائزمین" کی قیادت میں برطانوی کابینہ کی حوصلہ افزائی کی کہ اگر برطانوی حکومت صہیونی تحریک کی حمایت کرے تو یہودی عمومی طور پر اس کی تائید کریں گے اور اس عمل سے لوگ اتحادیوں کی حمایت کریں گے۔ برطانوی حکومت نے ۲— نومبر ۱۹۱۷ء کو "معاہدۂ بالفور" میں وعدہ کیا کہ یہودیوں کے لیے فلسطین میں ایک قومی وطن کی تشکیل کی جائے (اعلامیۂ بالفور اس وقت کے برطانوی وزیرِ خارجہ بالفور نے جاری کیا اس لیے بعد یہ میں اسی نام سے پکارا جانے لگا)۔

۵— مئی ۱۹۲۰ء کو "سن رمو" میں ہونے والی اتحادی افواج کی کانفرنس میں، عراق اور فلسطین کو جس میں ماورائے اردن کا علاقہ بھی شامل تھا، برطانیہ کی سرپرستی میں دے دیا گیا۔ اعلامیۂ بالفور سے فلسطین میں یہودی مہاجرین کا سیلاب آ گیا جبکہ جنگ کے زمانے میں علاقے کی یہودی آبادی کم ہو کر ساٹھ ہزار رہ گئی تھی۔ برطانیہ اور اس کے اتحادیوں کی طرف سے فلسطین کی جانب یہودیوں کی ہجرت کرنے پر بے دریغ حمایت نے غاصب یہودی حکومت کے قیام کے لیے راستہ ہموار کیا۔ مزید معلومات کے حصول کے لیے دیکھیے کتاب "اسرائیل و اعراب" تصنیف میکسم روڈنسن، ترجمہ ابراہیم دانائی۔

(۲)— سیمپسن انتھونی، بازارِ اسلحہ، ترجمہ فضل اللہ نیک آئین، ص ۱۹۰۔

واحد تاریخی مثال جو مشرقِ وسطیٰ کے مسئلے میں قابلِ قیاس ہے، وہ دوسری عالمی جنگ سے پہلے کے برسوں میں یورپی ممالک کے مابین ہونے والی حصولِ اسلحہ کی دوڑ ہے۔

ب — نسلی تعصُّب کے قائدین کو مُسلّح کرنا

۱۹۶۰ء کی دہائی میں، افریقہ کے جنوبی حصّے میں واقع جنوبی افریقہ کے ممالک میں انگریزوں کی قدیم ضرب المثل "موت کے سوداگر" مجسّم ہو کر سامنے آگئی۔ یہ ملک جو جنوبی افریقہ میں استعمار کا ناجائز بچّہ اور استکبار کی غلبہ پسندی اور نسل پرستی کی پیداوار ہے، سفید فام انگریزوں کے ایک گروہ کے ذریعے مقامی سیاہ فام افریقیوں کا استحصال کر کے، اس براعظم کے زیرِ زمین ذخائر کی لوٹ کھسوٹ اور یہاں کے عوام کے استحصال کا اڈہ بن گیا۔ (۱) جنوبی افریقہ کی اپارتھائیڈ حکومت، برطانیہ کی حمایت سے اپنا وجود قائم رکھنے کے لیے افریقہ میں اسلحے کی سب سے بڑی خریدار بن گئی۔

۱۹۶۰ء میں جنوبی افیقہ کے شمال میں واقع سیاہ فام ممالک کے حصولِ آزادی کے ساتھ ہی نسلی برتری کی سیاست سے دنیا والوں کی نفرت و بیزاری بڑھ گئی، اور اگست ۱۹۶۳ء میں اقوامِ متحدہ نے تمام ممالک سے درخواست کی کہ وہ جنوبی افریقہ کو اسلحہ اور سامانِ حرب و ضرب کی فروخت فوراً بند کر دیں۔ اسلحہ اور جنگی ساز و سامان کی فروخت کی یہ ممانعت، جنوبی افریقہ کی طرف سے اسلحے کی خرید میں رکاوٹ نہ بن سکی۔

جنوبی افریقہ کی حکومت نے ۶۴ لڑاکا میراج، ۷۵ ہیلی کاپٹر اور کئی طرح کا دوسرا جنگی ساز و سامان فرانس سے خرید لیا۔ یہاں تک کہ ۱۹۶۸ء تک اسلحہ کی خریداری کے سلسلے میں یہ ملک، اسرائیل اور بلجیئم کے بعد فرانس سے اسلحہ خریدنے والا تیسرا بڑا ملک شمار ہونے لگا۔

نومبر ۱۹۶۷ء میں اس نے اسٹرلنگ لیرہ کی قیمت میں کمی کے بحران سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ایک اور فہرست حکومتِ برطانیہ کو تھمادی جو بوکانیر جہازوں، ویسٹ لینڈ ہیلی کاپٹروں، مختلف جنگی کشتیوں اور فضا میں مار کرنے والے میزائلوں پر مشتمل تھی۔

ان دنوں جنوبی افریقہ ایک بہت بڑے اسلحہ خانے میں تبدیل ہو چکا تھا جسکو اسلحے کے بہت سے تاجر ممالک کی طرف سے اسلحہ اور دوسرا جنگی ساز و سامان ملتا رہتا تھا، جبکہ چھوٹا آتشیں اسلحہ اور جنگی ساز و سامان خود جنوبی افریقہ میں تیار کیا جاتا تھا۔

---

(۱) — سیمپسن، انتھونی: بازارِ اسلحہ، ترجمہ فضل اللہ نیک آئین، ص ۱۸۱ ـ ۱۸۷۔

یہ نسل پرست حکومت جنوبی افریقہ میں کسی سپاہی کی طرح --- استعماریوں کے نمائندے کے طور پر --- بین الاقوامی لٹیروں کے مفادات کے تحفظ کی ٹھیکہ دار بنی ہوئی ہے۔ افریقی مجاہدین کے قتلِ عام اور سرکوبی کے باوجود، سیاہ فام افریقیوں کی جدوجہدِ آزادی کی چنگھاڑتی ہوئی موجوں نے اس غیر انسانی حکومت کو ایسی سخت مشکلات میں مُبتلا کر رکھا ہے کہ اس کے لیے اپنا وجود برقرار رکھنا دشوار ہوگیا ہے۔ زیادہ عرصہ نہیں گذرے گا کہ (خدا کی رضا اور عوامی تحریکوں کے تسلسل سے) اس گمراہ حکومت کا شرمناک نامۂ اعمال ہمیشہ ہمیشہ کے لیے لپیٹ دیا جائے گا۔

۴ --- اسلحے کی تجارت (موت اور فنا کی سوداگری)

اسلحے کے حصول سے تین مقاصد حاصل ہوتے ہیں:

۱ --- فوجی ضروریات:

اندرونی اور بیرونی کشمکشوں کے حل کے لیے، مسلّح افواج سے استفادہ کسی بھی وقت ناگزیر ہو سکتا ہے اور اس کے لیے جنگی ساز و سامان کا ہونا ضروری ہے۔

۲ --- ملکی وحدت و سلامتی کی حفظ و بقاء:

قوم کے مختلف طبقوں میں وحدت کی بقاء اور قومی تشخص کو برقرار رکھنے کے لیے اکثر اسلحے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اگرچہ آزادی پسند تحریکوں کا دارومدار زیادہ تر قومی پارٹیوں پر ہوتا ہے لیکن ان پارٹیوں کا متفقہ نصب العین بن کر جس چیز نے انہیں آپس میں رشتۂ اتحاد میں جکڑا ہوا ہوتا ہے، وہ ہے حصولِ آزادی کے لیے ان کی جدوجہد، اور جونہی آزادی حاصل ہو جاتی ہے تو آہستہ آہستہ نسلی و گروہی اختلاف بھی اُبھر کر سامنے آنے لگتے ہیں اور وہ پہلی سی ہم آہنگی ختم ہو جاتی ہے۔ نئے لیڈران پارٹیوں کی حمایت حاصل کرنے یا نئے حامی بنانے کے لیے اکثر اوقات قومی جذبات کا سہارا لیتے ہیں، اور چونکہ مُسلّح افواج قومی آزادی کی بہترین خصوصیات اور مظاہر میں سے ہیں، اس لیے حصولِ اسلحہ سے انجامِ کار ایسے جذبات کی تقویت کے وسیلے کے طور پر کام لیا جاتا ہے۔

بیرونی سیاست کی حمایت کے لیے طاقتور فوج کی ضرورت بھی اسی مقصد کا ایک حصّہ ہے۔

۳— فوج کی طاقت میں اضافہ:

ممالک کے اندرونی اختلافات اکثر فوج پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ حکومتیں ان کی حمایت سے اسی وقت مطمئن ہو سکتی ہیں جب اپنی قوت میں اضافے اور ضروری اسلحے کے حصول کے سلسلے میں فوج کا مطالبہ پورا کریں۔

تیسری دنیا کے ممالک، استعماریوں کے ہاتھوں اپنے ذخائر اور مال و دولت کی لوٹ کھسوٹ سے پیدا ہونے والی غربت و تنگدستی کے باوجود، غلبہ پرست ممالک کی طرف سے مسلّط کردہ حالات کے پیشِ نظر اسلحے اور جنگی ساز و سامان کی خریداری پر مجبور ہیں اور مغربی ممالک بھی بڑی رضا و رغبت سے یہ چیزیں انہیں فراہم کر دیتے ہیں۔ چنانچہ ۱۹۷۲ء میں اکیلا مشرقِ وسطیٰ، پوری ترقی پذیر دنیا کے دفاعی اخراجات کا ۱/۴ حصّہ برداشت کرتا تھا اور اعلیٰ قسم کے ہتھیاروں کی درآمد کا ۱/۳ حصّہ وہ صرف اپنی ذات کے لیے مخصوص رکھتا تھا۔ ۱۹۷۰ء کی دہائی میں فرانس اور برطانیہ کے اسلحے کے نوّے فیصد خریدار تیسری دنیا کے ممالک تھے۔ دس سال کے عرصے میں فرانسیسی اسلحے کی فروخت کی شرح، تمام دوسری برآمداتی اجناس کی شرح سے دُگنی ہو گئی ہے۔

۱۹۷۸ء میں، اسلحے کی بین الاقوامی تجارت میں برآمد کرنے والے ممالک کا حصّہ کچھ یوں تھا:(۱)

---

(۱)— شرائیبر، ژان ژاک سروان، تکاپوی جہانی، ترجمہ عبد الحسین نیک گہر، ص ۲۱۸

گذشتہ بیس سالوں میں (۱۹۶۸ء تک) تیسری دنیا کے ممالک کو سب سے زیادہ بھاری اسلحہ فروخت کرنے والا ملک امریکہ ہے، اس کے بعد دوسرا نمبر روس کا ہے۔ یہ دونوں ملک، مذکورہ ممالک کے اسلحے اور دیگر جنگی ساز و سامان کا ۲/۳ حصہ فراہم کرتے ہیں۔ ان کے بعد اہم تاجران اسلحہ برطانیہ اور فرانس ہیں جو مجموعی طور پر تمام اسلحے کا بیس فیصد سے زیادہ حصہ مہیا کرتے ہیں۔

مزید معلومات کے لیے ملاحظ ہو: کتاب تجارتِ اسلحہ، صلح کے بارے میں عالمی انجمن کی رپورٹ بابت ۱۹۷۱، سٹاک ہوم، ترجمہ: ابراہیم یونسی، بعد از صفحہ ۱۹۔

شرح فیصد	ملیارڈ ڈالر	ملک
۴۸	۱۲	ریاست ہائے متحدہ امریکہ
۲۶/۹	۷	روس
۱۱/۲	۳	فرانس
۳/۹	۱/۲	اٹلی
۳/۰	۱	برطانیہ

بنیادی طور پر اسلحے کی برآمدات اور اس کی تجارت، مغربی ممالک کو ان کے بجٹ کا اچھا خاصا حصّہ فراہم کرتی ہے۔ بطورِ مثال فرانس کا دفاعی بجٹ جو ۱۹۸۰ء میں ۸۲ بلئین فرانک سے زیادہ تھا، اسلحے کی برآمدات کے بغیر اس میں ۲۰ بلئین فرانک کا اضافہ ہونا چاہیے تھا۔ مغربی جرمنی نے، جسے قانون کے مطابق اجازت نہیں ہے کہ وہ کسی ایسے ملک کو اسلحہ فروخت کرے جو "معاہدۂ ناٹو" کا ممبر نہیں، ۱۹۷۸ء میں ۴/۲ بلئین فرانسیسی فرانک کا اسلحہ فروخت کیا ہے، اور اس نے اپنی اسلحہ ساز فیکٹریوں میں دو لاکھ آدمیوں کو کام پر لگا رکھا ہے۔ یوں امریکہ، روس، فرانس اور برطانیہ جیسے ممالک میں نہ صرف اسلحے کی تجارت سے ملکی بجٹ کا بڑا حصہ فراہم ہوتا ہے بلکہ لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو اسلحہ ساز فیکٹریوں میں کام بھی مل جاتا ہے۔ اس طرح وہ ترقی پذیر ممالک کے قیمتی ذخائر نگل کر، ان کی اچھی خاصی پونجی اور مالی ذخائر کو بھی تباہ و برباد کرتے ہیں۔

۱۹۸۳ء میں اسلحے کی تجارت سے حاصل ہونے والی رقم ۱۳۵ بلئین ڈالر تک تھی، جس میں سے ستّر فیصد حصّہ بڑی طاقتوں کا تھا۔ امریکہ اور روس اسلحے کے بڑے تاجروں میں سرِفہرست تھے اور بظاہر آثار یہ تھے کہ امریکہ، روس سے بازی لے جائے گا۔

امریکی اسلحے کے خریداروں کی فہرست، روسی اسلحے کے خریداروں کے مقابلے میں دگنی ہے۔ مرتّبہ جدول سے پتہ چلتا ہے کہ روسی اسلحے کے ۱۶ خریداروں کے مقابلے میں، امریکی اسلحہ کے بڑے خریداروں کی تعداد ۳۹ ہے۔ اس فہرست کی اگلی سطروں میں یورپی ممالک کی باری آتی ہے، جن میں فرانس کو اوّلیت حاصل ہے۔ پھر برطانیہ، وفاقی جمہوریہ جرمنی اور اٹلی بالترتیب دوسرے، تیسرے اور چوتھے نمبر پر ہیں۔ چیکوسلواکیہ، ہنگری، شمالی کوریا،

برازیل، سپین، جنوبی کوریا، اسرائیل اور سوئٹزرلینڈ جیسے ممالک کا ذکر بھی اسی فہرست کی مابعد سطور میں ترتیب وار کیا گیا ہے۔ (۱)

گذشتہ سالوں میں، اس فہرست میں چین، جنوبی افریقہ، بھارت اور مصر کا بھی اضافہ ہوا ہے۔ ۱۹۸۴ء میں برازیل کی صنعتِ اسلحہ سازی نے اسلحہ بر آمد کرنے والے ممالک کے ساتھ بہت سخت رقابت کا آغاز کر دیا اور اس کے جنگی ساز و سامان کی بر آمدات کی مالیت تین بلئین ڈالر تک پہنچ گئی۔

اِس وقت ارجنٹائن، انڈونیشیا، پاکستان، چلّی، شمالی کوریا، جنوبی کوریا، فلپائن، ترکی، مصر، تائیوان، کولمبیا، تھائی لینڈ، بھارت اور برازیل خود اپنے اپنے جہاز اور دوسرا جنگی ساز و سامان بنا رہے ہیں۔ (۲) ان میں سے اکثر ممالک اسلحہ سازی میں خود کفیل ہونے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔ جنگی ہتھیاروں کی ملکیت حملہ آور دنیا کے مقابلے میں ایک طرح سے قوت اور اطمینانِ خاطر کا سمبل بن گئی ہے۔ شاید ہی کوئی دن ہو کہ جب دنیا کے مشرق و مغرب سے کوئی ایسی آواز نہ اُٹھے جو ملک کی آزادی و سلامتی اور اس کے اسلحے کے ذخائر میں ربط و پیوند کی خواہاں نہ ہو۔ اس لیے تیسری دنیا کے قائدین کو بھی کوئی صورت نظر نہیں آتی کہ وہ اپنے آپ کو مسلّح کرنے سے اغماض برتیں۔ اس کے برعکس ان کی قوت و ہمت بھی بڑھتی ہے۔ کیونکہ اسلحے کی تجارت ایک فائدہ بخش تجارت ہے اور اسے جاری رہنا چاہیے۔ (۳)

۱۹۸۵ء میں دنیا میں جنگی ساز و سامان کے اخراجات ۸۰۰ بلئین ڈالر سے زیادہ تھے۔ خبر رساں ایجنسی تاس نے، جنیوا سے سوئٹزرلینڈ کی خبر رساں ایجنسی کے حوالے سے، ان

---

(۱) — برانٹ، ویلی: جہانِ مسلّح، جہانِ گرسنہ، مترجم: ہرمز ہمایون پور، سازمان انتشارات و آموزشِ انقلابِ اسلامی ص ۲۹۷ کے بعد۔

(۲) — شرائبر، ژان ژاک سروان: تکاپوی جہانی، مترجم: عبدالحسین نیک گہر، ص ۲۲۱۔

(۳) — واشنگٹن میں کانگریس کی ایک تحقیق کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ ریاستہائے متحدہ (امریکہ) مفلوک الحال ممالک کو اسلحے کی خریداری پر اکساتا ہے جنہیں عام طور پر نہ اس کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ جن کے پاس اس کی قیمت ادا کرنے کے لیے سرمایہ ہوتا ہے۔ ریاست اورگون کا جمہوریت پرست سینیٹر مارک ہٹ فیلڈ جو صلح پسندانہ پالیسیوں کا حامی ہے اور اس تحقیق کا انچارج ہے، وہ اس کام کو کوتاہ اندیشانہ کہتا ہے، اسے اچھی طرح علم ہے کہ اتنی سی بات سے حقِ مطلب ادا نہیں ہوتا، اس سلسلے میں ایک مثال: ۸۴—۱۹۸۲ء میں امریکہ کی طرف سے افریقہ کی امداد میں ۴۰ فیصد اضافہ ہوا لیکن اس عرصے میں اسلحے کی فروخت اور بخشش کی شرح ۱۵۰ فیصد بڑھ گئی۔ (نقل از کتاب "جہانِ مُسلّح، جہانِ گرسنہ" ص ۲۹۸)۔

اعداد و شمار کا ذکر کرتے ہوئے توجہ دلائی ہے کہ دنیا کے ممالک نے اسی سال ایک فوجی کی ضروریات کے لیے اوسطاً ۲۵۶۰۰ ڈالر خرچ کیے ہیں جبکہ ایک بچے کی تربیت کے لیے صرف ۴۵۰ ڈالر مخصوص کیے گئے ہیں۔

بین الاقوامی ادارہ برائے سرمایہ کے دفتر اعداد و شمار نے اعلان کیا: "امیر صنعتی ممالک خصوصاً امریکہ کے فوجی اخراجات اَسّی کی دہائی میں بڑھے ہیں۔" حال ہی میں شائع ہونے والے اعداد و شمار میں فرانس پریس کی رپورٹ کے مطابق امیر ممالک اپنی آمدنی کا ۳/۴ فیصد فوجی اخراجات پر صَرف کرتے ہیں۔ اس رپورٹ کے مطابق امریکہ نے اپنی ناخالص آمدنی کا ۶ فیصد فوجی اخراجات کے لیے مخصوص کیا ہے جو ۱۹۸۴ء میں سب سے زیادہ اضافہ ہے۔(۱) یہ جاننے کے لیے کہ استکبار دنیا کے بحرانی حالات سے جن میں کشیدگی کی بنیادی وجہ بھی وہ خود ہی ہوتا ہے، کس طرح فائدہ اُٹھاتا ہے؟ دنیا کے ایک حصے یعنی برصغیر ہند و پاکستان اور خلیجِ فارس کا ذکر کرکے، ہم آخر میں صرف اسلامی انقلاب کی کامیابی سے پہلے کی دہائی میں ایران کو فروخت ہونے والے اسلحے کے اعداد و شمار کا جائزہ لیتے ہیں۔

برِصغیر ہند (و پاکستان)

برِصغیر ہند (و پاکستان) میں اسلحے کا تقاضا ان کشیدگیوں اور بے امنیوں کی وجہ سے ہے جو غلبۂ استعمار کے دنوں کی پیداوار ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے اہم برِصغیر ہند کی تقسیم تھی جس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے تاریخی تنازعات کو واضح کر دیا اور انہیں سرکاری حیثیت دے دی۔ ۱۹۴۷ء سے، جب سے برِصغیر کو آزادی ملی اور اس کے کئی حصے ہو گئے، بھارت اور پاکستان کے فوجی منصوبہ سازوں کی ساری توجّہ، پاک بھارت جنگ کے امکان پر ہی مرکوز

---

(۱) — ۱۹۸۶ء میں دنیا بھر میں ہزار بلئین ڈالر سے زیادہ رقم فوجی اخراجات پر صَرف ہوئی۔ دنیا کی اقوام اوسطاً ہر منٹ میں بیس لاکھ ڈالر اسلحے اور دوسرے فوجی پروگراموں پر خرچ کرتی ہیں جبکہ ہر منٹ میں پانچ پانچ سال کی عمر کے تیس بچے غذا اور صاف ستھرا صحت مند اور پاکیزہ پانی نہ ہونے یا حفظانِ صحت کے اصولوں کے مطابق دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے مرجاتے ہیں۔

(برانٹ کمیشن کی رپورٹ، نقل از کتاب "جہان مسلح اور جہان گرسنہ، ص ۵۲)

ہے۔

اس علاقے سے برطانیہ کے چلے جانے کے بعد بہت سے اور جھگڑے پیدا ہو گئے۔ افغانستان ––– جہاں حکومتی گروہ پختونوں پر مشتمل ہے ––– کی پاکستان کے ساتھ اس کے سرحدی علاقوں میں رہنے والے پختونوں کے مستقبل کے مسئلے پر کشمکش۔ برطانیہ کی مقرر کردہ سرحدوں کے معاملے میں بھارت اور چین کی کشیدگی۔ مسئلہ کشمیر اور تاملوں اور سکھوں کے مسائل وغیرہ۔ نیز برِصغیر میں دو بڑی طاقتوں کے مفادات اور ان کی رقابت کی وجہ سے بھی دنیا کے اس حصّے میں اسلحے کی دوڑ لگی ہوئی ہے۔

خلیجِ فارس اور جزیرہ نمائے عرب

اس علاقے میں اسلحے کی ترسیل، ۱۹۶۵ء سے بڑی تیزی سے بڑھنے لگی۔ یمن کی اندرونی جنگ، روس کو اسلحہ اور دوسرا جنگی سازوسامان فراہم کرنے والے کی حیثیت میں میدان میں لے آئی۔ یہ بات مغربی طاقتوں کی روزافزوں رقابت کا سبب بنی۔ ۱۹۶۷ء میں برطانیہ نے خلیجِ فارس سے نکلنے کے ارادے کا اعلان کر دیا۔ برطانوی فوجوں کے نکلتے ہی چھپے ہوئے اختلافات ظاہر ہو گئے۔

ایران اور سعودی عرب دونوں نے خلیجِ فارس کے علاقے میں اہم کردار ادا کرنے میں دلچسپی ظاہر کی اور دونوں نے اپنی فوجی قوت کی وسعت کے لیے منصوبے بنائے۔

تیل کی قیمتوں میں اضافے کے ساتھ، خلیجِ فارس کے ممالک نے اپنی تیل سے ہونے والی بے پناہ آمدنی کا بڑا حصہ اسلحے اور فوجی سازوسامان کی خریداری کے لیے مخصوص کر دیا۔ مذکورہ ممالک میں سے سب سے بڑھ کر ایران اور عرب مغربی اسلحہ درآمد کرنے لگے اور امریکی اسلحے کی خریداروں میں سرِفہرست قرار پائے۔

گذشتہ سالوں میں سعودی عرب اور خلیجِ فارس کے ممالک نے اپنے جنگی اخراجات پر ۴۰ بلئین ڈالر سالانہ خرچ کیے ہیں۔ (۱)

---

(۱) ––– برانٹ، ویلی: جہانِ مسلّح، جہان گرسنہ، ترجمہ: ہرمز ہمایوں پور، ص ۲۹۱۔

اسلامی انقلاب سے پہلے ایران کا خریدا ہوا اسلحہ

کتاب "تکاپوئ جہانی" میں انتھونی سمپسن، سے منقول ہے کہ شاہ نے ایک ملاقات میں اس سے کہا:

"مجھے امید ہے کہ یورپ اور امریکہ میں ہمارے دوست سمجھ جائیں گے کہ ایران، فرانس، برطانیہ عظمیٰ یا جرمنی میں کوئی فرق نہیں۔ آپ کی نظروں میں وہ تمام رقم جو فرانس اپنی فوجوں پر خرچ کرتا ہے، وہ فطری اور جو میرا ملک اپنی افواج پر خرچ کرتا ہے، وہ غیر فطری کیوں ہے؟

آج خلیجِ فارس میں ہمیں جو قوت حاصل ہے، وہ اس قوت سے بیس گنا زائد ہے جو انگریزوں کو وہاں حاصل تھی۔" (۱)

سمپسن مزید کہتا ہے کہ شاہ کے زمانے میں فوجی بجٹ میں اضافہ چکرا دینے والا تھا: ۱۹۶۴ء میں ۲۴۱ ملئین ڈالر، ۱۹۷۴ء میں ۴ بلئین ڈالر (دس سالوں میں سولہ گنا) اور ۱۹۷۷ میں ۱۰ بلئین ڈالر۔

۱۹۷۸ء میں ایرانی افواج، برطانوی افواج سے دگنی ہیں۔ ایرانی فوج کے پاس تین ہزار ٹینک ہیں (فرانسیسی فوج کے پاس ایک ہزار ٹینک ہیں) اس کی بحری فوج کے پاس دنیا کا عظیم ترین ہوور کرافٹ ہے۔ امریکہ کو چار بحری بیڑوں کا آرڈر دیا گیا ہے، جو ۸۱—۱۹۸۰ء میں ایران کے حوالے کر دیے جائیں گے۔ طے پایا ہے کہ ان سے بحیرۂ ہند میں کام لیا جائے گا۔ (۲)

ایران کی ہوائی فوج، دنیا کی چوتھی بڑی فضائی طاقت ہے، اس میں ۱۴۰۰۰ مختلف طیارے اور ۹۰۰ ہیلی کاپٹر ہیں اور ۱۹۷۶ء تک یہ اکیلی ۱۲ بلئین ڈالر نگل گئی ہے۔

انتھونی سمپسن کا مزید کہنا ہے:

"شاہ کی سردردی کا زیادہ تر مرکز فضائیہ ہے۔ وہ ذاتی طور پر خود جنگی ساز و سامان کا انتخاب کرتا ہے اور زیادہ سے زیادہ ترقی یافتہ ہتھیاروں کا خواہاں ہے۔ طے تھا کہ ۱۹۷۸ء کے اواخر

---

(۱)—شر ائبر، ژان ژاک سروان: تکاپوئ جہانی، ترجمہ: عبد الحسین نیک گہر، ص ۲۲۴۔

(۲)—باشکوہ اسلامی انقلاب کی کامیابی، منحوس شہنشاہی حکومت کے تمام فوجی آرڈرز کی منسوخی کا سبب بن گئی۔

میں ۲۹۰ ببار فینٹم، ۳۳ ہلکے لڑاکا ایف ۵، ۸۰ آواز سے بالاتر ایف ۱۴ ـــــ جو دنیا کا سب سے زیادہ مہنگا ہوائی جہاز ہے ـــــ اور ۶۰ ایف ۱۶ اس کی تحویل میں دیے جائیں گے۔

وہ ایران کی معاشرتی صورتِ حال اور برسرِ اقتدار حکومت کی خرابیوں کے بارے میں یوں رقمطراز ہے: (۱)

"مالی و انسانی وسائل کی تقسیم میں خوفناک حد تک عدم مساوات ہے۔ ایسے غریب ملک میں تاجروں کی ثروت اندوزی اور چند لوگوں کی گستاخانہ شان و شوکت قطعاً قابلِ برداشت نہیں ہے۔ ۸۵ فیصد بڑی کمپنیاں اور انجمنیں، ۴۵ خاندانوں کے کنٹرول میں ہیں۔ فساد و خرابی نے معاشرے کے تمام پُرزے فرسودہ کر دیے ہیں۔ دلّالوں کے کمیشن کے بغیر کوئی معاہدہ بھی تکمیل کو نہیں پہنچتا۔"

۱۹۶۷ء میں امریکی سینیٹر فلبرائیٹ ایران سے واپس واشنگٹن پہنچنے پر اظہارِ رائے کرتے ہوئے یوں مگرمچھ کے آنسو بہاتا ہے:

"میں ایران گیا تو اسے غمزدہ اور غریب ملک دیکھا۔ دولتمندوں کی تعداد بہت کم ہے، لیکن اکثریت انقلاب لا سکتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم انہیں اسلحہ فروخت کر کے، ان کی کوئی بہتر خدمت انجام نہیں دے رہے۔" (۲)

۱۹۷۰ء کی دہائی کے وسط میں ایران، دنیا بھر میں امریکی اسلحے اور سامانِ جنگ کا سب سے بڑا خریدار بن چکا تھا۔ ۷۶ـــ۱۹۷۲ء کے سالوں میں ایران کو فروخت کیے جانے والے امریکی اسلحے کی کل قیمت ۱۴/۴ بلئین ڈالر سے بڑھ چکی تھی۔ (۳) ۷۸ـــ۱۹۷۳ء کے پنجسالہ منصوبے کے مطابق، جس میں ۱۹۷۳ء میں ہونے والی تیل کی آمدنی میں اضافے کے بعد نظرثانی کی گئی تھی، حکومتِ ایران نے اپنی کل نقد آمدنی کا ۳۱ فیصد فوجی اخراجات کے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔ (۴)

---

(۱) ـــ شرائبر، ژان ژاک سروان: تکاپوی جہانی، ترجمۂ عبدالحسین نیک گہر، ص ۲۲۴۔

(۲) ـــ یقیناً امریکی سینیٹر کو اندازہ ہو چکا تھا کہ شاہ کی فاسد امریکی حکومت کے سقوط کے بعد ایک دن یہی اسلحہ خود امریکہ کے خلاف استعمال ہو گا۔

(۳) ـــ ہالیڈی، فریڈ: دیکتاتوری و توسعۂ سرمایہ داری در ایران، ترجمہ فضل اللہ نیک آئین۔

(۴) ـــ ایضاً۔

فصلِ اوّل: چند جملوں میں

o ——— استکبار دو طریقوں سے اپنے مقاصد کی تکمیل کرتا ہے:

الف: وہ تمام فوجی، اقتصادی، سیاسی، ثقافتی اور پروپیگنڈے کے آلات و وسائل سے کام لیتے ہوئے، اپنے لیے فوجی مداخلت کی طاقت محفوظ رکھتا ہے اور کسی ایک میدان اور ایک حصّے تک محدود ہونے سے پرہیز کرتا ہے۔

ب: کم مدت، زیادہ مدت اور درمیانی مدت کے پروگراموں کی منصوبہ بندی اور ترتیب و تنظیم، تاکہ مناسب مدت کے پروگرام کا انتخاب ہو سکے۔

o ——— انیسویں صدی، اہلِ یورپ کی تکنیکی ترقی خصوصاً اسلحہ سازی اور جنگی سازوسامان کے میدان میں ان کے تجاوزات اور فتوحات کے پھیلاؤ کی شاہد ہے۔

o ——— پرتگالی فوجوں نے خلیج گوادر پر حملہ کر کے اور پھر تنگنائے ہرمز پر قبضہ کر کے ایران پر مغربی استعمار کا سنگِ بنیاد رکھا۔ ان کے بعد برطانیہ اور ہالینڈ کے باشندوں نے خلیجِ فارس کے علاقے میں تجارت اور اس کے ساتھ ہی سیاسی و ثقافتی اثرورسوخ بڑھانا شروع کر دیا۔

o ——— یورپ میں صنعتی انقلاب کے ظہور پذیر ہوتے ہی خام مال کی مانگ میں غیر معمولی اضافہ ہوا، جس کا نتیجہ کمزور قوموں کے ارضی ذخائر کے وحشیانہ استحصال اور طرح طرح کے خطّوں پر غلبہ و تسلّط کے سلسلے میں استعمار کی کبھی نہ ختم ہونے والی بھوک کی صورت میں نکلا۔

o ——— استعمار، مظلوم اقوام کی لوٹ مار کی توجیہ کے لیے پست نسلوں اور برتر نسلوں کا غیر منطقی دعویٰ کرتا تھا اور محروم اقوام کی غربت، بیماری اور بے سروسامانی کو ان کی ذاتی جہالت، تن پروری اور پس ماندگی کا نتیجہ سمجھتا تھا۔

o ——— عالمی استکبار نے ہمیشہ بحران، کشیدگی اور اختلاف کی موجودگی کو اپنا وجود برقرار

رکھنے کے لیے ضروری اور ممالک کے داخلی معاملات میں ظالمانہ دخل اندازیوں کا بہانہ قرار دے رکھا ہے۔

O ——— حصولِ اسلحہ کے تین مقاصد ہوتے ہیں:

الف: ان داخلی و خارجی تنازعات کو نبٹانے کے لیے فوجی ضروریات کی تکمیل جو مسلح افواج کے استعمال کے متقاضی ہوتے ہیں۔

ب: ایک قوم کے مختلف گروہوں میں وحدت کے قیام اور قومی تشخص کے حصول کے لیے۔

پ: حکومت کے لیے ایک طاقتور اور قابلِ اطمینان سہارے کے طور پر افواج کی قوت میں اضافہ۔

O ——— برِصغیر (پاک و) ہند میں بھی ——— دنیا کے دوسرے علاقوں کی طرح ——— اسلحے کا بڑھتا ہوا تقاضا ان کشمکشوں اور بدامنیوں کے بُرے اثرات کا نتیجہ ہے جو دورِ استعمار نے یادگار چھوڑی ہیں اور (اب استعمار) اسی طرح انہیں متحرک رکھنے کی کوشش اور ضد کر رہا ہے۔

فصلِ دوّم

سیاسی چالیں

تیسری دُنیااس خیال میں حق بجانب ہے کہ وہ مغرب کی طرح ایک بلند تر سطحِ زندگی سے لطف اندوز ہو سکتی ہے، اور اسے ہونا چاہیے کیونکہ دنیا کے بنیادی اور قیمتی حیاتی مواد کے ذخائر اس کے تصرف میں ہیں، لیکن اب ــــ جبکہ مغرب مکر و فریب اور ظاہر سازی کا سہارا لے کر اس کوشش میں ہے کہ غیر ترقی یافتہ ممالک کے لوگوں کا اعتماد دوبارہ حاصل کرلے ــــ تیسری دنیا زیادہ وحشت ناک اور زیادہ مصیبت زدہ مستقبل کی تشویش میں مبتلا ہے اور وہ روز بہ روز تاریک تر غربت میں ڈوبتی چلی جارہی ہے اور اس کی بنیادی وجہ ان دو حقیقی عوامل میں پائی جاسکتی ہے۔

الف ــــ مغرب کے صنعتی ممالک کی طرف سے استحصالی روش میں شدت۔

ب ــــ فاسد اور وابستہ حکومتیں۔

پہلے عامل کے ضمن میں، امریکہ کے سابق صدر جانسن نے اپنی کتاب ''ریاستہائے متحدہ کا مستقبل'' میں جو کچھ لکھا ہے اس سے زیادہ واضح اور کوئی شاھد ہمیں نہیں مل سکتا۔ وہ اس کتاب میں لکھتا ہے

''گذشتہ ساڑھے تین سال میں ہمیں ایسی وسیع ترین اور طویل ترین اقتصادی وسعت و ترقی نصیب ہوئی ہے جس کی مثال نہیں ملتی، ۱۹۶۱ء کے آغاز سے ۱۹۶۴ء تک ہم نے اپنی تاریخ کا ایسا پر شکوہ دور گذارا ہے جسکی مثال نہیں ملتی یہ شان و شوکت محض تاجروں تک ہی مخصوص نہیں بلکہ اس میں تمام عوام شامل ہیں۔ ۷ء۲ ملین سے زیادہ امریکی برسرِ روزگار ہیں اور یہ بجائے خود ایک ریکارڈ ہے۔ ہماری ناخالص قومی آمدنی ۷ء۱۱ بلین ڈالر سے ۶۱۸ بلین ڈالر

تک پہنچ گئی ہے اور ہماری صنعتی پیداوار میں ۲۸/۵ فیصد اضافہ ہوا ہے"۔(۱)

ساڑھے تین سال کے عرصے میں امریکہ کی ناخالص قومی آمدنی میں پانچ گنا سے زیادہ یہ بے مثال اضافہ بڑی حد تک غیر ترقی یافتہ ممالک میں استحصالی روش میں شدت آجانے کا حقیقی ثبوت ہے۔ اس طرح کی بلند و بالا سطح زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے امریکی اقتصادیات کو ابھی تک اس ضمن میں وسیع تر پیشرفت کی ضرورت ہے کیونکہ ایک طرف تو اس کی آبادی انتہائی تیزی سے بڑھ رہی ہے اور دوسری طرف ٹیکنالوجی کی ترقی اور مشینوں کی بڑھتی ہوئی خودکاری کے نتیجے میں ہاتھ سے کام کرنے کے مواقع اچھے خاصے کم ہوتے جارہے ہیں۔

استعماری شیطانوں کے ہاں اس مسئلے کا حل بھی سادہ اور آسان ہے تیسری دنیا کی اقتصادی ترقی روک کر اپنی شرح پیداوار اور قومی آمدنی میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کیا جائے۔

لیکن دوسرا عامل: یعنی فاسد اور وابستہ حکومتیں، بجائے خود اس مکر و فریب کا نتیجہ ہیں جس سے استعمار، تیسری دنیا کی اقتصادی ترقی کو روکنے کا کام لیتا ہے۔ تیسری دُنیا کے ممالک کی اقتصادی قوت کم ہو جاتی ہے۔ ان کے حوصلے جواب دے جاتے ہیں تو ان پر طرح طرح کے قرضوں کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں۔ بینکوں یا قرضہ دینے والی حکومتوں کے منافع سے بچنے کا راستہ، (مقروض) حکومتوں میں اثر و رسوخ بلکہ ان کی قومی حکومت تک میں شرکت ہے اور اس مرحلے کے طے ہوتے ہی حقیقت میں صرف وہی حکومت برسرِ اقتدار رہ سکتی ہے جو بیرونی اقتصادی طاقتوں کی بے چون وچرا مطیع ہو جائے، اور اس صورتِ حال کے دوام کا نتیجہ حکومتوں اور حاکموں کی ایسی گمراہی و وابستگی کی صورت میں نکلتا ہے، جو ہم آج بھی بہت سے ممالک میں دیکھ رہے ہیں۔ ان مسائل کے ساتھ ساتھ، عالمی آمدنی کی تقسیم میں پائی جانے والی حیران کُن عدمِ مساوات نے تیسری دنیا کی مایوسی و وحشت میں اضافہ کر رکھا ہے۔ اس وقت دنیا کی کل آمدنی کا ۸۰ فیصد حصّہ، دنیا کے ۱۰ فیصد لوگوں کے قبضے میں ہے جبکہ باقی ۲۰ فیصد دولت، باقی ۹۰ فیصد لوگوں کے لیے مخصوص ہے یہ تمام نابرابریاں ایک بنیادی تضاد پر مبنی ہیں اور وہ ہے: دنیا کو صنعتی علاقوں اور خام مال پیدا کرنے والے علاقوں میں زبردستی تقسیم کرنے کی تھیوری۔

(۱) جانسن، لینڈون ریاستہائے متحدہ کا مستقبل، ص ۱۲۴ (نقل از کتاب میراث خوار استعمار ص۔ ۴۰)

صنعتی ممالک ایک خوشحال اور بلند سطحِ زندگی سے لطف اندوز ہو رہے ہیں جبکہ تیسری دنیا کے ممالک کا گروہ خام مال یا نامکمل مواد کی پیداوار کا اسیر ہے۔ یہ ممالک اپنی معدنی اور زرعی پیداوار کے علاوہ اپنی قوتِ کار بھی بہت کم نرخوں پر عالمی منڈی میں پیش کر دیتے ہیں۔ یوں استکبار اپنے زیرِ تسلّط اور استحصال شدہ علاقوں میں اپنی پوزیشن مضبوط رکھنے کے لیے، تمام ممکنہ ہتھکنڈے آزماتے ہوئے اپنی برتر سیاسی پوزیشن مستحکم کرتا ہے۔ عام طور پر اس کے ہتھکنڈے یہ ہوتے ہیں:

۱ — پٹھو ذرائع ابلاغ کے ذریعے رائے عامہ پر تسلّط

افراد کا عمل اور ان کا موقف نیز مسائل کے ضمن میں ان کا اظہارِ میلان یا نفرت، بڑی حد تک ان کی اپنی اطلاعات اور ان کے نقطۂ نظر سے تعلق رکھتا ہے۔ اگر کسی شخص کو کچھ عرصے کے لیے کسی محفوظ مقام پر رکھا جائے اور بیرونی دنیا سے اس کے تمام روابط منقطع کر کے، اسے محض ایک مخصوص اور معیّن ذریعے سے اطلاعات بہم پہنچائی جاتی رہیں تو کچھ عرصے کے بعد یقیناً وہ پہلے جیسا نہیں ہو گا۔ وہ ایک ایسا شخص ہو گا جو انہی نقطہ ہائے نظر اور اقدار پر مشتمل ایک سلسلۂ فکر رکھتا ہو گا جو اس عرصے میں فکری اعتبار سے اُسے بطور غذا ملتے رہے ہیں۔ اس حقیقت کو تسلیم کر لینے سے (البتہ سو میں کوئی ایک آدھ استثنائی صورت بھی ہو سکتی ہے) اخبارات و رسائل و جرائد، ریڈیو ٹیلیویژن، سینما، خبر رساں ایجنسیوں اور مجموعی طور پر ذرائع ابلاغ کی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ عالمی سطح پر بھی رائے عامہ کو اسی طرح پروپیگنڈے اور فکری بمباری کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ سینما کی فلموں، اخبارات و جرائد، ٹیلیویژن، ریڈیو اور پروپیگنڈے کے دوسرے وسائل کے ذریعے اس عمل کا مسلسل اعادہ ہوتا رہتا ہے۔

مزید آگاہی کے لیے ہم موجودہ معاشروں میں ذرائع ابلاغ کے کردار کے سلسلے میں ایک عمومی جائزہ لیتے ہیں۔

مطبوعات، فلموں، ریڈیو کے مطالب اور خبروں اور ٹیلی وژن کے پروگراموں کے علاوہ

بڑی بین الاقوامی خبر رساں ایجنسیاں وہ دوسرے ذرائع ہیں جو معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی زندگی میں بنیادی کردار کی حامل ہیں، ہم ان کا الگ الگ عنوانات کے تحت مختصراً ذکر کرتے ہیں۔

الف— بین الاقوامی خبر رساں ایجنسیاں

آج کی دنیا میں اخبارات و رسائل و جرائد خصوصاً اخباری روزناموں کی مقبولیت و کامیابی کا راز، رائے عامہ کی آگاہی کے لیے خبروں کے حصول اور ان کی بر وقت اور بہ عجلت اشاعت میں مضمر ہے۔ اگر ہم عجلت کو اخبارات کی کامیابی کی واحد وجہ نہ بھی سمجھیں تو بھی اسے اہم ترین وجوہات میں سے ایک وجہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

یہ بات ذہن نشین رہے کہ خبروں کے حصول کے لیے ایک منظم ادارے کے قیام پر بھاری اخراجات اُٹھتے ھیں اور تجربہ کار افراد کو ملازم رکھنا پڑتا ہے۔ ایسے ادارے جنھیں مختلف شعبوں میں تازہ ترین رپورٹوں سے آگاہی کی ضرورت ہوتی ہے۔ جرائد بھی ان مصارف اور دوسری متعلقہ مشکلات سے بچنے کے لیے اپنی زیادہ تر خبریں خبر رساں ایجنسیوں سے حاصل کر لیتے ہیں۔ ہر روزنامے کے لیے آزادنہ طور پر خبریں اکٹھی کرنے پر جو غیر معمولی اخراجات ہوتے ہیں، ان کے پیشِ نظر، مختلف اخبارات و رسائل، خبر رساں ایجنسیوں کے ذریعے ہی اپنے خبروں کے کالم تیار کر لیتی ہیں۔ ان حالات میں خبر رساں ایجنسیوں کا وجود عالمی مطبوعات کے تسلسلِ کار کے مؤثر عوامل میں شمار ہوتا ہے اور تمام ملکوں میں تمام اہم اور غیر اہم جرائد کے لیے خبر رساں ایجنسیوں کی خبروں سے استفادہ ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اب دنیا میں کچھ ایسی اہم خبر رساں ایجنسیاں بھی موجود ہیں جنہوں نے فی الواقع ایک طرح کی خبری اجارہ داری قائم کر رکھی ہے۔ یہ عظیم ادارے جو ہزاروں رسائل و جرائد، آزاد یا اپنے وابستہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے سینکڑوں چینلز اور مختلف اداروں کو خبروں کی خوراک فراہم کرتے ہیں، مندرجہ ذیل ہیں:

ایسوسی ایٹڈ پریس (۱) اور یونائیٹڈ پریس (۲) (امریکی)، ریوئیٹر (۳) (برطانوی)، ایجنسی فرانس پریس (۴) (فرانسیسی) اور جرمن خبر رساں ایجنسی (۵) (جرمنی)

جیساکہ آپ نے ملاحظہ کیا خبریں لینے اور دینے والے یہ ادارے بھی مغربی ممالک سے متعلق ہیں، اس ضمن میں مشرقی استکبار بھی ایسے نظام کا حامل ہے جو اگرچہ مغربی اداروں جتنا کار آمد اور فعال تو نہیں، لیکن مشرقی بلاک اور اس کے ساتھیوں کا قابلِ اعتماد مأخذ گردانا جاتا ہے۔ تاس خبر رساں ایجنسی (۶) اور ٹانیوگ خبر رساں ایجنسی (۷) (یوگوسلاویہ) ان اداروں میں سب سے زیادہ مشہور ہیں۔

ب — ریڈیو اور ٹیلی ویژن

خبر رساں ایجنسیوں کے ساتھ ساتھ، ریڈیو اور ٹیلیویژن سٹیشن بھی خبریں نشر کرنے، نظریات کی تبلیغ اور رائے عامہ پر اثر انداز ہونے میں بنیادی کردار کے حامل ہیں اور معاشروں، خصوصاً شہری معاشروں میں ہر شخص کی زندگی کے زیادہ اوقات کو اپنے لیے مخصوص رکھتے ہیں۔

ادارے کے انتظامی طریقۂ کار، سرپرستی کی کیفیت اور حکومت اور بھیجنے والے اداروں کے روابط کے مطالعے سے کسی حد تک ہر حکومت کے معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی نظام سے آگاہی ہو سکتی ہے۔

اگرچہ یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ریڈیو اور ٹیلیویژن کے ادارے خصوصاً مغربی ممالک میں آزاد اور طرح طرح کے پروگراموں کی ترتیب و نشر میں خود مختار ہیں، لیکن معمولی سی توجہ سے حکومتوں یا برسرِ اقتدار پارٹیوں کے متعلقہ عوامل کے اثرات کا اندازہ ہو سکتا ہے جو دباؤ

---

(۱) AssociatedPress(A.P)

(۲) UnitedPressInternational(U.P.I)

(۳) Reuiter(R.T)

(۴) FrancePressAgency(A.F.P)

(۵) DutchPressAgency(D.P.A)

(۶) Tass

(۷) Taniug

ڈالنے والے گروہوں کا کام زیادہ سوچے سمجھے لیکن نازک اور غیر محسوس انداز میں کرتے ہیں۔ مکمل طور پر کھل کر کہنا چاہیے کہ تمام مذکورہ اداروں کو حکومتوں کی طرف سے پالیسی لائن ملتی ہے اور وہ کافی دقّتِ نظر اور پروگراموں کو بتائے گئے اصولوں سے مطابقت دینے کے بعد انہیں نشر کرتے ہیں۔

ج۔۔ سینما اور تھیئیٹر

بیسویں صدی کے انسان زندگی میں سینما اور تھیئیٹر جیسے نمائشی فنون اور فن وادبیات کے دوسرے شعبے بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ وسائل بچپن اور سکول کی تعلیم کے مرحلے سے لے کر نوجوانی اور جوانی، ہائی سکول اور یونیورسٹی اور اسی طرح معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی زندگی کے مراحل تک، انسان کے فارغ اوقات کے بیشتر حصّے کو اپنے لیے مخصوص کیے رہتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی اس پر بے پناہ اثرات مرتب کرتے ہیں۔ معاشرتی و سیاسی مسائل کے تجزیے میں ان اہم عوامل کی اہمیت کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے

د۔۔ مطبوعات

مطبوعات اور خصوصاً جرائد اور روزناموں کا شعبہ اہم ثقافتی مظاہر میں سے ہے۔ اخبارات اور رسائل و جرائد بنیادی طور پر ہر معاشرے کی ثقافت کو دوسری جگہ منتقل کرنے اور اس کے ارتقاء میں اہم کردار ادا کرتے ہیں اور تحریری و تصویری ثقافت کی صورت میں ایک خاص مشن انجام دیتے ہیں۔

آجکل کے معاشروں میں مطبوعات کا کام خبریں نشر کرنا اور عقائد کی تبلیغ کرنا ہے۔

روز کے چھپنے والے اخبار زیادہ تر خبروں پر مشتمل ہوتے ہیں، لیکن خبروں کی نشر واشاعت کے لیے مذکورہ جرائد کے علاوہ دوسرے ذرائع بھی موجود ہیں اور نظریات و افکار کی ترویج کے لیے خاص طور پر فلسفیانہ، اقتصادی، سیاسی، تاریخی اور فنی و علمی مجلات

اہمیت کے حامل ہیں۔

ذرائع عامہ میں مطبوعات کی اہمیت بیان کرتے ہوئے مشہور امریکی مفسر والٹر لیپ مین کہتا ہے:

"ہمارے نظریات ان تصورات کا نتیجہ ہوتے ہیں جنہیں اشیاء اور مسائل ہمارے ذہن میں پیدا کرتے ہیں اور یومیہ مطبوعات، اس تشکیل کے بڑے حصّے میں شریک ہیں"۔ (۱)

دنیائے استکبار میں ــــ خواہ مغرب ہو یا مشرق ــــ ذرائع ابلاغ، پروپیگنڈے اور عوام کی فکر کو حکومت کی خواہشات کے مطابق ڈھالنے کا ذریعہ ہیں۔ مغرب میں ذرائع ابلاغ، عام طور پر بین الاقوامی صہیونیت سے وابستہ یا اس کے کنٹرول میں ہیں اور مشرق میں انکا کام کمیونزم کے اصولوں کی اشاعت، دفاع اور تبلیغ کرنا ہے۔ اصولی طور پر ذرائع ابلاغ، استعماری نظریات و مقاصد کو جامۂ عمل پہنانے کے اہم عوامل میں سے سمجھے جاتے ہیں، جن سے اپنی جغرافیائی اور سیاسی سرحدوں کے اندر اور باہر، اپنی کارستانیوں کی توجیہ کے لیے کام لیا جاتا ہے۔

مغربی دنیا میں ریڈیو، ٹیلیویژن، مطبوعات، سینما اور خبر رساں ایجنسیوں کے وسیع ادارے مکمل طور پر بین الاقوامی صہیونزم سے وابستہ عظیم خبری کارٹلز کے غلبہ و تسلّط میں ہیں، انفرادی اور اجتماعی طور پر بین الاقوامی امپیریلزم کے عزائم کی خدمت کر رہے ہیں اور انہوں نے پوری دنیا کو اپنے پروپیگنڈے کی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ بی بی سی اور وائس آف امریکہ جیسی افواہیں پھیلانے والی عظیم سروسیں، جدید ترین ٹیکنالوجی سے آراستہ نیوز سروس اور سماجیات اور نفسیات کے مختلف شعبوں میں ماہر اور تجربہ کار لوگوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاتی ہیں۔ افواہیں پھیلانے والے یہ عظیم ادارے ہر علاقے اور ملک کے لیے وہاں کی مروجہ زبان میں خصوصی پروگرام تیار کرکے، خبروں میں تحریف اور حقائق و واقعات کو تبدیل کرکے، دنیا کے عوام کو دھوکہ دینے اور انہیں غافل رکھنے کے لیے اپنے استعماری مقاصد کو پورا کرنے کی خاطر سرگرمِ عمل رہتے ہیں۔

---

(۱) ڈاکٹر علوی، رضا: اصولِ علومِ سیاسی، ص ۳۱۰ــ

آزادی، صلح، عدل و انصاف اور امن و امان وغیرہ جیسے الفاظ محض ایسے سہارے ہیں جن سے ان کے منحوس استعماری مقاصد کو اہم مقام دلانے کا کام لیا جاتا ہے۔

مغرب و مشرق کے استکبار سے وابستہ ان پروپیگنڈا کرنے والے ذرائع ابلاغ نے دنیائے سرمایہ داری کو "دنیائے آزاد" کا نام دے رکھا ہے اور مشرقی استکبار نے بھی اس خیال سے کہ پروپیگنڈے کے قافلۂ الفاظ سے پیچھے نہ رہ جائے، "دنیائے آزادی بخش" کا نام منتخب کیا ہے۔ جبکہ ان کے معاشرتی ڈھانچے پر ایک عمیق تحقیق سے ان مفاہیم و اقدار کا مسخ واضح اور ظاہر ہے۔

۲— تفرقہ پردازی اور اتحاد اور قومی وحدت کا خاتمہ

کسی معاشرے کی مختلف قوموں اور گروہوں میں تفرقہ، نفاق اور دشمنی پیدا کرنا اور مذہبی، قومی اور نسلی اختلاف کو ہوا دینا، تیسری دنیا کے ممالک پر تسلّط حاصل کرنے کے لیے عالمی استکبار کے طریقۂ واردات کے اہم ترین اصولوں میں سے ہے۔

قرآن مجید میں بھی لوگوں کو کمزور کرنے کے لیے ان میں انتشار پھیلا کر اور انہیں مختلف گروہوں میں تقسیم کر کے، بالآخر ان پر تسلّط جما لینے کو استکباری اور فرعونی نظاموں کی ایک سیاسی چال کہا گیا ہے:

"وَجَعَلَ اَهلَهَا شِيَعاً يستضعف طائفةً منهم" (۱)

"لوگوں کو (مختلف) گروہوں میں بانٹ کر، ان میں سے ایک گروہ کو کمزور کرتا تھا"۔

علامہ طباطبائی رحمتہ اللہ علیہ اس قرآنی عبارت کی تشریح و تفسیر میں لکھتے ہیں:

"لفظ "شیع"، "شیعہ" کی جمع ہے، جس کے معنی فرقے کے ہیں۔ مجمع البیان میں ہے کہ لفظِ "شیع" فرقوں کے معنوں میں ہے اور ہر فرقہ ایک شیعہ ہے اور اگر شیعہ کو فرقہ کہا گیا ہے تو اس لیے کہ بعض، دوسرں کی پیروی کرتے ہیں۔ یہ تھی صاحبِ مجمع (البیان) کی بات، تو گویا اس فرمان سے کہ: "فرعون نے اہلِ زمین کو شیعہ شیعہ کر دیا" یہ مراد ہوگی —— گویا

---

(۱) سورۂ قصص، آیہ ۳—

اہلِ زمین سے اہلِ مصر مراد ہیں اور ''الارض ''میں ''لام ''''لامِ عہد '' ہے ـــ کہ ان میں اختلاف ڈال کر اور تفرقہ اندازی کر کے انہیں گروہ گروہ بنا دیا، تاکہ انکا کلمہ (ارادہ) متحد نہ ہو، ان میں یک دلی اور یک جہتی پیدا نہ ہو، تاکہ وہ اس پر چڑھ نہ دوڑیں اور اس کے خلاف بغاوت کر کے اس کے لیے معاملات درہم برہم نہ کر دیں۔ جیسا کہ تمام بادشاہوں کی عادت ہے کہ جب چاہتے ہیں کہ اپنی قوّت کو وسعت دے کر اپنی سلطنت کو مستحکم کریں تو اس سازش پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ (۱)

یہ منحوس استعماری چال جو بعض اوقات ممالک میں تباہ کن داخلی جنگوں پر بھی منتج ہوئی ہے، تمام غلبہ پرست طاقتیں بغیر کسی استثناء کے اپنے زیرِ تسلّط ممالک میں یہ چال چلتی ہیں اور مذکورہ طاقتوں کی سیاسی آئیڈیالوجی سے اس کا کوئی ربط بھی نہیں ہے۔

اگر ہم حملۂ مغول اور خلفائے عباسی کے زوال کے بعد کی تاریخ کا مطالعہ کریں اور شیعہ و سنی کے دو عظیم اور مسلمان گروہوں کو جدا جدا کرنے کیلئے پلید طاقتوں کی سازشوں اور عالمی سیاست بازیوں کو تحقیق اور تجزیہ و تحلیل کا موضوع بنائیں تو ہمیں بخوبی اندازہ ہو جائیگا کہ استعمار، مسلمانوں کے اتحاد و یگانگت سے کس حد تک خوف زدہ ہے اور اس نے اس وحدت کے خاتمے کے لیے کتنی بڑی سرمایہ کاری کر رکھی ہے!

ایران میں صفوی خاندان کے دور سے عثمانی سلطنت کے خلاف جو لڑائیاں اور جنگ آزمائیاں ہوئیں وہ مغلوں کے حملے کے بعد اسلامی ممالک میں مذہبی جنگوں کی آگ بھڑکانے کے سلسلے میں استعماریوں کے کردار کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ یہ منحوس جنگیں جو واضح طور پر اسلامی ممالک کی وحدت کے خاتمے کے لیے روسی اور برطانوی استعمار کی مشترکہ کوششوں کی پیداوار تھیں، بعد کے ادوار (افشاری اور زندی دور) میں بھی جاری رہیں اور قاجاری دور میں تو یہ اور وسیع پہلوؤں اور نئی نئی شکلوں میں جلوہ گر ہوئیں۔ نااہل قاجاری بادشاہوں کے ۱۳۵ سالہ دورِ حکومت میں، مذہبی کشمکشیں جو روس اور برطانیہ کی استکباری طاقتوں کی خارجی سیاست کا نتیجہ تھیں، جنکا مقصد اسلامی مملکت ایران کی حدود میں ان کے سیاسی و فوجی عمل، دخل کا استحکام تھا، وسیع پیمانے پر ملکی سرحدوں کے اندر سر اٹھانے لگیں۔

---

(۱) علامہ طباطبائی، سید محمد حسین 'ترجمہ تفسیر المیزان، جلد ۳۱، ص ۱۳۔

بابیت، بہائیت، قادیانیت اور وہابیت وغیرہ جیسے رنگارنگ فرقے جو اصطلاحی معنوں میں مذہبی تھے لیکن حقیقت میں مذہب کے رنگ میں محض سیاسی تھے، مسلمان عوام کے ذہنوں کو شریعت اسلامی سے منحرف کرنے کے لیے، سلطنتِ برطانیہ کی نوآبادیوں کی وزارت کے اربابِ اختیار کی ذہنی پیداوار کے سوا اُنکی کچھ حیثیت نہیں تھی۔ یہ تمام کوششیں مسلمانوں کی وحدت و یگانگت کے خاتمے کے لیے کی جارہی تھیں۔ کیونکہ مشرق و مغرب کی استکباری طاقتوں کو بخوبی علم تھا کہ دنیا کی اقوام میں مسلمان عظیم ترین اہمیت کے حامل ہیں، اور اگر ایسی عظیم قوت اندرونی طور پر تفرقہ و انتشار کا شکار نہیں ہو گی تو جلد یا بدیر ان کی توسیع طلب اور تجاوز پسند استعماری زندگی کا خاتمہ کردے گی اور ان ظالمانہ روابط کی بنیاد پاش پاش ہو کر رہ جائے گی جو دنیا کے اکثر ممالک میں حاکم و محکوم کے نظام کی صورت میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس لیے انہوں نے اسلامی ممالک میں نہ صرف اندورنی طور پر نفاق، انتشار، اور قومی، مذہبی اور قبائلی اختلافات کے بیج بوئے بلکہ عالمی سطح پر ہر اس حکومت کے ساتھ جنگ اور دشمنی مول لی جس میں اسلام اور مسلمانی کی کوئی نشانی تھی۔ موجودہ صدی کے نصف اوّل میں روس، برطانیہ اور فرانس کے اتحاد کا فلسفہ اور عثمانی سلطنت کے خلاف ان کی مُسلّح افواج کی کاروائی کی جڑیں بھی وسیع پیمانے پر اسی حقیقت میں ہیں۔ آجکل تفرقہ اندازی کا مسئلہ، ہر معاشرے کے لوگوں کا استحصال جاری رکھنے کے لیے استکبار کا ایک ہتھیار ہے۔ اس امر کی اہمیت اتنی ہے کہ خداوندِ متعال قرآن کریم میں مسلمانوں کو خبر دار کرتا ہے کہ تفرقے سے بچیں اور فرماتا ہے:

”وَ اَعتَصِمُوا بِحَبلِ اللہِ جَمِیعاً وَّ لَا تَفَرَّقُوا“ (۱)

”تم سب ـــــ سب مسلمان ـــــ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہو اور تفرقے میں مت پڑو۔“ اس لیے کہ استکبار کے وجود اور اس کے تسلّط کی بنیادی وجہ، زیرِ تسلّط ممالک میں قوتوں کا افتراق اور ان کے مابین کشمکش کا پیدا ہونا ہے۔ تاکہ یوں زندہ قوموں کا اصلی مسئلہ، جو اصل میں استکبار سے مقابلہ ہے۔ سپرد طاقِ نسیاں ہو جائے۔

---

(۱) سورۂ آلِ عمران، آیہ ۱۰۳۔

اسی لیے حضرت امام خمینی (قدس سرہ) نے ۱۳۴۱ھ۔ ش/۱۹۶۲ء میں اسلامی انقلاب کے آغاز سے لے کر اب تک (اپنی حیاتِ مبارکہ کے آخری سانس تک) بارہا تاکید کی ہے کہ: اپنی وحدت کی حفاظت کرو۔ ایک بار آپؒ نے فرمایا:

"مجھے کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ تفرقہ شیطان سے ہے اور وحدت رحمٰن سے۔"

اسی طرح آپؒ نے ایک تقریر میں، جو ۱۸، شہریور ۱۳۴۳ھ۔ ش/۱۹۶۴ء کو قم کی مسجدِ اعظم میں ہوئی تھی، عثمانی سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے لیے کی جانے والی عالمی استکبار کی مشترکہ سازشوں کا ذکر کرنے کے بعد ان اختلافات کا ذکر کیا جنہیں استکباری قوّتیں اسلامی ممالک میں، مسلمانوں کو ایک دوسرے سے جُدا کرنے اور ان کی وحدت کے خاتمے کے لیے ہوا دیتی ہیں، آپؒ نے فرمایا:

"اسلامی حکومتوں کے سربراہوں کو اس بات پر توجّہ دینی چاہیے کہ یہ اختلافات ایسے ہیں جو ان کے وجود کو تباہ و برباد کر دینے والے ہیں۔ انہیں عقل و تدبّر کے ساتھ اس امر پر توجہ دینی چاہئے کہ وہ مذہب اور اسلام کے نام پر اسلام کو ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ ان ممالک، میں شیعہ اور سُنّی کے مابین کچھ ناپاک ہاتھ اختلاف پیدا کر رہے ہیں، یہ نہ شیعہ ہیں اور نہ ہی سنی۔ یہ استعمار کے آلۂ کار ہیں جو ان کے ہاتھوں سے اسلامی ممالک ھتھیا لینا چاھتے ہیں، ان کے ذخائر پر قبضہ کر لینا چاہتے ہیں۔۔۔۔۔" (۱)

امامِ اُمتؒ نے اپنے ایک بیان میں اس نکتے پر زور دیتے ہوئے کہ تفرقہ و اختلاف کی بنیاد ہوائے نفس پر ہے، فرمایا:

"اگر ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبرؑ ایک جگہ جمع ہو جائیں تو کیا ان میں کوئی اختلاف رونما ہو گا؟ نہیں، اسلیے کہ وہ اپنی ہوائے نفس پر فاتح اور غالب ہیں اور ان کے لیے زبان، نسل، اور قبیلے کے مسئلے کی کوئی اہمیت نہیں اور وہ سب خدا کے بندے ہیں۔

اسی طرح وحدت کی اہمیت کے بارے میں ۱۳۵۹/۱۰/۶ھ۔ش/۱۹۸۰ء کو اسلامی انجمنوں کے اراکین سے خطاب کرتے ہوئے اپنے ایک بیان میں آپ نے ارشاد فرمایا:

"جو کچھ مجھے آپ دوستوں اور عزیزوں کی خدمت میں عرض کرنا چاہیے وہ یہ ہے کہ بڑی

---

(۱)— صحیفہ نور، جلد ۱ — ص، ۸۸

طاقتوں کو اس امر کا اندازہ ہے کہ یہ قوم وحدت و اتفاق اور اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف توجہ کے سائے میں کامیاب ہوئی اور ان کے مفادات کو خطرے میں ڈال دیا۔ وہ (بڑی طاقتیں) چین سے نہیں بیٹھیں گی اور اختلاف اور قومی وحدت کے خاتمے کے لیے ہر روز نئی چال چلیں گی۔ اور ہمیں چاہیے کہ اپنی آنکھیں اور کان کھولیں اور خبردار رہیں کہ کہیں اختلافات کو ہوا نہ دیں۔ ہماری قوم کا ہر وہ طبقہ جسے اندازہ ہے کہ اختلاف اس ملک کو نقصان پہنچائے گا اور ہر وہ گروہ جسے اسلام سے دلچسپی ہے، اسلامی ملک سے دلچسپی ہے، مسلمان قوم سے دلچسپی ہے، ایرانی قوم سے دلچسپی ہے، اسے کوشش کرنی چاہیے کہ اس وحدت و اتفاق میں کوئی خلل نہ آئے، اگر خدانخواستہ ہمارے دشمن ہماری قوم کے مابین ہر گوشے میں اختلاف ڈالنے میں کامیاب ہو گئے تو گویا ان کی آرزوئیں بر آئیں گی۔" (۱)

آج عالمی استکبار ہر چیز سے زیادہ اسلامی معاشرے کی انقلابی وحدت سے پریشان اور بے چین ہے۔ کیونکہ اسے علم ہے کہ اسلامی وحدت کی بنیادی وجہ اسلام پر ایمان و عمل ہے یہی امر اس کی تشویش و اضطراب کا باعث ہے، اپنے استعماری غلبے کے سالوں میں، مشرقِ وسطیٰ کے ممالک خصوصاً ایران میں انہیں جن نقصانات کا سامنا کرنا پڑا اسکی اصل وجہ بھی بالکل یہی نقطہ تھا، اسی لیے وہ اپنی پرانی اور مجرّب چال --- "تفرقہ ڈالو اور حکومت کرو" --- سے کام لے کر دوبارہ اپنے ہاتھ سے نکل جانے والے مفادات کے حصول کی کوشش میں ہیں۔

گذشتہ حکومت میں بھی اس امر --- یعنی معاشرے کے طبقات میں اختلاف --- سے زیادہ فائدہ اٹھایا گیا۔ علمائے کرام اور یونیورسٹیوں کے طبقے میں پیدا کیا جانے والا اختلاف اسی کا حصہ ہے۔ ایک گروہ دوسرے پر علم سے آگاہ نہ ہونے کی الزام تراشی کرتا تھا اور دوسرا گروہ فریقِ مخالف کو مذہب سے ناواقف سمجھتا تھا۔ کلاسیکی تعلیم میں عملی طور پر علومِ اسلامی کی تعلیم ختم کر دی گئی اور علم و مذہب میں تضاد کی تھیوری پیش کر کے علماء اور یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ لوگوں میں اختلاف کو ہوا دی گئی۔ چونکہ وہ ایسا مسئلہ اپنے مدارس میں پیش کر سکنے کی قدرت نہیں رکھتے تھے اس لیے انہوں نے یونیورسٹی میں اس موضوع کی حسبِ منشا تبلیغ کی، اس کے ساتھ ہی سیاست سے دین کی

(۱) --- صحیفہ نور، جلد ۱۳ --- ص، ۲۳۲

جدائی کا معاملہ بھی چھیڑا گیا جس کی کیفیت کسی اور حصّے میں موضوعِ تحقیق بنے گی۔

حضرت امام خمینی (رحمتہ اللہ علیہ) نے شہنشاہی کی اس سازش سے آگاہی کے ساتھ ۱۳۵۴ھ۔ش/۱۹۷۷ء میں علماء اور یونیورسٹی کے مابین وحدت کا مسئلہ پیش کیا، جس کے خاصے اثرات ہوئے اور اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد اس کی اہمیت کے پیشِ نظر ہر سال ۲۷ آذر کو، جو استادِ بزرگوار آیت اللہ ڈاکٹر مفتح کی شہادت کا دن ہے، "دینی مدرسہ اور یونیورسٹی کے مابین یومِ وحدت" قرار دے دیا گیا۔

بنیادی طور پر ایران کا اسلامی انقلاب وحدتِ اسلامی ہی کی برکت سے رونما ہوا، کامیابی کو پہنچا اور قائم ہوا۔ دنیا کے تمام سیاسی نظاموں کے مقابلے میں اسلامی جمہوریۂ ایران کے نظام کی اضافی خوبی، ہر مظہر سے بڑھ کر اس کی وحدت طلبانہ خصوصیت ہے اور اسلامی انقلاب ہمیشہ مسلمان اقوام میں اس خصوصیت کی بقاء اور اس کے فروغ کے لیے کوشاں رہتا ہے۔

ایران کے باشکوہ اسلامی انقلاب کا ایک بنیادی مقصد اخوّت، بھائی چارے، برابری، اور سماجی مساوات کا قیام، نفاق ڈالنے والے عوامل اور قومی، مذہبی، اور نسلی اختلافات کے خلاف جہاد اور نفاق و انتشار کے منحوس مظاہر کا استیصال ہے اور اب تک ملک میں داخلی طور پر اور بین الاقوامی میدان میں اس مقدس حکمتِ عملی کے اجراء کے لیے ٹھوس اقدامات کیے جا چکے ہیں۔

اس نظریاتی اور عملی وحدت کی ضرورت کا احساس اس وقت زیادہ ہوتا ہے جب ہمیں پتہ لگتا ہے کہ دنیا کی ۵/۴ بلئین آبادی میں تقریباً ایک بلئین یعنی کل آبادی کا چوتھا حصہ مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ یہ عظیم قوّت فطری طور پر ایک دوسرے سے اتحاد و یگانگت کی صورت میں اور اپنے موہوم ملّی، مذہبی، قومی، اور نسلی اختلافات سے بالاتر ہو کر ایک ایسا ناقابلِ تسخیر اور طاقتور محاذ بن سکتی ہے، کہ کوئی بیرونی طاقت یا دباؤ اس کے مقابل ٹھہرنے کی ہمت نہیں کر سکے گا۔

آج دنیا کی مسلمان اقوام اور اسلام کے نام لیوا، ہر دور سے بڑھ کر، دنیائے اسلام میں موجود تفرقہ و انتشار سے تکلیف اٹھا رہے ہیں اور وہ بخوبی جانتے ہیں کہ اسلام کے جلیل القدر پیغمبرؐ نے دورِ جاہلیت کے لوگوں کی ہدایت اور انہیں "لاالٰہ الااللہ" جیسے وحدت آفریں کلمہ کیطرف بُلانے کے لیے کیا کیا سختیاں جھیلیں اور کیا کیا کوششیں کیں اور ایک نہتّی لیکن

عقیدہ و ایمان کا سہارا رکھنے والی قوم کے ہاتھوں اس دور کی دو طاقتور اور کافر حکومتوں (ایران و روم) کو کس طرح ناکوں چنے چبوائے۔

گذشتہ سالوں کے سیاسی حادثات سے یہ حقیقت بخوبی پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ مشرق و مغرب کے عالمی استکبار کے متحدہ محاذ نے مسلمان ممالک میں اسلامی تحریکوں کے خلاف ایک ہمہ گیر جد وجہد کا آغاز کر رکھا ہے اور اگر مسلمان قومیں جو خاص طور پر اسلامی ممالک میں دشمنانِ اسلام کے مظالم اور جارحیت کا نشانہ بن رہی ہیں، میدانِ عمل میں نہ اُتریں اور آیہ شریفہ "واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً ولا تفرّقوا" کے مصداق وحدتِ کلمہ کے ساتھ ایک نصب العین اور ایک پلیٹ فارم پر جمع نہ ہوئیں تو وہ اپنے آپ کو، اپنی سرحدوں اور اپنے علاقوں کو استعماریوں کے تسلّط کی ذلت و ننگ سے ہرگز نجات نہیں دلاسکتیں اور اسلامی ممالک میں ان کی ناجائز مار دھاڑ کا خاتمہ نہیں کر سکتیں۔

۳— بین الاقوامی اداروں اور اسمبلیوں کو آلۂ کار بنانا

انسانی علم میں جس قدر وسعت ہوتی ہے، اشتراک و تعاون کی ضرورت میں اتنا ہی اضافہ ہوتا ہے، لوگوں کا باہمی رابطہ بڑھتا ہے اور جغرافیائی فاصلوں کے اثرات کم ہو جاتے ہیں۔ سفر اور لوگوں کے ادھر اُدھر آنے جانے میں رونما ہونے والی سہولتوں کی وجہ سے نیز خبروں اور رابطے کے ترقی یافتہ ذرائع کی مدد سے، دنیا کے لوگ آج ہر دور سے بڑھ کر ایک دوسرے سے قریب تر ہو چکے ہیں اور جان پہچان نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہونے والا دوسرے فریق کا خوف بڑی تیزی سے کم ہو گیا ہے۔

تمام ممالک ایک دوسرے کے ساتھ مختلف ثقافتی اور سیاسی شعبوں میں روابط نیز تجارتی لین دین کے فروغ اور اقتصادی رشتے وسیع کرنے میں روزافزوں دلچسپی ظاہر کرتے ہیں۔ ان روابط نے، فنون و صنایع کی ترقی، صوتی، تصویری یا بالمشافہ رابطہ قائم کرنے کی سہولت اور اسی طرح حمل و نقل کے ذرائع اور اداروں کی وسعت و ترقی اور اقوام کے باہمی روابط میں تنوّع، غیر معمولی اضافے اور انہیں مرتب و منظم کرنے کے مسئلے کے ساتھ بین الاقوامی اسمبلیوں، اداروں اور انجمنوں کا قیام ناگزیر بنا دیا ہے۔

ساتھ ہی انسانی معاشروں کی روز بروز بڑھتی ہوئی توقعات، سائنسی ترقی، ٹیکنالوجی کی تیز رفتار اور بڑھتی ہوئی ترقی، مسلکوں کے تقابل، مادہ پرستانہ رجحانات اور جھکاؤ کی اشاعت اور اس کے نتیجے میں اصالت، فطرت اور روحانی و انسانی روابط سے دوری نے آج کی دنیا کی سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی صورتِ حال کو تاریخ ساز ناخوشگواریوں اور بحرانوں میں مبتلا کر رکھا ہے۔

بین الاقوامی جنگ اور تنازعات کا خطرہ، جو انسانی معاشرے کو تباہی و بربادی کی دھمکی دے رہا ہے، ہر دور سے بڑھ کر بین الاقوامی اشتراک و تعاون کی ضرورت کو بخوبی واضح کر رہا ہے۔

ظاہر ہے کہ بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں دو بار ہونے والی جنگ کی طرح اگر اب کوئی جنگ چھڑتی ہے تو اس کے اثرات ماضی کے مقابلے میں کہیں زیادہ وحشت ناک ہوں گے اور یہ احتمال بھی ہے کہ وہ پوری بے رحمی سے انسانی تمدن ہی کو ہڑپ کر جائے!

بقاء کی خواہش اور آرام و آسائش اور امن و امان کی ضرورت کا تقاضا ہے کہ اس جہانِ پُر آشوب میں تمام چھوٹے اور بڑے ممالک اپنے مادی و معنوی ذخائر و وسائل کے مطابق، اپنی سیاسی زندگی، استقلال و آزادی اور اپنی مکمل زمینی سرحدوں کو مخرّبِ انسانیت حادثات، رجحانات اور بحرانوں سے محفوظ رکھیں۔

بین الاقوامی ادارے بظاہر سیاسی امن و امان کے تحفظ اور اقتصادی و سماجی فلاح و بہبود کی نیّت سے معرضِ وجود میں آئے ہیں۔ سیاسی امن و سلامتی برقرار رکھنے کے لیے لازم ہے کہ جنگ کی روک تھام کی جائے اور جنگ چھڑ جانے کی صورت میں، اس کا مقابلہ اور صُلح پسندانہ انداز میں اختلاف کا حل کیا جائے۔ (۱)

انجمن اقوامِ متّحدہ بھی اسی احتیاج کی پیداوار ہے۔ ہر چند کہ اس کی حقیقی صلاحیت و قوت کا دائرہ ایسا نہیں ہے جیسا کہ ہونا چاہیے اور یہ بین الاقوامی صلح و امن کی بقاء، مختلف اقوام کے مابین دوستانہ اور منصفانہ روابط کے فروغ اور پوری دنیا کے لوگوں کے لیے انسانی زندگی کے حالات پیدا کرنے کے لیے ضروری امور سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔

---

(۱) ڈاکٹر گنجی، منوچہر: سازمان مللِ متحد در تئوری، جلد اول، شرکت سہامی، کتابہای جیبی۔

اقوامِ متحدہ

اقوامِ متحدہ، عظیم ترین بین الاقوامی اداروں میں سے ہے، جو دوسری عالمی جنگ اور سابقہ "انجمنِ اقوام" کی ناکامی کے بعد، بین الاقوامی صلح و سلامتی کے حفظ و بقاء کے لیے، ۱۹۴۵ء میں پچاس ممالک کے نمائندوں کی شرکت سے تشکیل پذیر ہوا۔ (۱)

بین الاقوامی قوانین کے لحاظ سے اقوامِ متحدہ ایک قانونی حیثیت کا حامل ادارہ ہے۔ اگرچہ بہت سے ممالک کے قوانین، اپنے ملک میں اقوامِ متحدہ کے دفتر اور اس کے ملازمین کے ساتھ وہی مخصوص اور مقررہ برتاؤ کرتے ہیں جو سفارت خانوں اور بیرونی سیاسی نمائندوں سے روا رکھا جاتا ہے۔

امریکی حکومت جو اقوامِ متحدہ کی دائمی میزبان ہے، اب تک جب بھی وہ کسی فرد، افراد یا کسی ملک کے نمائندوں کی اقوامِ متحدہ میں شرکت کو اپنے مفادات کے خلاف سمجھتی ہے تو انہیں ویزا جاری کرنے سے اجتناب کرتی ہے اور بہت سے ممالک --- بشمول اسلامی جمہوریۂ ایران --- کے ڈپلومیٹس پر نیویارک میں اقوامِ متحدہ کے دفاتر کے ۱۵ کلومیٹر باہر تک کی حدود سے نکلنے پر پابندی لاگو کر دیتی ہے۔

اقوامِ متحدہ کے اراکین اپنے اخراجات اسی درجہ بندی کے مطابق برداشت کرتے ہیں جس کا تعین ہر سال جنرل اسمبلی کرتی ہے۔ اس کے باوجود اقوامِ متحدہ کے بجٹ کا عام طور پر ۳۰ سے ۳۲ فیصد، امریکہ، تقریباً ۱۵ فیصد رُوس اور چھ چھ فیصد فرانس اور برطانیہ کے حصّے میں

---

(۱) اقوامِ متحدہ کے قیام کے ابتدائی اجلاس سانفرانسسکو کانفرنس میں ۲۵ اور ۲۶ اپریل ۱۹۴۵ء کو ہوئے اور ان میں ۵۰ ملکوں کے نمائندوں نے شرکت کی۔ اس کانفرنس میں اقوامِ متحدہ کا منشور پاس ہوا جسے ۱۹۴۱ء میں ہونے والے "اٹلانٹک منشور" کے نام سے مشہور، امریکی صدر اور برطانوی وزیراعظم کے مشترکہ اعلامیے کے اصول و مقاصد کی روشنی میں مرتب کیا گیا تھا۔ ۱۹۸۶ء کے آخر تک ۱۵۹ ممالک کو اقوامِ متحدہ کی رکنیت دی گئی ہے۔

آتا ہے جسے قبول کرتے ہوئے، وہ فراہم کرتے ہیں۔ (۱)

ظاہر ہے کہ اقوامِ متحدہ کے اخراجات کی ادائگی میں یوں حصہ لے کر یہ ممالک عملاً اسے اپنی خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ بنا لیتے ہیں اور جب اقوامِ متحدہ ایسے مسائل کے ضمن میں جو بڑی طاقتوں کے مفادات کے خلاف ہوں، کوئی حتمی اور قطعی فیصلہ کرنے کا ارادہ کرلے تو یہ ویٹو کا حق (۲) استعمال کرکے اس کی منظوری اور اجراء میں رکاوٹ ڈال دیتے ہیں، سلامتی کونسل کے فیصلوں میں انہیں ویٹو کا حق حاصل ہے۔

امام خمینی (قدس سرہ) اپنے بیانات میں، کوپن ہاک میں ہونے والی "عورت کی دہائی کانفرنس" کے شرکاء سے خطاب کرتے ہوئے ۱۹/۶/۱۳۵۹ھ۔ش/ ۱۹۸۰ء کو اس ضمن میں فرماتے ہیں:

"بنیادی طور پر ہر وہ ادارہ جس میں ان بڑی طاقتوں کا ہاتھ ہے، ایسا ادارہ ہے جسے ان کے مفاد پر ختم ہونا چاہیے۔ یہ اقوامِ متحدہ، یہ باہر منعقد ہونے والے اجلاس، سلامتی کونسل، یہ سب سپر پاورز کے تابع ہیں اور تمام ممالک کو کھلونوں سے بہلائے رکھنے کے لیے ہیں اور دیکھا جائے تو بنیادی طور پر یہ جملہ ممالک خود بڑی طاقتوں کے دست نگر ہیں۔ یہ (بڑی طاقتیں)

---

(۱)— منشور کی دفعہ ۱۷ کے مطابق جنرل اسمبلی اقوام متحدہ کے بجٹ کی تحقیق، منظوری اور حصّے کرتی ہے۔ ممالک کے حصّوں کی تعیین کے وقت کوشش کی جاتی ہے کہ ایک ملک کا حصّہ زیادہ سے زیادہ اقوامِ متحدہ کے کل بجٹ کی ایک تہائی سے متجاوز نہ ہو کیونکہ دوسری صورت میں اقوامِ متحدہ کی بنیادی آزادی ایک ایک رکن ملک سے مخدوش ہو جاتی ہے اور کوئی ایسا رکن اپنا حصّہ ادا نہ کرے تو اقوامِ متحدہ کے امور کی انجام دہی میں وقفہ یا اس سے وابستہ اداروں کے پروگراموں کے اجراء میں رکاوٹ کا امکان ہو سکتا ہے۔

۱۹۴۶ء سے جنرل اسمبلی ممالک کا حصّہ متعین کرنے کے لیے مندرجہ بالا اصول کے علاوہ آبادی اور زیادہ سے زیادہ فی کس آمدنی کو بھی مدِ نظر رکھتی ہے۔ اس کے باوجود کسی بھی ملک کے حصّے کا حاصل تقسیم اس کی آبادی کی تعداد پر ۱/۵ ڈالر سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔

(۲)— اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل ۱۵ ارکان پر مشتمل ہوتی ہے جن میں پانچ رکن مستقل اور دس عارضی ہوتے ہیں، جنہیں اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی جغرافیائی تقسیم کو پیش نظر رکھتے ہوئے عارضی اراکین کے طور پر دو سال کے لیے منتخب کرتی ہے۔ مذکورہ کونسل کے مستقل ارکان یہ ہیں۔ امریکہ، روس، برطانیہ، فرانس اور چین۔ سلامتی کونسل کے فیصلے اس صورت میں منظور ہوں گے جب ۱۹ ارکان بشمول پانچ مستقل ارکان کے ان کے حق میں ووٹ دیں۔ یوں کسی ایک مستقل ممبر کی مخالفت بھی سلامتی کونسل کے فیصلوں میں رکاوٹ بن جائے گی۔ اسے ویٹو پاور کہا جاتا ہے۔ (کتنی دلچسپ بات ہے کہ سلامتی کونسل کے مستقل ارکان کے ناجائز اختیار کو ویٹو پاور کا نام دیا جاتا ہے)۔

جس نام سے بھی کوئی ادارہ بناتی ہیں۔ سب کو اپنے مفادات کی طرف کھینچنا چاہتی ہیں اور ہم بڑی طاقتوں سے اس حد تک بدگمان ہیں کہ اگر وہ کوئی سچی بات بھی کریں تو ہمارا خیال یہ ہوتا ہے کہ یہ لوگوں کو دھوکہ دینے کی غرض سے کہا جارہا ہے"۔ (۱)

اس طرح، حضرت امامؒ کے فرمودات ——— جو ایسے بین الاقوامی اداروں کی ماہیت سے آگاہ کرتے ہیں ——— کے پیشِ نظر ضروری ہے کہ ایسے اداروں میں اسلامی جمہوریہ کی شرکت کے اسباب کا تجزیہ کیا جائے تاکہ واضح ہو کہ اقوامِ متحدہ میں اسلامی جمہوریہ کی شمولیت کا بنیادی سبب کیا ہے؟

بین الاقوامی اداروں اور کانفرنسوں میں اسلامی جمہوریۂ ایران کی شرکت کے اسباب

ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ بین الاقوامی ادارے، استعمار کے آلۂ کار ہونے کے علاوہ اور کچھ نہیں اور محض عالمی امپیریلزم کی خدمت میں مصروفِ عمل ہیں۔ یہ بڑے بڑے ادارے محض کمزور اور زیرِ تسلّط ممالک اور ان لوگوں کے خلاف جو اپنے جائز حقوق کا دفاع چاہتے ہیں عالمی استکبار کے پروپیگنڈوں کے ذرائع بنے ہوئے ہیں۔ اس بناء پر اسلامی جمہوریہ شرق و غرب کی سیاست سے بلند رہتے ہوئے اور دُنیا بھر کے مستضعفین کے حقوق کے دفاع کا علمبردار بن کر ایسے اداروں میں سرگرمی سے کیسے شمولیت اختیار کرسکتا ہے؟

اسلامی انقلاب کی کامیابی کے آغاز سے اب تک اسلامی جمہوریہ کے سامنے دو راستے رہے ہیں:

یا بین الاقوامی اداروں، کانفرنسوں اور اسمبلیوں کے اجلاسوں میں مطلقاً عدم شمولیت اور ایسے اداروں سے کنارکشی، یا ان کی اصلیت جانتے کے باوجود ان میں مشروط اور محدود شرکت۔ پہلا راستہ بہت سی وجوہات کی بناء پر ہمارے انقلاب کے مفاد اور اس کی بہتری

(۱)— صحیفۂ نور۔

میں نہیں کیونکہ مکمل گوشہ نشینی اور اپنے اصولی اور نظریاتی نقطہ ہائے نظر محفوظ رکھتے ہوئے بین الاقوامی پلیٹ فارم اور اس سے متعلقہ کانفرنسوں کے مواقع کھو بیٹھنا، جن سے ہم کم از کم یہ کام تو لے سکتے ہیں کہ ان کی مدد سے جہانخواروں اور استعماریوں کے حقیقی مقاصد سے لوگوں کو آگاہ کریں اور ان کے خیر خواہانہ ظاہر کے باوجود انہیں رسوا اور افشاء کریں (۱) اور ان مراکز اور اسمبلیوں سے ہم اسلامی انقلاب کے مشن اور اس کے پیغامات کو پھیلانے کے لیے سٹیج کا کام لیں۔

قابلِ ذکر ہے کہ قید سے چھوٹے ہوئے تیسری دنیا کے ممالک، بتدریج اب کہیں اس قابل ہوئے ہیں کہ ایسے اکثر بین الاقوامی اداروں میں کوئی نمایاں گروپ بنا سکیں جس سے تمام امور میں صرفِ نظر اور اغماض بڑی طاقتوں کے لیے ممکن نہیں اور اسلامی جمہوریۂ ایران کا حقیقی مقام اسی گروپ میں ہے (۲)؟

بنیادی طور پر اسلام کا سیاسی فلسفہ، جو دنیا سے حقیقت پسندانہ آگاہی کی بنیاد پر استوار ہے، اس امر کا متقاضی ہے کہ حقائق سے آگاہ ہو کر ان سے نبٹنے کے لیے مناسب اقدامات کیے جائیں۔ اسلام یہ توقع نہیں رکھتا کہ مسلمان قوم اپنے من گھڑت ذہنی مفروضوں اور آئیڈیلز کے ہالے میں رہ کر اپنی سیاسی زندگی کی تشکیل کرے اور اس کی بنیاد پر اپنی سیاسی پالیسیاں متعیّن کرے۔ پیغمبروں اور ائمہ —— صلوات اللہ وسلامہ علیہم ——کی زندگی معاشرے میں ہونے والے اور اس پر غالب حقائق و واقعات کی طرف گہری توجہ کی نشاندہی کرتی ہے۔ گو، وہ ان میں سے اکثر پر اعتقاد نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کے خلاف جدوجہد کرتے تھے۔ یوں حقائق کا وجود، ان کی طرف دھیان اور ان سے آگاہی یہ ایک موضوع ہے اور انہیں ماننے یا نہ ماننے کا مسئلہ یہ ایک دوسرا موضوع ہے (۳)۔

---

(۱)— بین الاقوامی اداروں میں غاصب صہیونی حکومت کی اصلیت اور اس کے قیام اور اس کے جرائم کی حمایت کے سلسلے میں امریکہ اور اس کے حلیفوں کے کردار کا افشاء اور اسی طرح ایسے اجلاسوں میں مشرق و مغرب کے استعمار کی سیاست بازیوں اور چالوں کی تشریح اس امر کا سبب بنی ہے کہ امریکہ اور کچھ دوسرے ممالک یونیسکو سے نکل گئے ہیں اور انہوں نے کہا ہے کہ اگر صورتِ حال یہی رہی تو وہ اقوامِ متحدہ سے بھی نکل جائیں گے۔ گذشتہ چند سالوں میں امریکہ کی طرف سے اپنے حصّے کی عدم ادائیگی، اس کی اسی حقائق سے گریزاں سیاست کی ایک کڑی ہے۔

(۲)— شناسنامۂ سازمانہای بین المللی جمہوریِ اسلامیِ ایران، انتشارات وزاراتِ امورِ خارجہ، ص ۱،۱۱

(۳)— منصوری، جواد: نظری بہ سیاست خارجی جمہوری اسلامیِ ایران، ص ۲۰۸۔

آج بین الاقوامی ادارے اور اسمبلیاں ایک وسیع اور پیچیدہ حقیقت کی صورت میں، دنیا میں ایک نسبتاً فعال اور مؤثر کردار ادا کر رہی ہیں اور ٹیکنالوجی کی رفتار اور اس سے پیدا ہونے والے انسانی مسائل کے پیشِ نظر یہ پیش گوئی کی جاسکتی ہے کہ مستقبل میں اہم عالمی فیصلوں میں ان کا حصّہ پہلے سے زیادہ ہو گا۔

اسلامی جمہوریہ، عالمی اداروں خصوصاً اقوامِ متحدہ میں شرکت کر کے ان سے اپنے نظریات و خواہشات کے بیان، غلبہ پرست جارحین کی اصلیت کے افشاء اور دنیا کی مظلوم اقوام کے سامنے اپنی تجاویز پیش کرنے کے لیے ایک آزاد اسٹیج کے طور پر فائدہ اٹھاتی ہے اور اس کا خیال ہے کہ اقوامِ متحدہ بڑی طاقتوں کے تسلّط سے نجات پاکر جس پر ابھی تک اُن کا غلبہ ہے، تبادلہ خیالات، عالمی اختلافات کے حل اور دنیا کی محروم قوموں کی مدد رسانی کا مقام بن سکتی ہے۔ لیکن موجودہ صورتِ حال میں اس کا ایسا کردار نظر نہیں آتا، لہٰذا وہ اس ادارے اور اس سے وابستہ شعبوں خصوصاً سلامتی کونسل کی موجودہ صورتِ حال کی اصلاح اور دنیا کے پانچ طاقتور ملکوں کے لیے ویٹو پاور وغیرہ جیسے حقوق رکھنے کے نقائص دور کرنے کے لیے اقوامِ متحدہ کے منشور کی اصلاح پر زور دیتی ہے۔ اس ضمن میں کچھ نامنصفانہ قراردادوں پر نظر ثانی ضروری ہے جو ایسی مظلوم اقوام کے حقوق پامال کر رہی ہیں، جنہوں نے سالہا سال غاصب و قابض قوتوں کے تسلّط کے خلاف جدوجہد کی ہے۔ مثلاً فلسطین کا مسئلہ اور صہیونی و جنوبی افریقہ کی حکومتوں کے غیر مشروط اخراج سے متعلق قراردادیں۔ (۱)

اب بھی بین الاقوامی اسمبلیوں اور اجلاسوں میں شرکت سے نہ صرف اسلامی جمہوریۂ ایران کے لیے کسی خاص بلاک سے کسی طرح کی کوئی وابستگی نہیں ہوتی بلکہ اسے ان سوالوں کا جواب دینا ہوتا ہے جو انقلاب اور اسلامی نظام کے سلسلے میں اٹھائے جاتے ہیں۔

دوسری طرف اسلامی جمہوریہ کے نمائندوں کی موجودگی ہی بنیادی طور پر ایسی بہت سی افواہوں اور زہر آلود پروپیگنڈوں کو روکنے کا سبب بن جاتی ہے جس کا جواب بعد میں نادم ہو کر دینا پڑے۔

گذشتہ سالوں میں اسلامی جمہوریۂ ایران کے قطعی، صریح اور انقلابی نقطہ ہائے نظر ان

---

(۱) — گزارش سیمینار شمارہ — ۴ از انتشارات دفتر مطالعات سیاسی و بین المللی وزارتِ امورِ خارجہ، ص ۱۴۔

بڑی طاقتوں کے لیے پریشانی اور تشویش خاطر کا باعث بنے ہیں جنہوں نے اب تک ایسے اداروں کو اپنی جاگیر سمجھ رکھا ہے۔

۴۔ پٹھو حکومتوں کی طرف سے حمایت اور مخالف تحریکوں اور عوامی بغاوتوں کی سرکوبی

صنعتی دنیا کو اصل وسعت و ترقی گذشتہ نصف صدی میں حاصل ہوئی ہے۔ استعمار نے یہ وسعت و ترقی، زیرِ تسلّط ممالک کے ذخائر کے باقاعدہ طے شدہ استحصال اور منڈیوں میں ان کی پیداوار کی فروخت سے حاصل کی ہے۔ تیسری دنیا کے ممالک میں رونما ہونے والی حالیہ تبدیلیوں نے دنیا کے مختلف علاقوں کے کچھ لوگوں کو بیداری و آگاہی سے بھی نوازا ہے۔ عالمی استکبار نے اپنی فوج کی موجودگی کو جیساکہ گذشتہ حصّے میں بیان کیا جا چکا ہے، چنداں مفید اور بہتر نہ سمجھا اور اسے اندازہ ہو گیا کہ اس کا تسلسل ممکن نہیں رہا۔ لہذا اس نے ان ذخائر کی حفاظت اور لوٹ مار کی بہانہ تراشی کے لیے نئے نئے راستوں کو موضوعِ تحقیق بنایا۔

انہی چالوں میں سے ایک چال، نو آبادیات میں مزدور اور مقامی گروہوں کی حمایت تھی۔ استکبار اپنے پٹھوؤں کو مقامی حکومتوں کی کلیدی اسامیوں پر فائز کر دیتا اور یوں اپنی خود ساختہ حکومتوں کے توسّط سے اپنے وہ استعماری مقاصد حاصل کر لیتا جنہیں پہلے متعینہ اور معروف غیر مقامی لوگوں کے ذریعے حاصل کرتا تھا اور اب وہی مقاصد اُسی ملک کے شہری، ایک گروہ کے ذریعے جو بظاہر ایک آزاد اور غیر وابستہ حکومت تشکیل دیے ہوئے ہیں، پورے کر رہے ہیں، یہ پٹھو حکومتیں بعض موقعوں پر نمک حلالی کا مظاہرہ کرنے میں انتہا کر دیتی ہیں اور پہلے سے طے شدہ احکامات اور ہتھکنڈوں کے اجراء میں استعمار کے سرکاری کارندوں سے بھی دو قدم آگے بڑھ جاتی ہیں۔ یہ لوگ عوام کے ساتھ برتاؤ میں سختی، جبر و تشدّد اور دباؤ کا سہارا لیتے ہیں کہ لوگوں کے لیے روز بروز صورتِ حال کا برداشت کرنا اس دور سے بھی زیادہ مشکل ہوتا چلا جاتا ہے جب استعمار براہِ راست ان کے ملک پر حاکم تھا۔

حالیہ صدیوں میں، جو افریقی، ایشیائی اور لاطینی امریکہ کے ممالک کی آزادی پسند تحریکوں کا زمانہ ہے، استعماری طاقتوں نے عوامی جدوجہد کے شروع ہوتے ہی پوری قوت سے آزادی پسند تحریکوں کو ختم کرنا اور ان کے قائدین کو گرفتار کرکے طرح طرح کی اذیتیں دینا شروع کر دیا تھا۔ اس کے باوجود جب یہ تحریکیں ہمہ گیر اور انسانی تحریکوں کی شکل میں اُبھر کر سامنے آگئیں تو استعماریوں میں ان سے مقابلہ کرنے اور ٹکر لینے کا حوصلہ نہ رہا۔ مجبوراً انہوں نے ظاہری آزادی دے کر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنے وابستہ اور پٹھو عناصر کی حمایت شروع کر دی اور وسیع فوجی و مادّی وسائل سے استفادہ کر کے، جو اس نے ان ممالک پر اپنے تسلّط کے کئی سالوں میں فراہم کر لیے تھے، مخالف تحریکوں اور عوامی بغاوتوں سے آگاہی حاصل کی، پھر جدوجہد کرنے والے متحارب گروہوں میں تفرقہ و جدائی ڈال کر ان کی کمزوری اور شکست کے اسباب و عوامل پیدا کیے۔

موجودہ صدی میں استعمار نے مختلف حیلوں اور بہانوں سے کانگو، گنی اور مصر جیسے افریقی ممالک کی آزادی پسند تحریکوں کی بدولت قائم ہونے والی قومی حکومتوں کے سقوط و شکست کے اسباب فراہم کیے، جو بالترتیب پیٹرس لوممبا، قوام نکروما اور جمال عبدالناصر کے ذریعے شروع ہوئی تھیں۔ پیٹرس لوممبا، جو جنوبی افریقہ میں آزادی پسند تحریک کے قائدین میں سے تھا، کی قومی حکومت کے سقوط کے سلسلے میں استعماری سازشیں، افریقہ کی تاریخ میں ہرگز کبھی فراموش نہیں کی جائیں گی۔ اعلانِ آزادی سے مربوط مسائل اور پھر لوممبا کی گرفتاری اور قتل، مخالف اور عوامی تحریکوں کے ساتھ استعمار کے طریقۂ جنگ کی نشاندہی کرتے ہیں۔ (۱)

---

(۱)— جس دن کانگو پر مسلّط بلجیئم کے سابقہ استعمار کا خاتمہ ہوا، اس دن پٹیریس لوممبا، شاہ بلجیئم (بوڈائن) کے خطاب کے بعد، جو کانگو کے جشن آزادی میں شرکت کے لیے آیا ہوا تھا، ڈائس پہ جھپٹا اور چلایا: ”کانگو کا کوئی بھی شریف النّفس باشندہ یہ بات فراموش نہیں کر سکتا کہ آزادی جدوجہد سے حاصل کی گئی ہے، مسلسل، بے امان اور سراپا اُمید جدوجہد سے، ایسی جدوجہد سے جس میں ہم نے نہ اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے میں کوئی مضائقہ کیا، نہ اپنی محرومی قبول کرنے میں اور نہ ہی اپنے خون کی قربانی دینے میں“۔ اس سے اگلے دن عوامی افواج کے کمانڈر انچیف جنرل بانسن نے، جسے اپنے عہدے پر بحال رکھا گیا تھا، افریقی اربابِ اختیار کو جمع کیا اور تختۂ سیاہ پر ایک فارمولا لکھا، جو یہ ہے:

”آزادی کے بعد = آزادی سے پہلے“

”جن لوگوں نے اس کا مطلب نہ سمجھا، ان کے لیے وضاحت کرتے ہوئے اس نے کہا سب سے پہلے جو بھی ٹیڑھا قدم رکھے گا، میں اس سے نبٹ لوں گا“ اس کا پہلا شکار بھی لوممبا تھا، جس نے راہِ آزادی میں قدم رکھا اور جان قربان کر دی۔ مزید معلومات کے حصول کے لیے دیکھئے کتاب ”تکاپوی جہانی“ تصنیف ژان ژاک سروان شرائبر، باب ”زئیر، ہر قیمت پر“ ص ۲۰۸ تا ۲۱۷۔

بلژیکی کانگو کے اعلانِ آزادی کے بعد پیٹریس لوموبا نے زمامِ اختیار اپنے ہاتھ میں لی۔ ابھی چار دن بھی نہیں گذرے تھے کہ سڑکوں پر عام مظاہرے اور فسادات شروع ہو گئے۔ دارالخلافے میں فوج میدانِ عمل میں آگئی اور موسی چومبہ نامی ایک مقامی تاجر کی تحریک پر، جو بلژیکی استعماریوں کا آلۂ کار تھا، صوبہ کاتانگا نے علیحدگی کا اعلان کر دیا(۱) اور بالآخر نظم و ضبط کے قیام اور یورپیوں اور مذہبی مبلّغین کے قتلِ عام کی روک تھام کے بہانے سے، کرنل موبوٹو کی سرکردگی میں فوج برسرِ اقتدار آگئی۔

لوموبا فرار کی ناکام کوشش کے بعد موبوٹو کی فوج کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا اور آخر کار اسے چومبہ کے چیلوں نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس کی نعش آج تک نہ ملی۔

موبوٹو نے ازسرِ نو حکومت کی تشکیل و تنظیم کی اور سی۔آئی۔اے کی مدد سے ایک بغاوت کے بعد حکومت سنبھال لی۔ یوں ہے اس ملک کو آزادی دیے جانے کی کہانی جسے آجکل زائیر کہا جاتا ہے۔

بظاہر مختلف انداز میں اسی طرح کی ایک سازش ۱۳۳۲ھ۔ش/۱۹۵۳ء میں ایران میں تیل کے قومیائے جانے کی تحریک کے خلاف جدوجہد میں بھی دہرائی گئی۔ ایران کی تیل کی صنعت کو قومیائے جانے کا قانون ۲۴, اسفند ۱۳۲۹ھ۔ش کو "پارلیمنٹ" اور ۲۹, اسفند ۱۳۲۹ھ۔ش کو سینٹ میں منظور ہوا۔

تیل کی صنعت کے قومیائے جانے سے چونکہ برطانیہ، ایران تیل کمپنی کی اجارہ داری ختم ہو جاتی تھی اس لیے مذکورہ کمپنی، برطانوی حکومت اور مجموعی طور پر تیل کے بین الاقوامی کارٹلز نے اس کی شدید مخالفت کی اور ایسا بحران پیدا کر دیا کہ برطانوی و امریکی حکومت کی دخل اندازی اور ان دونوں کی مشترکہ سازش کے نتیجے میں ۲۸, مرداد/ کی بغاوت ہوئی اور مصدّق کا سقوط ہو گیا۔ بغاوت کی یہ سازش، جس کا خفیہ نام "چکمہ آپریشن" تھا، انٹیلی جنٹ سروس کے ایک کارندے کرمٹ روزویلٹ اور سی۔ آئی۔ اے کے توسّط سے ترتیب

---

(۱)— بالائی کاتانگا کے معدنی ذخائر، کانگو کے زیرزمینی ذخائر کے قیمتی حصّے اور اس کا مرکز تھے، اس زمانے میں ان کی پیداوار پوری دنیا کے پیتل کا ۷۰ فیصد، کوبالٹ ۶۰ فیصد اور ۱۶ فیصد ژرمینیم (ٹرانزسسٹر کے لیے ضروری)، قلعی، جست، منگنیز اور کاڈمیم (تانبہ) تھی۔ بلژیکی استعماریوں کے مفادات کا مرکزی ہدف کاتانگا تھا اور بلجیئم موسی چومبہ کی حمایت کر رہا تھا۔

دی گئی تھی۔ یہ سازش ایک ایسی تحریک کی سرکوبی کا باعث بن گئی جو نہ صرف ایران بلکہ مشرقِ وسطیٰ کے پورے علاقے میں مغرب اور تیل کے کارٹلز کے مفادات کو خطرے میں ڈال سکتی تھی۔ (۱)

---

(۱)— مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے:

"عملیات چکمہ"، تصنیف سی۔ ایم۔ وڈہاؤس، ترجمہ فرح ناز شکوری، انتشاراتِ نشرِ نو اور: "کودتا در کودتا"، تصنیف کرمٹ روزویلٹ، ترجمہ ڈاکٹر علی اسلامی، انتشارات چاپ بخش۔

فصلِ دوّم: چند جملوں میں

O——— تیسری دنیا کی غربت کی بنیادی وجہ ان دو بنیادی عوامل میں تلاش کی جاسکتی ہے۔

الف: مغرب کے صنعتی ممالک کی طرف سے استحصال کی رفتار اور طریقۂ واردات میں شدّت

ب: گمراہ اور پٹھو حکومتیں۔

O——— استعمار اپنی شرحِ پیداوار اور اس کے نتیجے میں اپنی آمدنی میں اضافے کی خاطر، تیسری دنیا کی اقتصادی ترقی میں رکاوٹ ڈالتا ہے۔

O——— تیسری دنیا کے ممالک میں وابستہ حکومتیں اپنے اقتدار کے تحفّظ کے لیے بیرونی قرضے حاصل کرنے لگ جاتی ہیں۔

O——— مغربی ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی آزادی، محض ایک دعویٰ ہے۔ ان اداروں میں کھلم کھلا اور مخفی عوامل سے پالیسی لائن مرتب کرنے والی قوت، حکومتیں ہیں جو دباؤ اور تسلّط کے گروہوں کا کام بڑے سوچے سمجھے انداز میں اور شور و غوغا کیے بغیر انجام دیتی ہیں۔

O——— آجکل کے معاشروں میں اخبارات و جرائد کے دو مشن اور فرائض ہیں: خبروں کی نشر واشاعت اور نظریات کی تبلیغ۔

O——— مغربی یا مشرقی استکبار کے ذرائع ابلاغ کا فریضہ ہے کہ لوگوں کے ذہنوں کو ہیئتِ حاکمہ کی منشاء کے مطابق تیار کیا جائے۔

O——— مغربی دنیا میں ذرائع مواصلات کے وسیع ادارے مکمل طور پر بین الاقوامی صہیونزم سے وابستہ عظیم خبری کارٹلز کے اثر اور کنٹرول میں ہیں۔

O——— روس اور برطانیہ کے استعماریوں نے مسلمان ممالک کے مابین وحدت میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے شیعہ سُنّی جنگ کو ہوا دی۔

○ ——— اُمتِ مسلمہ میں تفرقہ اندازی کے لیے، اسلامی ملکوں میں بہائیت، بابیت، وہابیت اور قادیانیت وغیرہ جیسے گمراہ فرقے بنائے گئے ہیں۔

○ ——— ذرائع مواصلات میں اضافہ اور تبدیلیوں اور اثرات میں سرعت سے اجتماعی مدد و تعاون کی ضرورت و اہمیت بخوبی واضح ہوتی ہے، جو بین الاقوامی اداروں کے پیکر میں جلوہ گر ہے۔

○ ——— بین الاقوامی ادارے سیاسی امن و سلامتی کے قیام اور اقتصادی و معاشرتی ترقی کے نعرے سے وجود میں آئے ہیں۔

○ ——— پانچ حکومتیں ——— امریکہ، روس، برطانیہ، فرانس اور چین اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل میں ویٹو کا حق رکھتے ہوئے، حقیقت میں اقدام کے حقوق کی حفاظت کے لیے اس کونسل کے فیصلوں میں رکاوٹ بنتی ہیں۔

○ ——— بین الاقوامی اداروں اور اسمبلیوں میں اسلامی جمہوریۂ ایران کی عدم شرکت، درحقیقت انقلاب دشمن عناصر کی خواہش کی تکمیل ہے، کیونکہ اس طرح بین الاقوامی میدان میں نظامِ الٰہی گوشہ نشین ہو جائے گا۔

○ ——— مختلف طاقتوں یا حکومتوں کے متعلق کوئی ذمہ داری قبول کیے بغیر بین الاقوامی اسمبلیوں میں شرکت اور ان کے آزاد سٹیج سے استفادہ، اس سلسلے میں ہماری عملی سیاست کو تشکیل دیتا ہے۔

○ ——— محروم عوام کی آزادی پسند تحریکوں کے مقابلے میں، استعماری شروع میں ان کی سرکوبی کرتے لیکن جب اس میں کامیاب نہ ہوتے تو انہیں نیم وابستہ آزادی دے کر اور ان پر اپنے پٹھو آلۂ کار مسلّط کر کے اپنے مفادات کو بھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے اور تفرقہ اندازی کر کے مناسب موقع پر ان تحریکوں اور ان کے قائدین کا قلع قمع کر دیتے تھے۔

فصلِ سوّم

ثقافتی و معاشرتی چالیں

گذشتہ صدی میں تسلّط پسند نظاموں کو اس بات کا اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ اپنے تسلّط کو ہمیشہ قائم رکھنے کے لیے محض مسلّح افواج اور اقوام کی دائمی سرکوبی پر اکتفاء نہیں کر سکتے، اور نہ فوجی ہتھکنڈوں کا سہارا ہمیشہ کے لیے ان کی موجودگی کا ضامن ہو گا۔ لہٰذا انہوں نے ایک ایسی روش اپنانے کے لیے ثقافتی و معاشرتی چالوں سے استفادے کا راستہ اختیار کیا، جس کے لیے انہیں کسی طویل و عریض اطلاعاتی نظام کی ضرورت بھی نہ پڑے اور محدود فوجی قوّت کی متقاضی بھی ہو۔ یوں انہوں نے معاشروں کی ثقافت پر اثرانداز ہو کر لوگوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ استعماری معیارات و اقدار ہی ان کا مطلوبہ نصب العین اور آج کے "متمدن اور ترقی یافتہ" انسان کے برتر مقام اور اس کی شان کے شایاں ہیں۔

انسانوں کے کردار کا بڑا حصّہ چونکہ ان کی فکری اقدار و معیارات پر مبنی اور ان کے مجموعۂ اعتقادات کے تابع ہوتا ہے، اس لیے قدیم زمانوں ہی سے ایک اہم اور بنیادی امر کے طور پر اقوام کے معتقداتی نظریات میں سعی و کوشش، حکومتوں کے کام میں شامل رہی ہے، اس بنیاد پر اگر ہم بیسویں صدی میں ہونے والی استکباری سیاستوں کے اہم ترین بُعد کو ان کا ثقافتی بُعد سمجھیں تو بے جا نہ ہو گا، (۱) اس سیاست اور اس کے مقاصد سے بہتر طور پر آگاہ ہونے کے لیے ہم یہاں فکری اور ثقافتی شعبے میں استکباری چالوں کا تجزیہ کرتے ہیں۔

---

(۱) مغربی ممالک کے بجٹ کی بیرونی ثقافتی سرگرمیوں کا تجزیہ اس دعوے کی دلیل ہے۔ مثلاً گذشتہ چند سالوں میں فرانس کی وزارتِ خارجہ کا بجٹ ۱۵۰ ملین فرانک رہا ہے جبکہ اس کی بیرونی ثقافتی اور پروپیگنڈے کی سرگرمیوں کے لیے مخصوص کیا جانے والا بجٹ ۲۴۸ ملین فرانک ہے، اور اسی بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ مشرقی و مغربی بلاک کے ممالک ثقافتی مسائل اور دوسرے ممالک میں ان کی اشاعت کو کتنی اہمیت دیتے ہیں۔

۱— ثقافتی بنیادوں اور انسانی قدروں کی نفی

استعمارِ نو — پہلے بیان کی گئی وجوہات کی بناء پر — اس نتیجے پر پہنچا کہ ہر ملک میں موجود ثقافت اور اعتقادات، اُس کی حاکمیت کے استحکام و دوام کے لیے بہت بڑا خطرہ ہیں، لہٰذا وہ اقوام کی مقامی اور خالص ثقافتوں کو لغو اور ہیچ سمجھتے ہوئے ان کی نفی کر کے، بے ثقافتی کی ترویج یا مادّہ پرستانہ ثقافت کو ان کی جگہ دے کر اعلیٰ اور انسانی اقدار کو کمزور کرتا ہے اور مغرب کی مصرفی ثقافت کو ترقی یافتہ اور آجکل کی ثقافت کے طور پر پیش کر کے اس کا پروپیگنڈا کرتا ہے۔(۱)

گذشتہ دو صدیوں میں ایران اور تمام اسلامی ممالک میں تشخص بیزاری اور مغرب پرستی کی ترویج اور عوام کے سلیقہ و ذوق میں تبدیلی، استکباری سازشوں ہی کا ایک حصّہ ہے۔ استعمار نے، یہ جانتے ہوئے کہ اسلامی نظریاتی بنیادوں کا وجود، اسلامی ممالک پر اس کے غلبہ و تسلّط کو ناممکن بنائے ہوئے ہے، ان اعتقادات کو کمزور اور برباد کر کے ان کی جگہ مغرب کی مادّہ پرست ثقافت کے فروغ و اشاعت اور حقیقی اقدار کی بجائے خلافِ اقدار پروپیگنڈے کو اپنے منصوبوں میں سرِ فہرست جگہ دے رکھی ہے۔

امام خمینیؒ حجاجِ بیت اللہ الحرام کے نام اپنے پیغام میں، اسلامی ممالک میں استکبار کی اس کوشش کے سلسلے میں فرماتے ہیں:

"کیا اسلامی ممالک کے علماء کے لیے باعثِ ننگ نہیں ہے کہ قرآن کریم، اسلام کے نورانی احکام اور سنّت پیغمبر و ائمہ معصومین علیہم السلام کے ہوتے ہوئے، ان کے زیرِ اثر اسلامی ممالک میں کفر کے احکام و قواعد پر عمل ہو اور دھن، دھونس اور دھوکے کے چالبازوں اور اسلام کے حقیقی مخالفین کی دی ہوئی پالیسیوں کا اجراء ہو اور کریملن یا واشنگٹن کے سیاست دان، اسلامی ممالک کے لیے دستور العمل صادر کریں؟

---

(۱) تیسری دنیا کے ممالک کی ایک بہت بڑی مشکل، استعماریوں کی مسلّط کردہ ثقافتیں ہیں جو ان ممالک کے عوام کی خالص اور مقامی ثقافت کے ساتھ مطابقت نہ رکھنے کی وجہ سے ایک ثقافتی تضاد اور شدید معاشرتی ناہمواریوں کے ظہور کا سبب بنی ہوئی ہیں۔ یہ مانگی ہوئی ثقافتیں بہر حال استعماری نظریات کی تکمیل کا باعث بنتی ہیں اور ان سے اغیار کے مفادات کے تحفظ کے لیے ایک ذریعے کا کام لیا جاتا ہے۔

مسلمانوں کی مشکلات اور موانع کے حل اور انہیں ظالم حکومتوں کے حلقۂ تسلّط سے نکالنے کے لیے اسلامی شہروں اور ملکوں کے علماء کو ایک دوسرے سے بحث و تمحیص اور تبادلۂ خیال کرنا چاہیے۔ (انہیں چاہیے کہ وہ) مسلمانوں کے مفادات کے تحفّظ کی خاطر سینہ سپر ہو جائیں اور مشرق و مغرب کی بیہودہ ثقافت کے بڑھتے ہوئے طوفان کا راستہ روک دیں، جس کا انجام اقوام کی نسل اور کھیتی کی تباہی و بربادی ہے۔ اور اپنے ممالک کے عوام کو مغرب و مشرق کے زرق و برق کے مقابلے میں خود باختگی کے نتائج اور بُرے اثرات سے آگاہ کریں۔ اور لوگوں اور حکومتوں کو استعمارِ نو اور بڑی طاقتوں کی شیطنت کے خطرے سے خبر دار کریں جس نے دنیا میں جنگ اور مسلمان کُشی کی ریت ڈال رکھی ہے۔"

جو ممالک جمہوریت، آزادی اور حقوقِ بشر کے مدّعی ہیں، وہ ان مضبوط ترین حکومتوں میں سے ہیں جو اسلام اور دنیا کے لوگوں کو اس کے آگاہی بخشنے والے اصول کی تبلیغ کے راستے میں رکاوٹیں ڈالتی ہیں، کیونکہ ان کے بے پناہ مفادات اسی صورت میں محفوظ رہ سکتے ہیں کہ دنیا کے لوگ اسلام اور اس کی آزادی بخش اصلیت کے بنیادی اصول سے بے خبر اور غافل رہیں۔

مذکورہ بالا مقاصد کے حصول کے سلسلے میں، عوامی اور اصلاح طلب تحریکوں پر الزامات اور غیر انسانی تہمت تراشیاں، استکبار کی ٹھوس سیاست ہیں، استکباری ہر اُس تحریک کو حقوقِ بشر اور جمہوریت کی مخالف تحریک کہنے لگتے ہیں جو دنیا کی اقوام کو آگاہ کرنے کے لیے ہو، وہ صرف اپنی ہیئتِ حاکمہ کو آزادی اور جمہوریت جیسے الفاظ کے مفاہیم کی شائستہ و سزاوار سمجھتے ہیں، جبکہ وہ فی الواقع حقیقی معنوں میں ہرگز ایسے مسائل کے پابند نہیں ہوتے اور صرف جھوٹ موٹ اور عوام کو دھوکا دینے کے لیے اُن کا سہارا لیتے ہیں اور ہر آزادی طلب اور حق پرست کو بَربَر اور جنگلی کہتے ہیں۔

زیرِ تسلّط ممالک کی تاریخ ایسی روئدادوں سے بھری پڑی ہے کہ ان میں سے ہر ایک ثقافتوں کو مسخ کرنے اور اقوام کے افکار و عقائد میں انحراف اور ان کے تشخّص میں تغیر و تبدل پیدا کرنے کے لیے استعمار کی بے پایاں کوششوں کی نشاندہی کرتی ہے اسی طرح استعماریوں نے مصرفی ثقافت، بیہودگی پسندی اور آسائش پرستی کی اشاعت و ترویج کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا ہے۔

جو حکومتیں یہ چاہتی ہیں کہ اپنے ملک میں بنیادی طور پر وابستگی کے وسائل و ذرائع کا خاتمہ کریں، ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک آزاد اور اپنے آپ پر انحصار کرنے والی قوم کی تشکیل کے لیے مناسب ثقافت اور نظامِ تعلیم و تربیت رکھتی ہوں۔ (۱) اور انہیں اپنی صلاحیتوں کو کھل کر بروئے کار لانے نیز جذبہ خود اعتمادی پیدا کرنے کے لیے سنجیدہ اور مسلسل اقدامات کرنے کی ضرورت ہے تاکہ بیرونی استعمار اور داخلی پٹھو استبداد کی طرف سے ہونے والی برسوں کی مسلسل فکری و روحانی تخریب کاری کے اثرات آہستہ آہستہ زائل اور نیست و نابود ہو سکیں اور استعمار کی جعلی اور گمراہ ثقافت کے کھنڈروں پر ایک ایسی انسانی و خدائی ثقافت کی تعمیر کی جاسکے جو قوم کی حقیقی آرزوؤں اور مصلحتوں پر مبنی ہو۔

۲— نظامِ تعلیم پر کنٹرول اور اس میں نفوذ

ایک مجموعی نقطۂ نظر کے اعتبار سے، نظامِ تعلیم و تربیت کا شمار کسی بھی حکومت کے ارکان میں ہوتا ہے۔ چونکہ ملک کی احتیاج کے تحت طالبِ علم ہی معاشرے کے مستقبل کی باگ ڈور سنبھالتے ہیں، اس لیے نظامِ تعلیم میں ہر طرح کی سرمایہ کاری، حقیقت میں ایک طرح سے ملک کی مستقبل سازی کے لیے کی جانے والی سرمایہ کاری ہی سمجھی جاتی ہے اور قطعی طور پر یہی وجہ ہے کہ تعلیم و تربیت کے معاملے میں استکبار غیر معمولی حساسیت کا اظہار کرتا ہے اور اسے خصوصی اہمیت دینے کا قائل ہے۔

گذشتہ ڈیڑھ سو سال کے عرصے میں جب یورپی اور پھر امریکی استعمار پسندوں کا ایران میں اثر و نفوذ بڑھتا رہا تو وہ ایرانی عوام پر مغربی ثقافت ٹھونسنے کے لئے مختلف انداز میں ہمہ گیر کوششیں عمل میں لاتے رہے۔

رضا خان اور اس کے بیٹے (محمد رضا خان) کے عہدِ حکومت میں، معاشرے اور تدریسی مراکز سے اسلامی ثقافت کو زائل کرنا، پہلوی حکومت کی ثقافت بیزار اور اسلام دشمن

---

(۱) "آزاد ثقافت اور خود انحصاری" کے لیے حضرت امام خمینیؒ کی بار بار کی تاکیدات نے عوام میں یہ نظریہ و جذبہ پیدا کرنے کے لیے عظیم اثرات چھوڑے ہیں، جن کے آثار طویل عرصے میں ظاہر ہوں گے۔ اس سلسلے میں مزید مطالعے کے لیے دیکھیے مؤلف کی ایک اور کتاب "فرہنگِ استقلال"۔

سیاسی پالیسی کا حصّہ تھا، اور اس سلسلے میں مدرسوں اور یونیورسٹیوں کے تدریسی نصاب میں سے "اسلامی علوم" کے حذف اور علماء دینی مدارس اور اہم مذہبی شخصیتوں کو بُرا بھلا کہنے اور ان کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا کرنے میں شدت آگئی۔

پہلوی حکومت نے یہ کوشش کی کہ یونیورسٹی کو حوزۂ علمیہ سے الگ کر دے اور یوں اُسے روحانیت سے خالی کر کے وہاں مغربی تربیت و ثقافت کو فروغ دے کر اسے غیر مذہبی اور بعض اوقات مذہب مخالف) افراد کی پرورش کا مرکز بنادے۔ یونیورسٹی اور حوزۂ علمیہ کی جدائی اور دوری کے نتیجے میں، عوام میں علمائے کرام کی قیادت کا کردار جاتا رہا۔ "اگر یونیورسٹی شروع سے عوام کی خدمت میں ہوتی تو ہم محتاج نہ ہوتے"۔ امام خمینیؒ (۱)

اگرچہ پہلوی خاندان کی سیاہ آمریت کے پورے عرصے میں، سیاست دانوں اور خصوصاً مشہورِ زمانہ علمائے کرام میں سے مرحوم آیت اللہ مدرس اور مرحوم آیت اللہ کاشانی جیسے زعماء عوام کے تاریک اور مایوس دلوں میں امید کی چنگاریاں بھڑکاتے رہے، لیکن جابر و ظالم حکومت کے استبداد اور اس کے کارپردازوں کے جرائم کے پیش نظر یہ امید بخش درخشانیاں مستقل نہ ہو سکیں۔

حالات اسی نہج پر چل رہے تھے کہ آخر کار عوام کے بے دریغ ایثار و کوشش سے رہبر عالی مقام حضرت امام خمینیؒ (قدس سرہ) کی قیادت میں ۲۲- بہمن ۱۳۵۷ھ.ش/۱۹۷۹ء کو عظیم اسلامی انقلاب کامیابی سے ہمکنار ہوا اور اس نے تمام شعبوں میں تبدیلی پیدا کر دی، معاشرے میں خدا کی حاکمیت کا راستہ ہموار ہو گیا، اور خدا کی حاکمیت قبول کرنے کی یہ آمادگی آہستہ آہستہ مختلف شعبوں اور مختلف معاشرتی گروہوں میں سرایت کر گئی- ایران کے اسلامی معاشرے کو اب بھی ایک ہمہ جہت اور ہمہ گیر تحریک کی ضرورت ہے تاکہ معاشرے کے تمام امور سے تقلیدی اور برآمد شدہ نظامِ تعلیم اور ثقافت--- خصوصاً اس کے گمراہ پہلوؤں کا مکمل طور پر خاتمہ کیا جاسکے اور نئی بنیادوں پر ایک ایسا نیا نظامِ تعلیم و تربیت استوار کیا جاسکے جو اسلام اور ایران کے ثقافتی معیارات و شرائط سے مطابقت رکھتا ہو۔

ایران کے موجودہ معاشرے کے تشکیلی عناصر نوجوان ہیں، اور چونکہ ملک کے نوجوان استکبار کی ثقافتی سازش کا پہلا نشانہ بنتے ہیں، اس لیے تدریسی اداروں کی اہمیت اور ان کا

(۱) صحیفۂ نور، ج ۱۲— ص ۱۱۳—

حسّاس کردار بہت کُھل کر سامنے آتا ہے، کیونکہ کسی معاشرے کے نوجوانوں کی روحانی سلامتی یا ان کا انحراف اور گمراہی، اس معاشرے کی سلامتی یا اس کے سقوط و انحطاط سے براہِ راست مربوط ہے۔

اس بناء پر ہمیں چاہیے کہ ہم صحیح تعلیمی و تربیتی منصوبہ بندی اور تبلیغات سے اپنے نوجوانوں کو انسانی و اسلامی نظریات و عقائد کا راستہ دکھائیں۔ کیونکہ اگر ہمارے پاس تعلیم و تربیت کا جدید پروگرام اور لائحہ عمل نہیں ہو گا تو نوجوانوں کے فعّال اور جدّت طلب ذہن کے موافق میدان میں بیج بونے کے لیے غیروں کو بہترین موقع ہاتھ آجائے گا۔ (۱)

خوش قسمتی سے ثقافتی و تدریسی پالیسیوں کی تعیین و توضیح اور بلحاظ عمر و علم جوانوں اور نوجوانوں کے طرح طرح کے معاملات کی منصوبہ بندی کے ضمن میں موثر اقدامات کیے گئے ہیں ہمارے ملک کے مدارس اور یونیورسٹیوں کی موجودہ صورتِ حال کا انقلاب سے پہلے کی صورتِ حال سے موازنہ، ان بعض مثبت تبدیلیوں کی نشاندہی کرتا ہے جو ثقافتی اور علمی شعبے میں کی گئی ہیں، امید ہے یہ تبدیلی اپنی مکمل ترین صورت میں -- ہر سطح کے نظامِ تعلیم اور ثقافتی شعبے کے تمام پہلوؤں کے لیے --مرتّب ہو کر زیرِ عمل آئے گی۔

۳- فساد کی ترویج و اشاعت

استکبار دنیا میں عمومی اور ہمہ پہلو فساد پھیلانے کے درپے ہے۔ کسی معاشرے میں

(۱) ثقافتی انقلاب، اسلامی انقلاب کی اہم ترین تکمیلی خصوصیت ہے۔ اس عالمگیر قانونِ مقدس کی اشاعت و فروغ اور ترویج کے سائے میں، انقلاب کے تمام پہلوؤں کو دوام ملا ہے اور وہ اسلامی اصالت و حاکمیت کی ضمانت بن گئے ہیں۔ وہ ناقابلِ تسخیر رکاوٹ جس نے استکبار کے وحشیانہ حملوں کے آگے بند باندھ دیا ہے، انقلاب کی اسلامی ثقافت کی عظیم قوت ہے۔ ہر معاشرے کی تبدیلیاں اور ان کی تشکیل پذیری بلاشبہ اس معاشرے کی ثقافت سے مربوط ہوتی ہے۔ اجتماعی روابط کا سرچشمہ، اس معاشرے کی ثقافت ہے، اس سے ثقافت کے مخصوص مقام کا اندازہ ہوتا ہے۔ کسی معاشرے میں بھی ثقافتی انقلاب لائے بغیر انقلاب لانا ممکن نہیں۔ عام طور پر انسانوں کے اعمال و افعال زیادہ تر ان کی ثقافت اور مجموعۂ اعتقادات سے متاثر اور وابستہ ہوتے ہیں۔ اسی لیے استعمار اپنی حاکمیت کی بقاء کے لیے، زیرِ تسلط ممالک میں موجود صورتِ حال پر صابر و شاکر ہونے اور جبر و ظلم کو قبول کر لینے کی ثقافت کو فروغ دیتا ہے۔ آزادی کے تحفظ و بقاء کے لیے بھی ضروری ہے کہ لوگوں میں آزاد ثقافت، تشخص اور خودی کے اقدار کے تحفظ، اپنے مفادات کے دفاع اور جبر و استبداد اور اونچ نیچ کے خلاف جد وجہد کا جذبہ پروان چڑھایا جائے۔

اخلاقی و فکری فساد کے مراکز کی تعداد میں جتنا اضافہ ہوتا ہے، وہاں علمی و معاشرتی پیداوار و ترقی اور فکری بلندی میں اتنی ہی کمی آجاتی ہے اور مادہ پرستی کی گھٹیا اور نفسانی ثقافت اس کی جگہ لے لیتی ہے۔ زیرِ تسلّط معاشروں میں ترویجِ فساد کی سازش ایک سست رفتار سازش ہے اور معاشرے کے اربابِ اختیار سنجیدگی سے اس کی طرف توجّہ دیے بغیر اور اس کے مقابلے میں کوئی سدِّ باب کیے بغیر، عام طور پر اس وقت اس کے خوفناک دھچکے سے آگاہ ہوتے ہیں جب وہ انسانی روحوں پر اپنے انتہائی اثرات چھوڑ چکی ہوتی ہے۔ ایسی ہمہ گیر سازش اور اس کی قوتِ تخریب کی کوئی حد نہیں ہوتی، یہ جان نہیں لیتی بلکہ عقل و روح کو تسخیر کرتی ہے، انسانوں کو قتل نہیں کرتی بلکہ انہیں اپنا مطیع اور غلام بنا لیتی ہے اور انہیں جدھر چاہتی ہے، لے جاتی ہے۔ خلاصۂ کلام یہ کہ یہ مخرّب ثقافت، دشمن کے مسلح تصادم سے بھی زیادہ مہلک اور خطرناک ہوتی ہے۔

فساد اور بے شرمی و بے حیائی کے کئی سرچشمے اور کئی بنیادیں ہیں۔ یہ مظہر اس نئی تعریف کے بعد صورت پذیر ہوا جو مغرب نے انسان کے محورِ ہستی کے بارے میں کی اور طرح طرح کی فوجی، اقتصادی اور ثقافتی۔۔۔ شکلوں میں استعمار کے فروغ کے ساتھ ساتھ اس کا یہ بدبخت دُم چھلّا بھی ہر جگہ پہنچ گیا۔

اس مادّی نظریے کے مطابق انسانی مقام اپنے بلند و برتر اور خدائی مشن سے محروم ہو کر حیوانی پستیوں میں گر گیا۔ انسان کی خدا طلب روح "اصالتِ لذّت" کی قربان گاہ کی بھینٹ چڑھ گئی۔ انسان کی دائمی زندگی و ہستی ابدیت سے کم ہو کر مختصر دنیوی مہلت تک محدود ہو گئی اور آخر کار لمحات سے لذّت پرستی و مطلب برآری نے انسانوں کو فساد، منشیات، بے حیائیوں، بے شرمیوں اور پستی و ذلّت کے بھنور میں دھکیل دیا۔

نظامِ سرمایہ داری مصرفی مارکیٹ کو مزید وسیع کرنے، زیادہ سستا خام مال حاصل کرنے اور اس کے نتیجے میں زیادہ منافع حاصل کرنے کے لیے مصرفی مارکیٹ میں زیادہ سے زیادہ وسعت کا محتاج ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر روز انسانی معاشروں اور انسان کے اندرونی حالات کی کیفیات کی تحقیق و تجزیہ و مطالعہ کے ساتھ رائے عامّہ پر جھوٹی ضروریات مسلّط کرتا رہتا ہے۔

دنیا کا موجودہ فساد خواہ اپنی جائے پیدائش یعنی مغرب (۱) میں ہو یا دنیا کے تمام خطّوں میں اسی طرزِ فکر و فہم کا نتیجہ ہے جو وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ علم، ثقافت، فن اور ادب وغیرہ کی صورت اختیار کر گیا ہے اور اپنے مخصوص نظاموں کے قیام سے تمام شعبوں میں فروغ پا چکا ہے۔ منشیات اور بے شرمی و بے حیائی کی ترویج کو اس سراپا انحطاط ثقافت کے خاص مظاہر میں سے سمجھا جا سکتا ہے۔

الف — منشّیات کا مسئلہ

منشیات کے عادی ہونے سے مراد انسان کی وہ جسمانی و نفسیاتی وابستگی ہے جو افیون اور دوسرے نشہ آور مواد سے ہوتی ہے جو انسان کے وجود اور اس کی فطرت کے ناموافق بلکہ اس کے لیے سراسر نقصان دہ ہے۔ نشہ باز شخص کے افکار و خیالات کا واحد محور اس معجون کا اہتمام اور اس کی فراہمی ہے جس سے اس کا پورا وجود وابستہ ہو چکا ہے اور اس کا حتمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہ نیم زندہ مخلوق لاابالی اور معقول اور معنوی زندگی کی حدود و قیود سے آزاد ہو جاتی ہے اور اس کی نظروں میں تمام مظاہرِ حیات بے معنی، لغو اور عارضی ہو کر رہ جاتے ہیں۔

منشیات کا عادی شخص نہ صرف یہ کہ پیداواری صلاحیت سے محروم ہوتا ہے بلکہ وہ ہر قیمت پر سب سے زیادہ ضرر رساں جنس کا صارف بھی ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف اپنی ضرورت کے افیونی اور نشہ آور مواد کے حصول کے لیے اپنی شرافت تک کو قربان کر دینے پر تیار رہتا ہے، بلکہ معاشرے میں کسی طفیلی کی طرح بڑی آسانی سے ہر تخریبی فکر اور سازش کا آلۂ کار بھی بن سکتا ہے۔ اور استکبار کسی گدھ کی طرح معاشرے کی ان گلی سڑی لاشوں کا پتہ چلا لیتا ہے اور ان کے حسّاس ترین کمزور پہلو، جو کردار و تشخص کا نہ ہونا ہے، پر ہاتھ رکھ کر، ان نشہ بازوں سے، بے ارادہ، بے رائے اور بے فکر عناصر کے طور پر طرح طرح کے معاشروں میں

---

(۱) مغرب سے مراد یہاں اور دوسرے مقامات پر جہاں اس کے فکری پہلو اور نظریاتی آثار سے بحث ہے، مغرب کی جامعیت اور دوسرے لفظوں میں "مغربی ثقافت" ہے جو فطری طور پر سیاسی لحاظ سے "مشرقی بلاک" پر بھی محیط ہے۔

اپنے منحوس اہداف تک پہنچنے کے لیے فائدہ اٹھاتا ہے۔ (۱)

ب— فحاشی کا فروغ

استکبار، فساد کی ترویج اور زیرِ تسلّط ثقافتوں کی انسانی قدریں ختم کرنے کے لیے، عیاشی کے اڈے، شراب خانے اور جوُا خانے وغیرہ کھول کر معاشرتی خرابیاں پھیلاتا ہے اور نوجوانوں کو آزادی و ترقی کے نام سے بے شرمی و بے حیائی کی طرف مائل کرتا ہے۔

معاشروں میں مبتذل ثقافت کے اثر اور اس کی ترقی کی نشاندہی کرنے والے واضح مظاہر یہ ہیں: افراد کی زندگی کے ڈھانچے میں تبدیلی، خاندان کی بنیاد کمزور کر دینا اور مبتذل ملبوسات کو ہر معاشرے کے روایتی اور مروجّہ ملبوسات کی جگہ دلانا جو عموماً اس علاقے کی اخلاقی قدروں اور اس کے طبیعی حالات سے ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ روشن خیالی اور ترقی و تجدّد کے نام سے فحاشیوں کی اشاعت اور بے شرمی و بے حیائی کی ثقافت کی تبلیغ، استکباری ثقافت کے منحوس تحائف میں سے ہیں۔

یہ روش جاری تھی کہ اچانک ہم نے اپنے ملک کے شہری معاشروں کا حُلیہ نامانوس ملبوسات سے بدلتا ہوا دیکھا، جنہیں رائج کرنے والے تقی زادہ (۲) جیسے لوگ تھے جو اپنے آپ سے بیگانہ ہو چکے تھے، اپنا تشخص کھو بیٹھے تھے اور اغیار کے افکار و خیالات کے وارث تھے۔ چنانچہ اگر ہم اپنے شہری معاشروں میں رائج ملبوسات پر ایک نظر ڈالیں اور دیہاتیوں یا کردوں، بلوچوں، بختیاریوں اور قشقائیوں جیسی اقوام کے ملبوسات یا مغربی ثقافت کے

---

(۱) عمومی طور پر تیسری دنیا کے ممالک اور خاص طور پر اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد ایران میں مشرقی و مغربی استعمار کی وساطت سے منشیات کا پھیلاؤ اور منشیات کے سمگلروں کے بین الاقوامی گروہوں کی مضبوطی، تسلّط کے دوام اور ان اقوام کے فکری، ثقافتی اور روحانی ذخائر کی بربادی کے لیے اہم ترین مقاصد میں سے ہے۔

(۲) تقی زادہ صدر مشروطیت اور رضاخانی حکومت کے دور میں مشکوک عناصر میں سے تھا، جو مغرب کی دل لبھا لینے والی زرق و برق ثقافت دیکھ کر، عوام کی روایتی ثقافت اور مذہب کی نفی کر کے یورپ کے طور طریقے اور فیشن کے مطابق روشن خیالی کا داعیہ رکھتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا: "اگر ایرانی خوش بختی چاہتا ہے تو اسے سر سے پاؤں تک فرنگی ہو جانا چاہیے۔" وہ ہمیشہ ایران کی ترقی کے واحد راستے کے طور پر اپنی اس رائے کا پرچار کیا کرتا تھا۔

حملے سے دور رہنے والی عورتوں کے روایتی لباس یا اپنے علمائے کرام کے ملبوسات سے ان کا موازنہ کریں تو ہم دیکھیں گے کہ اوّل الذکر میں ماڈل، رنگ، ڈیزائن، لمبائی، چھوٹائی، خالص اور ناخالص جیسی بہت سی پابندیاں اور مسائل ہیں جبکہ دوسرے میں سادگی اور غیر مصنوعی پن ہے جس سے انسان کو آزادی و راحت ملتی ہے اور جو زیادہ تر ہر علاقے کے مخصوص حالات کے مطابق، طبیعی حالات اور جسم کی مطلوبہ سہولتوں سے ہم آہنگی کے پیشِ نظر منتخب کیا جاتا ہے۔

انسان جو اس مادہ پرست دنیا میں بنیادی پر دنیا کا غلام ہے اور جسمانی لذت و بہرہ وری میں آزادی کا متلاشی ہے، عریانی اور پردے کے درمیان رابطہ قائم کرنے کے لیے اپنا تمام فن اور اعلیٰ تخلیقی صلاحیت آزماتا ہے تاکہ اپنے بدن کے جلوؤں اور کشش کی زیادہ سے زیادہ نمائش کر سکے اور جنسِ مخالف میں زیادہ سے زیادہ کشش و اشتیاق پیدا کر سکے۔ کہنا چاہیے کہ صرف عورتوں کا لباس ہی آنکھوں اور بدن میں رابطے کا کام نہیں دیتا بلکہ مردوں کا لباس بھی کچھ ایسا ہی ہے۔

تسلّط پسند حکومتیں فساد کی اشاعت و فروغ کے لیے اپنے تمام وسائل سے فائدہ اٹھاتی ہیں اور زیرِ تسلّط عوام کی خالص ثقافتوں کی نفی کر کے، روحانی ثقافت کی جگہ اقدار دشمن ثقافت کی ترویج سے، عریانی اور بے شرمی و بے حیائی کے نمونے کی تبلیغ کرتی ہیں اور ریڈیو اور ٹیلیویژن سے، ثقافتی تخریب و تضعیف کے ایک ذریعے کے طور پر، ہیجان انگیز اور بے مقصد سیریلز اور تجارتی و گمراہ کن فلمیں نشر کر کے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاتی ہیں۔

۴ــــ قوم پرستانہ نظریات کا القاء

بیسوی صدی میں "قوم" اور "عوام" میں پیدا ہونے والے فرق کے ساتھ "عوام" کا لفظ زیادہ تر ایک سماجی گروہ کی تعیین کے لیے استعمال ہوتا ہے لیکن "قوم" قانونی اور سیاسی لحاظ سے پوری اس آبادی پر محیط ہے جو کسی ملک کی زمینی حدود میں قیام پذیر ہوتی ہے اور یہ قیام تاریخی، زبانی، مذہبی یا اقتصادی وحدت یا مشترکہ اہداف و مقاصد اور مشترک زندگی کے

دوام کا نتیجہ ہوتا ہے۔ (۱)

قرآنی لغت میں "ملت"، مذہب کے معنوں میں ہے:

"ملتِ ابراہیمؑ" یعنی دینِ ابراہیمؑ۔ "ملّتِ مسلمان"، امتِ اسلام کے لیے ایک تعبیر و اصطلاح ہے اور یہاں ملّت کا لفظ اپنے قرآنی معنوں میں استعمال نہیں ہوا۔ ملّت سے مراد انسانوں کا ایک ایسا گروہ ہے جو معیّن اعتقادات کا حامل ہو۔ اس لیے اسلامی ثقافت میں ملّتِ ایران اور ملتِ پاکستان وغیرہ کے کوئی معنی نہیں۔ کیونکہ ممالک کے نام تو جغرافیائی حدبندیوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔

سیاسی لغت میں "ملت" انسانوں کے اس گروہ کو کہا جاتا ہے جو جانی پہچانی سیاسی سرحدوں کے اندر زندگی بسر کر رہے ہوں۔ سیاسی لغت میں لوگوں کا وہ گروہ "ملّتِ ایران" کہلاتا ہے جو شمال میں روس کی سرحد، جنوب میں خلیجِ فارس، مشرق میں پاکستان اور افغانستان کی سرحد اور مغرب میں ترکی اور عراق کی سرحد تک کے علاقے میں رہتا ہے۔

ملت کا یہ نیا معنی و مفہوم انیسویں صدی سے رائج ہوا اور اب تقریباً بین الاقوامی سطح پر سرکاری طور پر جانا پہچانا جاتا ہے۔

اٹھارویں صدی میں نو آبادیات پر قبضہ و حکومت کے معاملے پر یورپ کے استعماری ممالک کے مابین شدید کشمکشوں کا آغاز ہو گیا تھا اور حکومتیں قوت کے حصول اور لوگوں میں مذکورہ حکومتوں کی حمایت کے لیے جذبہ و رغبت پیدا کرنے اور اپنے مخالفین کی سرکوبی کے لیے بڑے زور و شور سے قومیت کے مسئلے کا پرچار کرنے لگیں اور انہوں نے اس پر بہت زور دیا۔ کچھ اس انداز میں کہ انہوں نے قومیت اور اس کے بارے میں تعصّب کو نئی انسانی زندگی کے ایک اصول اور طرح طرح کی اقوام کی تاریخی شناخت کے سلسلے میں ایک گراں بہا امتیازی خصوصیت کی حیثیت سے متعارف کرایا۔

ان واقعات سے پہلے جو چیز انسانی روابط کی بنیاد کا تعین کرتی تھی وہ مذہب اور انسانی ثقافت تھی۔ فکری و مذہبی وحدت انسانی روابط قرار دینے کا ذریعہ بنی ہوئی تھی اور ان میں ربط پیدا کرتی تھی۔ پوری تاریخ میں یہ بات حقیقت بن کر سامنے آئی ہے کہ صرف اسی نوع

(۱) ڈاکٹر علومی، رضا: اصولِ علومِ سیاسی، ۳۲۷

کی وحدت ہوتی ہے جو بہت طویل عرصے تک روابط کی پائداری اور گہرائی کا سبب بنتی ہے اور ایسی کوئی بھی وحدت جو مسلک و مذہب کے چوکھٹے میں نہیں ہے، عارضی، وقتی اور مصنوعی ہوتی ہے۔

اہم مسئلہ ایک ہی وقت میں مذہب کے کردار کو کمزور کرنے اور قوم کی حاکمیت کو تقویت دینے کا ہے، جس سے مذہب عملی طور پر ایک کونے میں جا پڑتا ہے، اپنے معاشرتی کردار سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے اور جغرافیائی سرحدیں لوگوں کو تشخص دینے اور انہیں دوسروں سے ممتاز کرنے کا معیار قرار پاتی ہیں۔

یورپ کی استعماری حکومتوں نے عوام میں تفرقہ ڈالنے، نوآبادیات میں اپنی پوزیشن مضبوط کرنے اور اپنے ہمیشہ کے ہتھکنڈے "تفرقہ ڈالو اور حکومت کرو" پر عمل پیرا ہونے کے لیے ممالک میں نظریۂ قومیت اور اس کی اِصالت کا پرچار کیا۔ اگرچہ یورپ میں مذہب کی حکومت اور اس کا کردار کمزور پڑ چکا تھا، لیکن بہت سے زیرِ تسلّط ممالک خصوصاً مسلمان علاقوں میں اسلام ابھی تک عوامی صفوں میں اثر و رسوخ اور اپنا وجود رکھتا تھا۔ استعمار کے سازشی اور منصوبہ ساز، اسلام اور قومیت پرستی کے مابین ایک انتہائی قریبی رابطہ قائم کرنے کے لیے سرگرمِ عمل ہو گئے۔ یکے بعد دیگرے بہت سی کتابیں اور مقالات شائع ہوئے جن کا مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ اسلام قومیت کا مخالف نہیں ہے۔ حدیث "حُبُّ الوطن من الایمان" (اس حدیث کی صحت یا عدم صحت سے قطع نظر) ایسے موضوعات کے لکھاریوں کی تقریروں اور تحریروں کا ٹیپ کا مصرع بن گئی، کیونکہ وہ یا تو اسلامی لغت میں وطن کے معنوں سے آگاہ نہ تھے یا ایسا ظاہر کرتے تھے۔ حالانکہ ساتویں صدی میں مولانا رومیؒ نے اسی حدیث کے ضمن میں کہا تھا:

این وطن مصر وحجاز و شام نیست
این وطن جایی است کان رانام نیست

(یہ وطن مصر حجاز اور شام نہیں ہے بلکہ اس سے وہ مقام مراد ہے جس کا کوئی نام نہیں) (۱)

(۱) بیسویں صدی میں، عین اس استعماری تحریک کے دورِ عروج میں، مفکرِ اسلام حضرت علامہ اقبالؒ نے بھی اس باطل نظریے کے خلاف کئی تاریخی اشعار کہے (مترجم)

مذکورہ لکھاری یہ ذکر تک نہیں کرتے تھے کہ نظریاتی سرحدیں جغرافیائی و سیاسی سرحدوں سے کسی طرح کا کوئی رابطہ نہیں رکھتیں بلکہ وہ اس حقیقت کو استعماری نظام کے مفادات کی بھینٹ چڑھا دینے اور یہ کہنے پر مصر تھے: "ایرانیوں کو اپنے مفادات کی فکر کرنی چاہیے اور اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ دوسرے کس حال میں ہیں۔" بالکل اسی طرح کہ مصریوں، لبنانیوں اور دوسروں کو بھی ایسا ہی ہونا چاہیے۔

ایسی منطق اور سوچ پوری اسلامی ثقافت سے متصادم ہے۔ لیکن جیسا کہ پیغمبرِ اسلامؐ کا ارشاد ہے: "اِذَا فَسَدَ العَالِم، فَسَدَ العالَم" (جب دانشور فاسد ہو جاتا ہے تو دنیا فاسد ہو جاتی ہے)، اُجرتی، تربیت یافتہ، پٹھو اور اپنے آپ سے بیگانہ لکھاریوں کا ایک گروہ، عوام خصوصاً مسلمانوں کے افکار و روابط پر بُرے اور نامعقول اثرات چھوڑنے میں کامیاب ہو گیا۔

قومیت (نیشنلزم)، بیسویں صدی میں

پہلی عالمی جنگ کے بعد یورپ میں قومیت کا مسئلہ اپنے عروج کو پہنچ کر مذہب کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ اگر پہلی عالمی جنگ میں قومیت کی طرف توجّہ ایک سیاسی چال تھی تو اس کے بعد اسے یورپ میں ایک مذہب و مسلک کے طور پر پیش کیا گیا۔ ہٹلر اور مسولینی اس مسلک کے مبلغین کے طور پر سامنے آئے۔ ہٹلر نے، جو جنگ کے بعد جرمن کے کھنڈرات پر ایک طاقتور حکومت کی بنیاد رکھنا چاہتا تھا، قومیت اور نسل پرستی کو حربہ بنالیا۔ اس نے جرمنی نسل کی برتری اور اس کے خلوص کا نظریہ پیش کیا اور سوچے سمجھے بغیر اپنے نظریے کو یہ نعرہ دیا کہ "دنیا کا نظامِ حکومت اس برتر نسل کے ہاتھوں چلنا چاہیے۔"

نو آبادیاتی ممالک میں قومیت کا پرچار، ان ملکوں میں حکومت کے ثبات و استحکام کے لیے کیا جاتا ہے لیکن جب انقلابی اور آزادی پسند تحریکیں شروع ہوتی ہیں اور پھولتی پھلتی ہیں، تو دوسرے ملکوں میں اس انقلاب کے فروغ کو روکنے کے لیے "قومیت" کا حربہ استعمال کیا جاتا ہے۔

بیسویں صدی میں سلطنتِ عثمانیہ کے زوال اور استعماری نظام کے تدریجی خاتمے کے

بعد مسلمان اقوام یکے بعد دیگرے قومیت کا مرتبہ و مقام پہچانتے لگ گئیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ نئے مرحلے میں مسلمانوں کی خود اعتمادی، قومیت کے معیار پر توجہ اور وطن پرستی پر زور ـــــ خصوصاً عرب ادیبوں کے ذہنوں میں ـــــ غالب آگیا اور مسلمان دانشوروں میں نظریاتی تصادم اور سیاسی کشمکشوں کے آغاز کا پیش خیمہ ثابت ہوا جو اب تک جاری ہیں۔ (۱)

یہ تصادم اس بنیادی تضاد کی وجہ سے ہوا جو نیشنلزم اور اسلام میں ہے، نیشنلزم انسانوں کے کسی خاص گروہ کے حالات و ضروریات سے مربوط قطعی اصولوں کا ایک سلسلہ ہے جبکہ اسلام ابدی و عالمی پیغام ہونے کے ناطے اپنے پیروکاروں میں علم، جہاد اور تقویٰ کے معیار کے علاوہ اور کسی فرق کا قائل نہیں ہے۔ یہ مسئلۂ خاص طور پر عرب قومیت پرستی، پہلی عالمی جنگ کے بعد شدید ہو کر سیاسی میدان میں ایک واضح نظریے کی صورت اختیار کر گیا اور اس کی دو وجوہات تھیں:

پہلی یہ کہ اسکا مقصد وحدتِ عرب تھا جو ایسی کئی قومیتوں کو محیط تھا جو طرح طرح کی خصوصیات کی حامل اور وسیع پھیلے ہوئے علاقوں میں مقیم تھیں۔

یہ ہدف محدود تر تحریکوں مثلاً ترکی، مصری یا شامی نیشنلزم کے مقابلے میں وسیع تر نقطۂ نظر کا نمائندہ تھا لہٰذا اس پر آسانی سے تفرقہ اندازی کا لیبل نہیں لگایا جاسکتا تھا۔ (۲)

دوسری یہ کہ عربیت اور اسلام میں قریبی اور روحانی ربط موجود ہے۔ عرب، اسلام کی تعریف کیے بغیر اپنے تشخص کا بول بالا نہیں کر سکتے، جو صدیوں اور زمانوں سے حیثیت کا پائدار ترین سرچشمہ اور احساسِ وحدت کا طاقتور ترین عامل چلا آرہا ہے۔

اس حقیقت کے پیشِ نظر کہ اسلام پہلے عربوں پر اور ان کی زبان میں نازل ہوا کچھ عرب قومیت پرست اسلام کے معاملے میں حقِ شفعہ کا دعویٰ کرنے لگے ہیں اور اسے سب سے پہلے ایک عربی دین سمجھنے لگے ہیں۔ (۳)

کچھ عرب لکھاری پہلے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اسلام اور عرب نیشنلزم میں کوئی تناقض نہیں اور بالآخر تان اس پر آکر ٹوٹتی ہے کہ وہ اسلام کے عربی تشخص پر زور

(۱) ڈاکٹر عنایت، حمید: اندیشۂ سیاسی در اسلام معاصر، ترجمہ: بہاءالدین خرمشاہی ص ۲۰۰ ـــ

(۲)، (۳) سابقہ ماخذ ـــ

دیتے ہیں۔

یوں واضح ہوا کہ قومیت اور قومیت پرستی (نیشنلزم) کا مسئلہ کہاں سے اور کس شکل میں شروع ہوا اور اب تک اس نے کیا کیا مراحل طے کیے ہیں۔

اسلامی انقلاب کے بارے میں استکبار کی تمام سازشیں اور مخالفتیں، ایران کے اسلامی انقلاب کی خصوصیات اور اس کی خاص اسلامی آئیڈیالوجی کی وجہ سے ہیں۔ کیونکہ اسلام معاشرے اور امتِ اسلامی کے مسائل کے سلسلے میں جغرافیائی سرحدوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ ہر مسلمان کو، دنیا کے ہر گوشے میں، تمام مسلمانوں کے لیے احساسِ ذمّہ داری رکھنا چاہیے، صرف اسی طرح ہی کرۂ ارض کے ایک بلیئن سے زیادہ انسانوں میں اٹوٹ ربط و تعلق کے قیام کا امکان ہو سکے گا۔ مسلمانوں کو تو چاہیے کہ اپنے آپ کو پوری انسانیت کے لیے بھی ذمہ دار سمجھیں، کیونکہ معلّمِ اسلامؐ کا درس یہی ہے کہ خدا کے بندے ہر طرح کی قید و بند اور غلامی و اسیری سے آزاد ہونے چاہئیں اور انجامِ کار قوانینِ الٰہی کی زمین پر حاکمیت ہو۔

حضرت امام خمینی (رحمتہ اللہ علیہ) اپنے ایک بہت جامع بیان میں قومیت، قومیت پرستی اور اسلامی معاشروں میں اس کے بُرے اثرات کے ضمن میں فرماتے ہیں:

"وہ اہم چیز جس نے اسلامی حکومتوں کو عاجز کر رکھا ہے اور انہیں قرآنِ کریم کے سائے سے دور کر رہی ہے، نسل پرستی کا جھگڑا ہے۔ یہ تُرک نسل ہے، اسے نماز بھی تُرکی پڑھنی چاہیے! یہ ایرانی نسل ہے، اس کے حروفِ تہجی کیسے ہونے چاہئیں! وہ عربی نسل ہے، عربیت کی حکومت ہونی چاہیے نہ کہ اسلام کی! یہ نسل پرستی جو حضرات میں فروغ پا رہی ہے، بڑھ رہی ہے اور جسے یہ لوگ اختیار کر رہے ہیں، معلوم نہیں اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ یہ نسل پرستی دیکھنے میں بالکل بچگانہ سا مسئلہ ہے اور یوں لگتا ہے جیسے بچوں کو کھلونے دے رہے ہیں، سربراہانِ حکومت کو بہلایا جا رہا ہے۔ جناب آپ ایرانی ہیں! جناب آپ تُرک ہیں! جنابِ آپ انڈونیشیا کے ہیں! جناب آپ کیا ہیں! جناب آپ کہاں کے ہیں! ہمیں اپنے ملک کا کچھ کرنا چاہیے! یہ لوگ اس اہم اور مرکزی نقطے سے غافل ہیں جو سب مسلمان رکھتے تھے۔ افسوس کہ یہ نقطہ، یہ مرکزی نقطہ مسلمانوں سے لے لیا گیا اور لیا جا رہا ہے اور میں نہیں جانتا کہ اس کا انجام کیا ہو گا۔ اسلام آیا تو اُس نے اسی نسل پرستی پر سرخ قلم کھینچ دیا اور سیاہ

و سفید کے مابین، ترک و عجم کے مابین اور عرب و غیر عرب کے مابین کوئی فرق نہ رکھا اور صرف تقویٰ کو معیار بنایا، خدا ترسی کو، حقیقی تقویٰ کو، سیاسی تقویٰ کو، مادّی تقویٰ کو، روحانی تقویٰ کو معیار یوں مقرر کیا "اِنّ اکرمکم عند اللہ اَتقکم"۔ ترک و فارس کچھ نہیں، عرب و عجم کچھ نہیں۔ اسلام اہم اور مرکزی نقطہ ہے، نسل پرستی کا جھگڑا رجعت پسندانہ ہے۔ حضرات ہمیں رجعت پسند سمجھتے ہیں، لیکن خود ۲۵۰۰ سال پیچھے لوٹتے جا رہے ہیں، ہم رجعت پسند ہیں؟"(۱)

۵— کار آمد افراد اور قوتوں کو اپنی طرف کھینچ لینا

وہ فکر کرنے والی قوتیں، دانشور اور روشن خیال لوگ جو مقامی ثقافت کی اصلیّت کے قائل ہوں، کسی بھی ملک کا حقیقی سرمایہ ہوتے ہیں۔ اسی لیے ہر ملک کے ذمّہ دار اربابِ اختیار کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ اپنے وسائل کا زیادہ سے زیادہ حصّہ کار آمد اور حاصل کردہ صلاحیتوں کی نشوونما پر صرف کریں اور یونیورسٹیوں، اعلیٰ مدارس اور تخصصی تربیت گاہوں کی صورت میں طرح طرح کے ثقافتی، تحقیقی، تکنیکی اور پیشہ ورانہ اداروں کے قیام میں سرمایہ کاری دیں۔ استعماری یہ کوشش کرتے ہیں کہ زیرِ تسلط ممالک میں حتی المقدور بنیادی علوم و حکمت، ترقی یافتہ ٹیکنالوجی اور بنیادی فنون کا گُذر نہ ہونے دیں۔ لیکن وہ ان علوم کے خواہاں طلباء کی ضرورت پوری کرنے کے لئے انہیں اپنے ملک بھجوانے کا اہتمام کرتے ہیں۔ اس طرح انہیں یہ اطمینان بھی ہوتا ہے کہ ان طلبہ کو نہایت سطحی اور معمولی علم کے حصول کے بہت کم مواقع فراہم کیے جارہے ہیں، ساتھ ہی وہ اس طبقے کو، جس نے مستقبل میں اپنے ملک کی باگ ڈور سنبھالنا ہوتی ہے، مکمل طور پر اپنی ثقافتی یلغار کے بُرے اثرات کا نشانہ بھی بنالیتے ہیں۔

سترہویں اور اٹھارویں صدی میں یورپ کے سائنسی انقلاب کے دور میں، قاجاری عہد کا ایران اپنی اُسی حالت میں انتشار و بدامنی کا شکار چلا آرہا تھا اور برطانیہ اور روس کی کمر کے معاشرے کو مستقبل میں درپیش غیر ملکی ماہرین اور متخصّصین کی ضرورت سے بے نیاز کر

(۱) صحیفۂ نور، ج ۱، ص ۸۹—

حکومتوں کے درمیان استعماری سیاست بازیوں کی رقابت کے اصل اکھاڑے میں تبدیل ہو چکا تھا۔

ایران میں جدید مغربی علوم و فنون امیر کبیر کے زمانے سے اور دارالفنون کے قیام سے رواج پذیر ہوئے۔ (۱)

دارالفنون کے قیام میں امیر کبیر کی توجہ جدید علم و فنون پر مرکوز رہی اور بعد کے مرحلے میں فوجی علوم پر— دارالفنون کے قیام کے زمانے میں، ایران میں مغربی سائنسی اصولوں کے بارے میں واضح رُجحان پایا جاتا تھا۔

دارالفنون نے ایک جدید ثقافتی ادارے کی حیثیت میں، ایرانی معاشرے پر تین جہات سے اثرات قائم کیے:

اوّل: عقلی انقلاب: جس کی قدر و قیمت مقدار کے مقابلے میں معیار کے لحاظ سے کئی گنا زیادہ اہم ہے۔

دوّم: مترجمین اور طلبہ کے تعاون سے نئی کتابوں کی تالیف، اس لحاظ سے دارالفنون نے جدید علوم و فنون کی دنیا کی طرف ایک دریچہ کھولا۔

سوّم: وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اس مدرسے کے تعلیم یافتہ لوگوں میں سے ایک نیا طبقہ وجود میں آیا جس میں سے جدّت طلب اور ترقی پسند عناصر اٹھے جنہوں نے آنے والی نسلوں کے فکری انقلاب پر اثر ڈالا۔ اور اس طرح ایرانیوں کا ذہن مغربی تمدّن کے ساتھ پہلے ہی رابطے میں یوں سر گرمِ عمل ہوا کہ اکثر انگریز اساتذہ کو حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔

---

(۱) دارالفنون کا سنگ بنیاد ۱۲۶۶ھ میں قلعۂ سلطنتی کے مشرق میں واقع زمین میں رکھا گیا اور ۵— ربیع الاوّل ۱۲۶۸ھ کو (میرزا تقی خان امیر کبیر کے قتل سے تیرہ دن پہلے) اس کا باقاعدہ افتتاح ہوا۔ دارالفنون کے قیام کے پہلے سال طلبہ کی تعداد ۱۱۴ تھی جو مدرسہ کے سات شعبوں میں زیرِ تعلیم تھے۔ دارالفنون کے بنیادی تعلیمی شعبے یہ تھے:

پیادہ فوج اور سپہ سالاری، توپ خانہ، سوار فوج، انجنیئرنگ، ریاضیات، نقشہ کشی، علمِ معدنیات، علمِ طبعیات، علمِ ادویہ، علمِ کیمیا، علمِ جراحی، تاریخ، جغرافیہ، غیر ملکی زبانیں۔

دارالفنون کے پہلے استادوں کے طور پر سات آسٹرین شہریوں کی خدمات حاصل کی گئیں۔ تکمیل کے لیے کچھ ایسے اساتذہ سے استفادہ کیا جاتا تھا جو انگریز ہوتے تھے اور حکومت کے ملازم تھے، مترجمین کی سرکاری کمیٹی کے لوگ اور کچھ ایسے ایرانی بھی شامل تھے جنہوں نے برطانیہ میں تعلیم حاصل کی تھی۔

امیر کبیر و ایران: فریدون آدمیت ——ص

سر جان میلکم لکھتے ہیں:

"اگر یہی حکومت جو ایرانیوں کی ہے اور، جس کے جھنڈے تلے انہیں زندگی گذارنی ہے، اہلِ علم کی حوصلہ افزائی کرتی اور ان کی فن پرور ذہانت کی تربیت کرتی تو ایرانی لوگ یورپی علوم و فنون میں ہمارے ہم پلّہ ہوتے۔"(۱)

بہر حال دارالفنون ایران کا وہ پہلا تعلیمی ادارہ تھا جہاں جدید علوم و فنون کا آغاز ہوا اور حقیقت میں اسے ایرانی یونیورسٹیوں کی ماں سمجھا جاتا ہے۔

رضاخان کے زمانے میں بھی ایرانی طلبہ کا پہلا گروپ حصولِ تعلیم کے لیے ملک سے باہر روانہ ہوا اور اسی دور میں ایران میں بھی تہران یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا اور طالبعلم مختلف شعبوں میں تعلیم حاصل کرنے لگے۔

اس خیال سے کہ ایسی یونیورسٹیوں کے قیام کی صورت میں جو ایرانی ثقافت کے معیارات سے ہم آہنگ ہوں اور جن میں ترقی یافتہ علوم و فنون سے استفادہ کیا جاتا ہو، کچھ سال بعد ایرانی معاشرہ عملاً مغربی ماہرین اور اساتذہ سے بے نیاز ہو جاتا، اور حقیقت میں معاشرے کی یہ خود کفالت، استعماریوں کے مفادات کو ختم کرنے کے مترادف تھی، اس لیے عالمی استکبار کے مفادات کا یہ تقاضا تھا کہ ایران کو استعماری سائنس اور ٹیکنالوجی سے وابستہ رکھنے کے لیے اس خود کفالت میں رکاوٹ ڈالی جائے اور تعلیمیافتہ قوتوں کو اپنی طرف کھینچ لیا جائے۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ کارروائی محض ایران اور ایرانی صاحبانِ علم تک محدود نہ تھی بلکہ کار آمد اور تعلیم یافتہ فکری قوتوں کو اپنی طرف کھینچنے کی یہ کوشش پوری دُنیا خصوصاً تیسری دنیا کے ممالک میں کی جاتی رہی ہے۔ استکبار کے بنیادی مقاصد بھی یہی دو ہوتے ہیں:-

پہلا یہ کہ روشن خیال افراد کو اپنی جانب کر لے ایسے معاشروں میں ترقی و پیشرفت کی سطح محدود ہی رہے گی۔

دوسرا یہ کہ ان افراد کو اپنے ملک میں منتقل کرکے استعماریوں نے حقیقت میں ایسے لوگوں کو مفت خدمت میں لگا رکھا ہے جنہوں نے دوسروں کے اخراجات اور وسائل کے صرف سے اپنے علمی و تخصّصی مدارج طے کیے ہیں۔ یہ لوگ جو اپنے معاشرے اور مقامی

---

(۱) امیر کبیر و ایران، فریدون آدمیت، ص۱۶۳۔

ثقافت کے تقاضوں سے، استعماری قوتوں کے مقابلے میں کہیں بہتر انداز میں واقف ہوتے ہیں، اپنی پوزیشن کے استحکام کے سلسلے میں نظامِ تسلّط کی مدد کرتے ہیں اور یوں وہ زیرِ تسلّط ممالک کے حسّاس ترین اور اہم علاقوں میں اپنے اہداف و مقاصد حاصل کر لیتا ہے۔

یہ بات مدِ نظر رہنی چاہیے کہ آجکل کی ثقافت میں ترقی پذیر ممالک کی فکری قوتوں کے ترقی یافتہ صنعتی ممالک میں منتقل ہونے کو غلطی سے "ذہنوں کا فرار" کہا جاتا ہے جبکہ حقیقت میں مغرب کی طرف روشن خیالوں اور ماہرین کی اس ہجرت اور نقل مکانی کو "خدمتگاروں اور پٹھوؤں کی نقل مکانی" کہنا چاہیے۔ اگر ہم اپنے ملک یا تیسری دنیا کے تمام ممالک کے تعلیم یافتہ افراد کی ہجرت کے اعداد و شمار کا تجزیہ کریں تو ہمیں پتہ چلے گا کہ ان کی اکثریت بلکہ تقریباً وہ سبھی ایسے لوگ ہیں جنہوں نے یونیورسٹی کی تعلیم یورپ یا امریکہ کے کسی ملک سے حاصل کی ہے، یہ لوگ فارغ التحصیل ہونے کے بعد بھی، ان ممالک کے زیادہ مادّی، ظاہری اور آسائشی وسائل کے پیشِ نظر، عموماً اسی ملک میں کام میں لگ جاتے ہیں جہاں وہ پڑھتے ہیں اور اپنے اصلی وطن کو بھول جاتے ہیں۔ اگر کبھی وہ اپنے وطن کا رخ کرتے بھی ہیں تو محض کسی غیر ملکی سیاّح کی طرح بہت کم عرصے کے لیے اور اپنے احباب اور رشتہ داروں سے ملنے کے لیے۔

دوسرا گروہ وہ ہے جس کے افراد نے اگرچہ تعلیم تو ملک ہی میں مکمل کی ہوتی ہے، لیکن وہ جس یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہوتے ہیں وہاں کا ثقافتی پہلو، وہاں پر غالب فضا، وہاں کا نظامِ تعلیم، اساتذہ اور انتظامیہ، ان سب نے ایک ایسی نامانوس ثقافت کا وہاں مجموعہ سا بنا رکھا ہوتا ہے کہ ایسے نظامِ تعلیم کا فارغ التحصیل انجامِ کار تیسری دنیا کے شہری کی بجائے یورپی یا امریکی زیادہ بن جاتا ہے اور اسی لیے ترقی یافتہ صنعتی ممالک کے آسائشی و مادّی وسائل بڑی آسانی سے انہیں اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ (۱) حالانکہ اگر وہ صاحبِ عقل و فہم

---

(۱) اقوامِ متحدہ کی کانفرنس برائے تجارت و ترقی (UNCTAD) کی ۱۹۷۵ء / ۱۳۵۴ھ ش کی رپورٹ میں ہے:

"تیسری دنیا سے سائنسدانوں، انجینئروں، ڈاکٹروں اور سرجنوں کی ہجرت خوفناک حد تک بڑھ گئی ہے۔ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۰ء تک کے سالوں میں ۵۳ ہزار ماہرین نے امریکہ ہجرت کی ہے۔ ۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۰ء تک ایران میں جتنے سائنسدانوں اور انجینیروں کو نئی ملازمتیں دی گئیں ان میں سے بیس فیصد سے زیادہ لوگ دوسرے ممالک سے امریکہ میں آئے تھے۔ اس تعداد میں سے ۶۹ فیصد لوگوں نے تیسری دُنیا کے ممالک سے ہجرت کی ہے۔"

ہوتے، حقیقی معنوں میں روشن خیالی کا دعویٰ رکھتے اور اپنے معاشرے کے خالص ثقافتی و مذہبی ماحول و حالات کے پروردہ ہوتے تو وہ اپنے معاشرے، قوم اور نظامِ حکومت کی خدمت کو اپنا نصب العین سمجھتے اور مادی و آسائشی وسائل سے بہتر استفادے کے لیے اپنے تمام رابطوں، احساسات و جذبات اور ذمہ داری سے چشم پوشی پر کبھی تیار نہ ہوتے اور اپنے معاشرے کے محروم افراد کی خدمت کے مقابلے میں غیروں کی ملازمت و خدمت کو کبھی ترجیح نہ دیتے۔

اس بناء پر ایسے افراد کی ہجرت کو کسی ملک سے ذہن کا فرار نہیں سمجھا جاسکتا، کیونکہ حقیقت میں ایسا ذہن دوسروں کے افکار و نظریات سے تشکیل پاتا ہے اور بالآخر اسی ثقافت اور اندازِ فکر کی خدمت کے قابل ہے۔ لہٰذا ایسے واقعے کو "ذہنوں کا اِدھر اُدھر ہونا" اور حقیقت میں "ذہنوں کی اپنی حقیقی جائے تربیت کی طرف واپسی" کہنا چاہیے۔

اس سلسلے میں یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ: اگر ایسے دانشمند جو یونیورسٹیوں کے تربیت یافتہ ہیں، اپنے معاشرے کی تہذیب و تمدن کے فروغ کو اپنا مشن سمجھتے تو اب تک ان کی تدبیر و فراست سے وہ تمام مشکلات اور رکاوٹیں ختم ہو چکی ہوتیں، جن کا تیسری دنیا کو سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ لیکن عالم یہ ہے کہ عوام کو درپیش مسائل و مشکلات میں سے جنھیں اصولاً معاشرے کے اخلاق و ثقافت کے مطابق نبٹانا چاہیے، کسی ایک کو بھی ان یونیورسٹیوں کے لوگوں اور پڑھے لکھوں نے تحقیق و توجّہ کا مرکز نہیں بنایا اور اگر کسی مسئلے کا کوئی حل سوچا بھی گیا تو محض اندھا دھند تقلید اور مشرق و مغرب کے انتظامی ڈھانچوں کے اِنہی خشک فارمولوں کا بعینہٖ اجرا ہے جو ایک مختلف معیارات و افکار کے معاشرے کے لیے نہ مفید ہے، نہ اس سے ہم آہنگ، اور نہ کوئی جواز رکھتا ہے۔

دیکھنے میں آتا ہے کہ روزمرہ زندگی کے معمولی مسائل مثلاً شہروں کی صفائی، لوگوں کی ضروریات کی فراہمی اور ایسے ہی دوسرے بیسیوں مسائل کہ وقت گذارنے کے ساتھ ساتھ جن کی اہمیت کا اندازہ کر کے ان کا کوئی حل نکالا جاسکتا تھا، ان کی طرف قطعاً کوئی توجّہ نہیں دی گئی اور نہ ہی ان کا کوئی مناسب حل ڈھونڈا گیا۔

٦— افسروں اور صاحبانِ اقتدار کی تربیت

جیسا کہ ذرائعِ ابلاغ کے حصّے میں بیان کیا گیا ہے، استعمار کی اصلی سرگرمیاں ثقافتی پہلو میں تلاش کرنی چاہئیں۔ عام طور پر طویل مدت کے منصوبے استعمار کے بنیادی ترین منصوبے ہوتے ہیں جنہیں ثقافتی اور سماجی شعبوں میں زیرِ عمل لاکر بنیادی طور پر زیرِ تسلّط معاشروں کی ثقافتوں پر اثرانداز ہونا پڑتا ہے اور ضروری افراد کی تعلیم و تربیت کر کے انہیں زندگی بھر کے لیے اپنے افکار و نظریات کا پابند بنالیا جاتا ہے۔

یہ منصوبے، بچوں کو ابتدائی تعلیم کے زمانے ہی سے گھیرے میں لے لیتے ہیں، بعد میں متوسط اور اعلیٰ تعلیم کے دور میں ثقافتی انجمنوں کے ذریعے اور آخر کار عہدہ و مقام پر فائز ہوتے وقت نائٹ کلبوں، محفلوں، انجمنوں، کلبوں اور فری میسن وغیرہ جیسے اداروں کے ذریعے انہیں مسلسل اپنے زیرِ نظر اور زیرِ اثر رکھا جاتا ہے، کچھ اس طرح کہ ہر دور میں تمام عوامی طبقات کسی نہ کسی طرح استکبار اور اس کے پٹھوؤں کے ثقافتی تسلّط میں رہیں۔

ظاہر ہے کہ ذرائعِ ابلاغ اور مطبوعات کے ذریعے عوام الناس کے لیے جو خصوصی پروگرام جاری کیے جاتے ہیں، وہ بھی اُسی مخرّب کردار کا ایک دوسرا حصّہ ہیں، جس کا پہلے ذکر کیا گیا ہے۔

عام طور پر تیسری دنیا کے ممالک کے اکثر افسران اور اربابِ اختیار مغرب یا مشرق کی یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ یا فارغ التحصیل ہوتے ہیں، بد قسمتی سے ان کی اکثریت اسی ثقافتی نظام سے متاثر ہوتی ہے، جہاں رہ کر اور جس زمانے میں انہوں نے پڑھا ہے اور جب وہ حصولِ تعلیم سے فارغ ہو کر اپنے وطن لوٹتے ہیں تو اسی طرح رسمی یا غیر رسمی طور پر مذکورہ ثقافت کے زیرِ اثر رہتے ہیں اور اسی کی خدمت کرتے رہتے ہیں، اس طرح وہ اپنے دورِ حکومت میں نہ صرف ان کے ساتھ وسیع علمی رابطہ برقرار رکھتے ہیں بلکہ ان معاشروں کے افکار و ثقافت کی نشر و اشاعت کے لیے بلا معاوضہ مبلغین کا کام بھی انجام دیتے ہیں۔

امام خمینیؒ، ایامِ حج کے قریب آجانے کے موقع پر اپنے ایک پیغام میں، مسلمانوں کو بعض ایسے ممالک کے سربراہوں اور اربابِ اختیار کے بارے میں یوں خبردار کرتے ہیں:

"دنیا کے مسلمانوں کو بعض ممالک کے خود فروختہ حکمرانوں کی تربیت، کنٹرول اور اصلاح کی فکر کرنی چاہیے، انہیں کسی نہ کسی طرح اس خوابِ گراں سے بیدار کرنا ہوگا جو خود انہیں بھی اور اسلامی اقوام کے مفادات کو بھی برباد کر رہی ہے، ان پٹھوؤں اور نوکروں کو خبردار کریں اور خود بھی بصیرتِ کامل سے منافقین اور عالمی استکبار کے دلالوں کے خطرے سے غافل نہ رہیں، ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہ بیٹھیں اور اسلام کی شکست اور مسلمانوں کے سرمائے، ذخائر اور نوامیس کی تباہی و بربادی کے منظر کے تماشائی نہ بنے رہیں۔"

مشرق و مغرب کے بڑے بڑے ممالک کی تعلیمی سرگرمیوں کی روش کا ایک جامع تجزیہ، اس مسئلے کی اہمیت کی نشاندہی کرے گا۔ موجودہ دور میں یہ حکومیتں دوسرے ممالک خصوصاً افریقی اور ایشیائی ممالک کے امیدواروں کو ہر سال طرح طرح کے تعلیمی وظائف دے کر، حقیقت میں ان ممالک کے مستقبل کے افسران اور اربابِ اختیار کی تربیت کر رہے ہیں۔(۱) ایسے طلبہ میں سے کچھ فارغ التحصیل ہو کر اپنے ملک واپس آتے ہیں۔ فطری بات ہے اسی گروہ میں سے کچھ لوگ افسری، وکالت، وزارت اور دوسرے عہدوں پر فائز ہوں گے اور عملاً غیر رسمی طور پر انہی معیارات و اقدار کی روشنی میں پالیسیاں جاری کریں گے جو ان کے حصولِ تعلیم کے عرصے میں وہاں کی حکومت نے معاشرے اور کلاس میں ان کے ذہنوں میں ڈال دی ہیں اور وہ (لامحالہ) اُنہی کے مفادات کے محافظ ہوں

---

(۱) حال ہی میں برطانیہ کی کلچرل کونسل کی کامیابیوں کے متعلق ایک خبر میں بتایا گیا ہے کہ دنیا کے ممالک کے حکمرانوں اور سربراہوں میں سے ۳۲ افراد ایسے ہیں جنہوں نے اپنی یونیورسٹی کی تعلیم برطانیہ میں مکمل کی یا برطانیہ کے ثقافتی و تعلیمی اداروں میں تحصیلِ علم میں مشغول رہے ہیں۔ برطانیہ کی کلچرل کونسل ایشیائی اور افریقی ملکوں میں بہت فعّال ہے۔ بطورِ مثال یہ کونسل ہر سال یونیورسٹیوں کے ۵۰۰ تعلیمی وظائف کینیا کے طلبہ کو دیتی ہے۔ حقیقت میں مختلف ملکی امور چلانے والے استعماری ثقافت کے پٹھو اور پروردہ ہوتے ہیں۔

NAJAFI BOOK LIBRARY
Managed by Masoomeen Welfare Trust (R)
Pakistan

گے۔(۱)

یہ بات روس نے افغانستان کے معاملے میں عملاً کر دکھائی ہے۔(۲) ایران میں بھی اس

---

(۱) ایسی علامات موجود ہیں کہ مشرقِ وسطیٰ کے بہت سے ممالک منجملہ ایران "ریڈیکل"۔۔۔۔ایسی اصلاحات میں دلچسپی رکھتے ہیں جو ان کے لیے وسیع پیمانے پر اقتصادی ترقی کا سبب بنیں۔ مثال کے طور پر صرف اتنا ہی کافی ہے کہ ہم ہر سال یورپ اور امریکہ جانے والے ان ممالک کے طلبہ کی بڑھتی ہوئی تعداد پر نظر ڈالیں، جو زیادہ تر تکنیکی علوم کے حصول کے لیے جاتے ہیں۔

۸۶—۱۹۸۵ء میں امریکہ میں غیر ملکی طلبہ کے لحاظ سے تیس ممالک میں سے، مشرقِ وسطیٰ کے سات ممالک سرِ فہرست تھے: ایران (۱۴۲۱۰ طلبہ)، لبنان (۶۹۴۰ طلبہ)، سعودی عرب (۶۹۰۰ طلبہ)، کویت (۳۹۸۰ طلبہ)، اسرائیل (۲۴۸۰ طلبہ)، اور ترکی (۳۶۴۰ طلبہ)۔

اور یہ اس صورت میں ہے جبکہ ستر کی دہائی کے مقابلے میں یہ تعداد بہت زیادہ کم ہو گئی ہے۔ یہ اعداد و شمار بطورِ نمونہ، ان ممالک کے اندر تمام عوامل کو وہی مہارتیں سکھانے کے لیے قومی یونیورسٹیوں کے نظاموں میں ترقی کی نشاندہی کرتے ہیں۔

ایسے منتخب تعلیم یافتہ ماہرین، اپنے اپنے ملکوں کی حکومتوں کی مدد سے منصوبہ سازی کی روش میں کام لیے جانے کی صورت میں، علاقائی اقتصادی ترقی و خوشحالی کے لیے اس تحریک کا فعال مرکز و محور بنتے ہیں۔ وہ بہت جلد باز فوجی مشیروں کے لیے دوسرا راستہ اور ان کی جلد بازانہ تجاویز ظاہر کر سکتے ہیں۔

روزنامہ کیہان— یکم اسفند ۱۳۶۶ھ ش / ۱۹۸۸ء— مجلّہ "Middle east Insight" میں ڈونالڈ — ایل — وولف کے ایک مقالے سے منقول—

خوش قسمتی سے اسلامی انقلاب کی کامیابی کے عظیم آثار میں سے ایک، ملک کے نظامِ تعلیم میں تبدیلی خصوصاً یونیورسٹیوں کے نظام میں وسیع تبدیلیاں ہیں۔ ان میں سے اہم ترین تبدیلی پوسٹ گریجوایشن اور ڈاکٹریٹ کی سطح پر طلبہ کی بیرون ملک روانگی میں کمی اور گریجوایشن کی سطح پر اس کے بالکل خاتمے کے قانون کی منظوری ہے۔

(۲) افغانستان کی حالیہ تبدیلیوں سے تقریباً پندرہ سال پہلے شروع میں ۵۰۰ افغان طلبہ سالانہ یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے روس اور مشرقی بلاک کے ممالک کو بھیجے جاتے رہے، بعد میں یہ تعداد بڑھتے بڑھتے ایک ہزار اور پھر دو ہزار ہو گئی۔ ان تبدیلیوں سے پانچ سال پہلے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے قابل اور سات سال کی عمر کے بچوں کو روس لے جایا جاتا تھا تاکہ شب و روز وہاں رہ کر سکول میں پڑھیں اور شروع ہی سے مارکسی نظریات سے آشنا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان کے پابند ہو جائیں۔ اس وقت بھی تیس ہزار کے لگ بھگ افغانی روس اور دوسرے مشرقی بلاک میں مختلف سطح پر مختلف شعبوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں، یہ ان لوگوں کے علاوہ ہیں جو پہلے روس گئے اور پھر فارغ التحصیل ہو کر واپس افغانستان آ گئے۔

اگرچہ افغانستان میں اسلام کے اثر و رسوخ کی وجہ سے روسیوں کی زیادہ کامیابی نہیں ہوئی لیکن افغانستان پر غالب روس کی پٹھو مارکسی حکومت مشرق کی سپر پاور کی پندرہ سالہ سرمایہ کاری کا براہِ راست نتیجہ ہے۔ مشرقی بلاک میں تدریسی مسائل کے لیے نسبتاً زیادہ سرمایہ کاری کی جاتی ہے۔ اور روس ہر سال بہت سی کتابیں اور کتابچے بہت کم قیمتوں پر دنیا کے دور دراز کے علاقوں میں بھیجتا رہتا ہے تاکہ اس طرح اپنے افکار و نظریات کی برآمد اور ترویج کرے۔

طرح کے مختلف ذہنی وابستگیاں رکھنے والے روشن خیال اور تعلیم یافتہ افراد کی موجودگی کے بہت سے موارد و شواہد ملتے ہیں، جلال آلِ احمد کے الفاظ میں: "ایرانی روشن خیال۔۔۔۔۔۔ سب ایک کارخانہ کی پیداوار نہیں ہیں جیسا کہ ہندوستان یا روس یا چین میں ہے۔ ایرانی روشن خیال دانشوروں کا ہر گروہ کسی نہ کسی فرہنگی وثقافتی اصطبل سے وابستہ ہے۔ ایک گروہ فرانسیسی اصطبل سے، دوسرا اینگلو سیکسن اصطبل سے، تیسرا امریکی اصطبل سے اور اسی طرح۔ ان کی آراء اور ذہنوں کے باہم شیر و شکر نہ ہو سکنے کی سب سے بڑی وجہ بھی یہی ہے۔ (۱)

اصولاً تیسری دنیا کے اکثر ممالک کی بنیادی مشکل یہی ہے کہ لوگوں کی اکثریت بنیادی طور پر بے ثقافت ہے، جو تھوڑے بہت روشن خیال ہیں وہ کسی بیرونی ثقافت سے ثقافتی وابستگی رکھتے ہیں اور وہ ہر دوسرے معاشرے کی خالص اور اصل ثقافت سے بے اعتنائی برتتے ہیں، ورنہ جس کی اپنی کوئی رائے نہیں، وہ روشن خیال نہیں ہو سکتا اور "روشن خیال وہ ہے جو صاحبِ فکر ہو، یعنی سوچنے سمجھنے کا اہل ہو، یعنی پہلے کسی کو صاحبِ فکر و خیال ہونا چاہیے، تاکہ اسے روشن خیال سمجھا جا سکے۔"(۲)

حضرت امامؒ کے ارشادات میں سے کسی سچّے روشن خیال کا فریضہ تلاش کیا جا سکتا ہے۔ آپؒ اپنے ذی الحجہ ۱۴۰۷ھ ق کے پیغام میں حاجیوں سے مخاطب ہو کر یوں یاد دہانی فرماتے ہیں:

"تمام اسلامی روشن خیال دانشوروں کو چاہیے کہ علم و آگہی کے ساتھ سرمایہ داری اور کمیونزم کی دنیا کو دگرگوں کرنے کا نشیب و فراز سے بھرا ہوا راستہ طے کریں اور تمام آزادی پسندوں کو چاہیے کہ وہ روشن بینی اور روشن گری سے تیسری دنیا اور مظلوم اسلامی ممالک کے ستم رسیدہ لوگوں کے لیے یہ راستہ واضح نقش کریں کہ بڑی طاقتوں اور خصوصاً امریکہ کے مُنہ پر تھپڑ کیسے رسید کیا جا سکتا ہے"۔

اگلے حصّے میں ان اداروں کے ظہور اور ان کے کردار کے متعلق کچھ باتیں بیان کی جائیں گی جو "فری میسنری" یا "فراموش خانہ" کے نام سے دنیا بھر میں اور ایران میں سرگرمِ عمل

---

(۱) آل احمد، جلال: در خدمت و خیانت روشنفکران، ص ۸۹۔

(۲) سابقہ مأخذ۔ ص ۲۲۔

رہے ہیں۔

دُنیامیں فری میسنری کا ظہور

صدیاں ہو چلی ہیں کہ دنیا کے بہت سے ممالک میں فری میسنری (معمارانِ آزاد) کے نام سے پُراسرار ادارے مخفی طور پر سرگرمِ عمل ہیں۔ اب بھی، دنیا میں موجود تمام تر آزادی اور جمہوریت کے باوجود، ان اداروں کے صاحبانِ اختیار اُسی طرح رازوں کے بھاری پردے کے پیچھے سے اپنے کام اور منصوبے انجام دے رہے ہیں۔

"میسنز" مخالفین اور اغیار کی باتوں، تنقیدوں بلکہ بُرا بھلا کہنے پر بھی کوئی جواب نہیں دیتے اور مکمل خاموشی سے اپنے ارادوں اور مقاصد کے پیچھے لگے رہتے ہیں اور ان کا اجراء کرتے ہیں۔ وہ اپنے زیرِ اختیار عوامل کی مدد سے مخالف ادیبوں اور مقررین کا صفایا کر دیتے ہیں، یا انہیں معاشرے سے دھتکار دیتے ہیں اور انہیں اہم عہدوں پر فائز نہیں ہونے دیتے۔

"فری میسن" یعنی "معمارانِ آزاد" کے مفہوم کی وجہ تسمیہ کے بارے میں بہت سی توجیہات کی گئی ہیں۔ شاید اس نام کے انتخاب کی وجہ یہ ہو کہ برطانیہ میں فری میسن کا ادارہ شروع میں معماروں اور سنگتراشوں کے ایک گروہ کے ذریعے وجود میں آیا۔

دنیا میں فری میسن کے لاجز کی تاسیس کے بارے میں اب تک پانچ ہزار سے زیادہ کتابیں لکھی جاچکی ہیں یہاں تک کہ فری میسن انسائیکلوپیڈیا اور تاریخی کتابوں میں بھی بہت سی باتیں نقل اور بیان کی گئی ہیں۔

فری میسن اداروں نے ۱۸۸۹ء تک دنیا کے ۹۶ خطّوں میں میسن کے لاجز قائم کر رکھے تھے۔

فری میسنری، ایران میں

فری میسنری، جسے انگریزوں نے ۳۵۰ سال پہلے آزادی، بھائی چارے، مساوات اور انسان

دوستی جیسے دلپذیر الفاظ سے رائج کیا تھا، اٹھارویں صدی کے بعد سے اقوام کے استعمار کا سب سے بڑا ذریعہ بن گئی۔ افریقہ، ایشیا اور مشرقِ وسطیٰ کے ناواقف لوگ جو جہالت و نادانی، ظلم و شقاوت اور ناانصافیوں کے بھنور میں گرفتار تھے، جلد ہی فری میسنری کے ہراول دستوں کے فریب میں آگئے، اور خاص طور پر استعماری سیاست کے اربابِ اختیار، جو اکثر فری میسن تھے، کی مسلسل کوششوں سے ایران کی سرزمین کے کچھ حصے بھی غیروں کے ہاتھ لگ گئے۔ فری میسنز نے، جو استعماری حاکموں کے کردار میں ظاہر ہوئے، ایرانی قومیت کی بنیادیں درہم وبرہم کر دیں، قومی مفاخر کا مذاق اڑایا، بار بار اغیار پرستی کی تبلیغ کی اور اپنے نظریے کو حقیقت کا روپ دینے کے لیے --- ایک عالمی اور بین الاقوامی برادرانہ حکومت کے قیام کی خاطر --- جہاں کہیں بھی انہیں قومی و مذہبی افکار کا سامنا کرنا پڑتا، وہ انہیں ختم کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

ہمیشہ کے لیے قاجاری حکومت و دربار کو اپنے پنجے میں رکھنے کے لیے، انگریزوں نے امیر کبیر کے قتل کے بعد حتی الامکان یہ کوشش کی کہ اپنے پٹھو صدورِاعظم کو برسرِاقتدار لائیں۔ ان صدورِاعظم کو پہلے تو رشوت دے کر اور ان کا بھتّہ مقرر کر کے زیرِاثر لایا جاتا تھا لیکن پھر انگریزوں نے ان سب کو عالمی وطن کے ادارے "فری میسن" میں داخل کر لیا تاکہ وہ مرتے دم تک "اینگلوفل" رہیں اور کبھی آزادی فکر اور وطن پرستی کے جھنجھٹ میں نہ پڑیں۔ اس فرقے میں معمارِاعظم کے نظریات کے اجراء کے لیے اطاعتِ محض اور رازوں کی حفاظت جیسے اصول ملحوظ رکھے جاتے تھے جو انہیں ملنے والے احکامات کی بے چون و چرا اطاعت پر مجبور کرتے تھے۔

اگر ہم ایران کی گذشتہ ڈیڑھ سو سالہ تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالیں تو ہم دیکھیں گے کہ ایران پر اغیار کے تسلّط کے دوران ملک کے جو صدورِاعظم فری میسن نہیں تھے یا تو وہ نشانہ غضب ٹھہرے اور قتل ہو گئے یا کچھ ہی عرصے بعد معزول اور خانہ نشین کر دیے گئے۔

میرزا آقا خان نوری، میرزا حسین خان سپہ سالار، میرزا علی اصغر خان امین السلطان اور میرزا مشیر الدّولہ ان ابتدائی لوگوں میں سے تھے جو انگریزوں کی براہِ راست مدد اور ان کی علانیہ حمایت سے ایران کی صدارتِ عظمیٰ کے منصب پر فائز ہوئے اور سب سے پہلے میسن بھائیوں کے حلقے میں داخل ہوئے۔ نپولین کے دربار میں ایران کا خصوصی سفیر میرزا عسکر

خان اروی افشار وہ پہلا صاحبِ منصب ایرانی ہے جو برطانیہ سے وابستہ فری میسن کارکن بنا۔ برطانیہ میں ایرانی سفیر میرزا ابوالحسن خان ایلچی ایران کا دوسرا فری میسن اور ایران کا دوسرا وزیرِ خارجہ تھا جسے ۳۵ سال حکومتِ برطانیہ سے بھتّہ ملتا رہا۔

ایران میں پہلے غیر ملکی فری میسن لاجز نے جو برطانیہ سے وابستہ تھے، ۱۱۷۹ھ ش/ ۱۸۰۰ء میں، فرانس کے فری میسن لاج نے ۱۸۲۰ء میں کام کرنا شروع کیا اور امریکی لاجز بھی پہلوی خاندان کے دورِ حکومت میں سرگرمِ عمل ہوئے۔

امریکی فری میسنری چونکہ بین الاقوامی میدان میں نووارد ہے، اس لیے ابھی تک زیادہ اثر و رسوخ قائم نہیں کر سکی۔ امریکی فری میسنری دنیا کی بدلتی ہوئی حالت کے پیشِ نظر ایسے ادارے قائم کر کے سرگرمِ عمل ہے، جن کے نام اخلاقی، کوآپریٹو اور میسن نما ہیں۔ ان اداروں میں سے:

۱۔ روٹری کلب

۲۔ لائنز کلب

۳۔ جمعیتِ تسلیح اخلاقی

۴۔ جمعیتِ برادرانِ جہانی

کا نام لیا جاسکتا ہے، یہ چاروں اسلامی انقلاب سے پہلے ایران میں فعّال تھے اور انہوں نے ایرانیوں کی اچھی خاصی تعداد کو اپنے آپ سے وابستہ کر رکھا تھا۔

پہلوی دورِ حکومت میں اکثر وزراء، منصبدار اور ملک کے اہم عہدوں پر فائز افسران، عالمی استکبار سے وابستہ اس ادارے کے رکن تھے اور اجتماعی یا انفرادی طور پر فری میسنری لاجز میں سرگرمِ عمل تھے۔ اسلامی انقلاب کے بعد بہت سے لوگوں کے نام، جنہیں اصطلاحاً "رجال ایران" کہا جاتا تھا، شریف امامی کے گھر سے ملے جو ایران کے فری میسنز کا استادِ اعظم تھا۔ اس سے پہلے بھی کچھ ایسے لوگوں کے نام ان کتابوں اور کتابچوں سے ملے تھے جو مختلف وجوہات کی بناء پر اور بیرونی ممالک خصوصاً برطانیہ اور امریکہ کے مفادات میں تضاد کے نتیجے میں زیرِ زمین یا کھلم کھلا شائع ہوئے (۱)

---

(۱) فری میسنری کا تاریخی پس منظر اور اس سے متعلقہ کچھ دوسرے مطالب اسماعیل رائین کی کتاب "فراموشخانہ و فراماسیونری در ایران" سے لیے گئے ہیں۔ مزید معلومات کے حصول کے لیے مذکورہ کتاب کی پہلی سے تیسری جلد تک سے رجوع کیا جاسکتا ہے جنہیں انتشارات امیر کبیر نے شائع کیا ہے۔

۷— دین کی سیاست سے جُدائی

حالیہ صدیوں میں ایک سازش بڑے وسیع پیمانے پر یورپ سے شروع ہوئی جو عیسائیت کا گہوارہ ہے۔ اور پھر دنیائے اسلام میں سرایت کر گئی۔ یہ "دین کی سیاست سے جُدائی" اور "دین و علم کے مابین تضاد" کا مسئلہ تھا جسے استکبار نے مختلف علاقوں میں مختلف شکلوں اور طرح طرح کے حیلوں بہانوں سے چھیڑا، جس کا نتیجہ سیاست سے لوگوں کی کنارہ کشی، سیاستدانوں کو ان کے حال پر چھوڑ دینے اور کافی حد تک دنیائے عیسائیت میں دین کی گوشہ نشینی کی صورت میں نکلا۔

استکبار کو یہ علم تھا کہ جو چیز ظلم کے مقابلے میں ڈٹ سکتی ہے اور فاسد نظاموں کے خلاف جدوجہد کر سکتی ہے وہ محض دین ہے، چنانچہ اس نے اپنے خلاف اس تحریک کو بے اثر کرنے اور ایک اجتماعی معاملے کے طور پر اس کی نفی کرنے کے لیے، دین کو میدانِ سیاست سے الگ کر دیا اور یہ کہہ کر کہ دین ایک انفرادی معاملہ ہے اور اس کا تعلق باطنی اور اخروی امور سے ہے، اس نے سیاسی امور میں کلیسا اور مذہب کی مداخلت روک دی۔

پندرہویں اور سولہویں صدی میں تو کلیسا نے کبھی کبھی حاکم طبقے کے ظلم کے خلاف اپنے ردِ عمل کا مظاہرہ بھی کیا لیکن دین و سیاست میں علیحدگی کے نظریے سے، کلیسا خود عملی طور پر حکومتی امور میں عوام کی عدم مداخلت کا مبلّغ بن گیا۔

عیسائیت میں بنیادی طور پر روحانی مقام اور دنیوی مقام ایک دوسرے سے الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ بظاہر احکامِ الٰہی کے اجراء میں کلیسا روحانی امور کی جانچ پڑتال کرتا ہے اور دُنیوی مسائل حکومت سے متعلّق ہوتے ہیں۔

ایک عیسائی شخص اپنے دینی فرائض کلیسا کے توسط سے انجام دیتا ہے اور دنیوی لحاظ سے، مشہور قول کے مطابق وہ سیزر کے سامنے جوابدہ ہے۔ (۱) سینٹ پال(۲) کی ایک بنیادی عبارت بیان کرتی ہے کہ:

---

(۱) ڈاکٹر علوی، رضا: اصولِ علومِ سیاسی، مبحث تفکیک دین و سیاست، انتشارات موسسہ، مطالعات و تحقیقات اجتماعی، ص ۴۳

Saint Paul—(۲)

"ہر شخص کو بلند تر قوت کے تابع ہونا چاہیے کیونکہ کوئی ایسی قوت موجود نہیں جسے خدا نے نہ بنایا ہو اور موجود قوتیں خدا نے بنائی ہیں، اور جو کوئی ان قوتوں کے مقابلے میں جنگ کرتا ہے، اس نے گویا ایک ایسے نظام کے خلاف جدوجہد کی، جو منشائے ایزدی کے مطابق ہے۔"

کیتھولک کلیسا کے اس عقیدے پر بعد میں پروٹیسٹنٹوں نے اعتراض کیا۔ لیکن پروٹسٹنٹ مسلک کے ظہور سے پہلے "سینٹ ٹوماڈاکن" (۱) نے تیرہویں صدی میں "شہنشاہ کی قوت کے منشاء ایزدی" ہونے کا نظریہ پیش کیا تھا۔ وہ یہاں تک کہتا ہے کہ پوپ اور شہنشاہ کی کشمکش میں پوپ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے آپ کو شہنشاہ کی دنیوی قوت کا وسیلہ بنا کر پیش کرے۔

حال ہی میں دنیائے عیسائیت میں "نجات دہندہ الٰہیات کی تحریک" کے نام سے ایک تحریک رونما ہوئی ہے۔ (۲) اس کے بانی جو کیتھولک کلیسا کے بلند پایہ

---

(۱) سینٹ ٹوماڈاکن کتاب "شہزادوں کی حکومت" میں لکھتا ہے:

"قوت مطلقاً خدا کی طرف سے عطا ہوتی ہے اور مشیتِ الٰہی بعض کو حاکم اور بعض کو محکوم بنا دیتی ہے، لیکن یہ اقتدار براہِ راست صاحبِ منصب کو تفویض نہیں کیا جاتا بلکہ یہ، قوم کے افراد کے توسط سے تفویض کیا جاتا ہے۔"

یہ فلسفی اپنی ایک اور تالیف "سینٹ ٹوماڈاکن کا مجموعۂ الٰہیات" میں قوم اور شاہ کے مابین اجتماعی معاہدے اور دونوں کی ذمہ داریوں کا نظریہ پیش کرتا ہے۔

(۲) ۱۹۶۰ء کی دہائی شروع ہوتے ہی کلیسا میں اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں، یوں کہ ان اداروں نے اپنے سماجی فرائض کی بجا آوری میں زیادہ توجہ ظاہر کی۔ راہب اور پادری ترقی و پیشرفت اور ماڈرن ہونے کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے اور اس سلسلے میں بہت سی کلیسائی تحریکوں نے جنم لیا۔

ویٹیکن میں دوسری شوریٰ کے انعقاد کے عرصے (۶۵—۱۹۶۱ء) میں توحیدی فضا میں ایک عظیم آزادی و ابتکار نے جنم لیا۔ اس صورتِ حال نے لاطینی امریکہ کے علمائے الٰہیات کے لیے ساز گار حالات پیدا کر دیے تاکہ وہ اس براعظم سے مربوط مسائل کے بارے میں غور و فکر کر سکیں اور ان کا کوئی حل پیش کر سکیں۔

"نجات دہندہ الٰہیات" کا ظہور لاطینی امریکہ میں ہوا اور بہت کم مدت میں، بالخصوص ۱۹۶۷ء میں کلیساؤں کے مسائل کے سلسلے میں بحث اور فیصلوں کے لیے ہونے والی پادریوں کی ملاقات کے بعد اسے کلیسا میں بلند ترین مقام حاصل ہو گیا۔ یوں کہ آجکل کسی نہ کسی طرح غریبوں، محروموں اور نجات و آزادی کا مسئلہ پوپ اور کلیسا کے دوسرے راہنماؤں کی تقریروں میں سے جھلکتا ہے۔

"نجات بخش الٰہیات" کے علماء کی پہلی کانگریس اگست ۱۹۷۵ء میں لاطینی امریکہ میں میکسیکو میں منعقد ہوئی۔ بلاشبہ "نجات بخش الٰہیات" کو لاطینی امریکہ اور کاراٹب کے علاقے میں بے پناہ قوت حاصل ہے، یہاں تک کہ بعض اوقات اسے "لاطینی امریکہ کی شرعیات" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے کیونکہ مذکورہ تحریک نے فی الواقع اسی براعظم میں جنم لیا ہے۔

علماء ہیں یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ کی زندگی سراسر ظلم و ستم کے خلاف جہاد ہے، جبکہ پوپ اور کلیسا اب بھی ظالم حکومتوں کے خلاف جدوجہد سے منع کرتے ہیں، اور عملی طور پر کلیسا حاکم قوتوں کے استحکام اور ان کی کارستانیوں کی توجیہ کا ذریعہ بن کر رہ گیا ہے۔ وہ سیاست میں مداخلت کو کلیسا اور عیسائیت کا فریضہ سمجھتے ہوئے، استعماریوں کے خلاف جدوجہد کو تمام عیسائیوں کا فریضہ سمجھتے ہیں اور ان کے مذہبی کام کا بنیادی مقصد عیسیٰ مسیحؑ کی حقیقی تعلیمات کی طرف رجوع اور محروموں کی دستگیری ہے۔

اگرچہ اس تحریک کا اصلی مرکز اب بھی لاطینی امریکہ ہی ہے لیکن دوسرے ممالک کے حامیانِ کلیسا نے بھی نجات بخش الہٰیات کی تحریک کے مقاصد کے لیے موافق تحریکیں شروع کر دی ہیں۔ عیسائی ممالک میں سے نیکاراگوا وہ واحد ملک ہے جس کی انقلابی حکومت نے حکومت تشکیل دیتے وقت انقلابی پادریوں اور علماء سے فائدہ اُٹھایا ہے اور انہیں وزارتِ خارجہ، وزارتِ تعلیم و تربیت اور وزارتِ ثقافت جیسے اہم مناصب پر فائز کیا ہے۔ عالمی کیتھولک کلیسا اور پوپ نے ذاتی طور پر مذکورہ انقلابی علماء کی سرگرمیوں کی مذمت کی ہے، یہاں تک کہ پوپ جان پال دوم نے انہیں حکومتی و سیاسی امور سے منع کرتے ہوئے یہ دھمکی دی ہے کہ وہ ان کا (مذہبی) لباس اتروا کر انہیں دعا کے انعقاد، اعترافات کے سُننے اور عیسائی معاشرے کے دوسرے مخصوص آداب و رسوم بجالانے کے حق سے محروم کر دے گا۔

مغربی بلاک کے ممالک میں لوگوں کو یہاں تک فساد میں مبتلا کر دیا گیا ہے کہ وہ بنیادی طور پر یہی بُھلائے بیٹھے ہیں کہ وہ دنیا میں کیوں آئے ہیں اور ایک انسان ہونے کے ناطے اس دُنیا میں ان کی کیا ذمہ داری ہے۔ انہیں تو محض زندگی کے مادی پہلوؤں ہی سے سروکار ہے اور حکومتیں بھی مطلقاً عوام کے امورِ زندگی اور مادی مسائل پر توجہ دیتی ہیں۔ لہٰذا حکومت کا معاملہ مکمل طور پر دین سے الگ ہے۔

یوں دین کے نظریات، نقطہ ہائے نظر اور اہداف کو، جو عدل و انصاف اور روئے زمین پر حاکمیتِ الٰہی کے قیام سے عبارت ہیں، مکمل طور پر مسخ کر کے انہیں عملاً کلیسا کے چوکھٹے میں محبوس کر دیا گیا ہے۔

مشرقی بلاک میں آمرانہ اور خدا خلاف حکومتیں قائم کرکے سرکاری طور پر اعلان کیا جاتا ہے کہ دین عوام کے لیے افیون ہے، دین اقوام کی ترقی کا مخرّب و مخالف ہے، اور ایسی ہی اور بہت سی باتیں کی جاتی ہیں۔ (۱)

تیسری دنیا میں بھی عوام، ایک اور صورت میں، سیاسی کردار ادا کرنے سے قاصر ہیں، کیونکہ اکثر حکومتیں وابستہ اور خود غرض ہیں۔ بڑی طاقتوں سے وابستگی اور ان کی غلامی مکمل طور پر موجود ہے، اور فطری سی بات ہے کہ جب حکومتیں ہی ایسی ہوں جن کا اپنا کوئی ارادہ نہ ہو تو ظاہر ہے کہ ان کی قومیں بھی ہر طرح کی آزادی و اختیار سے محروم ہوں گی۔

دنیائے اسلام میں بھی بتدریج اہم مشن انجام دینے اور ذمہ داریاں قبول کرنے کی ضرورت، مسجدوں میں جانے کی حد تک محدود ہو کر رہ گئی، بلکہ ان میں بھی آہستہ آہستہ رسمی اور ادائیگیِ فرض کا پہلو غالب آتا گیا اور وہ معاشرے سے بالکل کٹی ہوئی عبادت گاہوں کی صورت اختیار کر گئیں۔ یہ ایسی عبادت گاہیں بن گئیں جو امتِ مسلمہ کے تقاضوں، اس کے مسائل و مشکلات اور اس پر ہونے والے ظلم و جارحیت سے بالکل کنارہ کش اور لاتعلق تھیں۔ اس طرح استکبار نے تمام معاشروں میں طرح طرح کے حربوں سے، عوام کو میدانِ سیاست سے نکال باہر کیا۔

دنیائے اسلام میں سیّد جمال الدین اسد آبادی (چودھویں صدی ہجری کے اوائل میں) ہی کی ایک ایسی برگزیدہ شخصیت تھی، جنھوں نے محسوس کیا کہ اگر وہ مسلمانوں میں کوئی

---

(۱) یہ امر ذہن نشین رہے کہ یورپ میں برپا ہونے والی تحریکیں اس لیے مخالفِ مذہب تھیں کہ رائج الوقت مذہب ہی فی الواقع خدا، عوام اور توحیدی تعلیمات کے مخالف تھا۔ کیتھولک کلیسا نے کئی صدیوں کی ایذا رسانیوں، تشدد پسندیوں اور ظالم حکومتوں کے ساتھ مخفی اور کھلم کھلا سازباز کی وجہ سے عملی طور پر لوگوں کو اپنے مقابلے میں لاکھڑا کر رکھا تھا۔ عقائد کی چھان پھٹک کرنے والی عدالتوں نے مختلف روشن خیال طبقوں میں یوں وحشت اور خوف و ہراس پھیلا رکھا تھا کہ علمی ترقی کے راستے مسدود کر دیے جاتے اور دانشوروں اور صاحبانِ عقل و خرد کے منہ بند رکھے جاتے تھے، اس لیے ایسی فضا میں ممکن ہی نہیں تھا کہ کسی تحریک کو بظاہر "مذہب"، "کلیسا" اور "خدا" کے نام پر غالب عقائد و نظریات کا مخالف نہ کہا جائے۔ البتہ یہ مذہب عوام کے لیے افیون بھی تھا اور ترقی کا مخرّب و مخالف بھی۔

یورپ کے مخالفِ مذہب روشن خیالوں اور استکباری ثقافت و سیاست کے تربیت یافتہ نام نہاد روشن خیالوں کا باہمی فرق یہی نکتہ تھا کہ وہ اس عیسائیت میں جو اپنی اصلیت بار چکی ہے اور جابر حکومتوں کی مطیع اور آلۂ کار ہے اور اس اسلام میں جو انقلابی اور ظلم کا خاتمہ کرنے والا ہے کسی فرق کے قائل نہیں تھے اور ان دونوں مذاہب کے طبقۂ علماء کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتے تھے۔

تحرک و تحریک پیدا کرنا چاہتے ہیں تو انہیں یہ باور کرانا ہو گا کہ سیاست دین سے علیحدہ کوئی چیز نہیں ہے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے بڑی دلچسپی اور جوش و خروش سے مسلمانوں میں یہ مسئلہ پیش کیا۔

بعد میں استعماریوں نے، مسلمان ممالک میں، دین و سیاست کا رابطہ ختم کرنے کی بہت کوششیں کیں۔ "عِلمانیت" (لادینیت) کے مسئلے کا تانا بانا انہی کوششوں کا حصّہ ہے، جو سیاست سے دین کے الگ ہونے کے معنوں میں ہے۔ (۱)

سیّد جمال الدین اسد آبادی کے بعد، عرب ممالک خصوصاً مصر میں ایسے بہت سے لوگ سامنے آئے، جو قومیت پر زور دیتے ہوئے، قومیت پرستی، عرب ازم، پین عرب ازم کے بھیس میں، سیاست سے دین کی علیحدگی کے نظریے کے پرچار میں لگ گئے۔ ان میں سے گذشتہ سالوں میں انور سادات (ناصر کے بعد مصر کا مقتول صدر) خاص طور پر اس نکتے پر زور دیتا تھا کہ دین مسجد سے متعلق ہے لہٰذا اسے اپنا کام وھیں انجام دینا چاہیے اور اصولاً مذہب کو سیاسی مسائل سے کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہیے۔

سعودی عرب میں وہابی علماء سیاست سے دور رہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ انہیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ کون حاکم ہے، ان کا فریضہ تو بس حاکم کی اطاعت ہے۔ وہ "اولوالامر" کی اطاعت واجب سمجھتے ہیں، ان کے خیال میں "اولوالامر" معاشرے اور حکومت کے سیاسی قائدین ہوتے ہیں، جبکہ حقیقت میں ہمیشہ اور بغیر کسی قید و شرط کے ایسا نہیں ہوتا۔

اسی لیے وہ مسلمانانِ عالم کی ایک اچھی خاص تعداد کو مطمئن کر چکے ہیں کہ حکومتیں اور حکّام جو بھی ہوں اور جو کچھ بھی کریں، ان کی فرمانبرداری اور اطاعت واجب ہے اور عوام کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ ان کے مقابلے میں اٹھ کھڑے ہوں۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ یہ مسئلہ نہ صرف مسلمانوں بلکہ عیسائیوں تک کو بھی باور کرادیا گیا ہے۔ دین و سیاست میں تضاد کے اس مسئلے کی وجہ سے دین اپنے تعمیری کردار سے محروم ہو کر استکباری نظاموں کی توجیہ کے لیے ایک وسیلہ بن گیا ہے۔ اس طرح عملی طور پر دین اور اس کے پیرو کار نہ تو انسانوں کی بھلائی اور انسانی معاشروں کے تکامل، ترقی،

---

(۱) استاد شہید مطہری، مرتضیٰ: پیرامونِ انقلابِ اسلامی، انتشاراتِ صدرا، ص ۵۲
لفظ "عِلمانیت"، Secularism کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔

سربلندی اور آزادی کے لیے مصروفِ عمل نظر آتے ہیں اور نہ ہی غلامی و استحصال کے مقابلے میں اپنا کوئی ردِّعمل ظاہر کرتے ہیں۔ دین اور سیاست، دین اور معاشرے اور دین اور حکومتی نظام کے مابین کوئی ربط نہیں ہے جس کے نتیجے میں حکومتیں مطلق العنانی سے جو چاہتی ہیں، کرگذرتی ہیں۔

دیگر مشاہیر علماء اور دین کی سیاست سے علیحدگی کے مخالفین میں سے شہید مدرّس ہیں۔ (۱) وہ معاصر دور کی نامور سیاسی شخصیات اور رضاخان کے تاریک گھٹن کے دور میں ملک کی سیاست اور طبقہ علماء کے ارکان میں سے تھے، عہدِ مشروطیت کے بعد انہوں نے عوامی نمائندے کی حیثیت سے کئی بار پارلیمنٹ میں خدمات انجام دیں اور اس کے چوتھے دور میں اس کے اکثریتی قائد رہے۔ مدرّس نے رضاخان کی آمریت اور اس کی خود غرضانہ اور مذہب دشمن پالیسیوں کے خلاف، جن کا سبق برطانوی استعمار سے لیا گیا تھا کھلم کھلا جدوجہد شروع کی اور اپنی زندگی کے آخری ایام تک اس کی اور اس کے برطانوی حامیوں کی مخالفت جاری رکھی، یہاں تک کہ آخر کار انہوں نے اپنے سچّے عقیدہ و ایمان کی راہ میں اپنی جان بھی قربان کر دی اور رمضان ۱۳۱۷ھ ش / ۱۹۳۸ء میں کچھ رضاخانی بدمعاشوں کے ہاتھوں

(۱) شہید سید حسن مدرس ۱۲۸۷ھ ق میں اردستان کے ایک نواحی گاؤں میں پیدا ہوئے اور پھر اصفہان کے حوزۂ علمیہ سے تعلیم حاصل کی۔ رضاخان اور انگریزوں نے تحریم تمباکو اور مدرس کی طرف سے ۱۹۱۹ء کے استعماری معاہدے کی مخالفت وغیرہ جیسے معاملات میں کئی بار طبقۂ علماء کے ہاتھوں شکست کھاکر مدرس کے قتل کا پختہ ارادہ کرلیا تھا۔ ۱۳۰۵ھ ش میں کچھ بدمعاشوں سے ان پر قاتلانہ حملہ کرایا گیا، جس میں وہ شدید زخمی ہوئے لیکن ان کی جان بچ گئی۔ مدرس کے قتل میں ناکامی کے کچھ عرصہ بعد انہیں خواف میں جلاوطن کر دیا گیا۔ خواف میں گیارہ سالہ دورِ جلاوطنی کے بعد انہیں کاشمر منتقل کر دیا۔ ۲۶—رمضان ۱۳۱۷ شمسی کو یہ حقیقی عالمِ دین اور قوم کا درد رکھنے والا قابل لیڈر شہید کر دیا گیا۔ مرحوم آیۃ اللہ میرزا حسن شیرازی، جو شیعوں کے مراجعِ تقلید میں سے تھے اور جنہوں نے تحریم تمباکو کا فتویٰ دیا تھا، مدرس کے بارے میں یوں فرماتے ہیں:

"یہ سیّد آلِ رسولؐ اپنے اجداد کی پاکدامنی کا حامل ہے اور کبھی یہ اپنی فہم و فراست میں مجھے حیرت زدہ کر دیتا ہے۔ یہ بہت کم مدّت میں اپنے ہم جماعتوں سے آگے نکل گیا اور منطق، فقہ اور اصول میں اپنے تمام ساتھیوں کا سرخیل بن گیا اور اس کی قوتِ قضاوت کمال کو پہنچی ہوئی ہے جو انتہائی راست بازی اور تقویٰ کی حامل ہے۔"

اس آزادمنش عالمِ دین کی زندگی سے آگاہی کے لیے بہت سی کتابوں سے مدد مل سکتی ہے خصوصاً جو کتابیں دورہ مشروطیت کی شخصیات کے بارے میں لکھی گئی ہیں، ان میں سے حسین مکی کی لکھی ہوئی دو جلدوں پر مشتمل کتاب دیکھیے: "مدّرس قہرمانِ آزادی" از انتشارات بنگاہ ترجمہ و نشرِ کتاب، ۱۳۵۸ھ ش / ۱۹۷۹ء

ایک سازش میں شہید ہو گئے۔

حضرت امام خمینیؒ، حجاج بیت اللہ الحرام کے نام اپنے اہم پیغام میں، تحریک اسلامی کے خاتمے اور دین کی سیاست سے علیحدگی کے نظریے کی تبلیغ کے سلسلے میں جہانخوار امریکہ کی سازشوں کے ایک حصّے پر روشنی ڈالتے ہیں، آپؒ اپنے تاریخی پیغام کے ایک حصّے میں فرماتے ہیں:

"جب ۱۵ خرداد کو ہمارے ملک کے عوام کے اسلام طلب نعرے امریکہ کے کانوں تک پہنچے، جب اس کے پٹھوؤں کے تحفظ و بقاء کو خطرہ لاحق ہوا اور ایران میں پہلی بار امریکہ کا غرور اور اُس کا بڑی طاقت ہونے کا نشۂ اقتدار ٹوٹا اور امریکہ کو علمائے اسلام کے اقتدار و قیادت اور نظامِ عدلِ اسلامی اور آزادی و استقلال کے حصول کی خاطر ایرانی قوم کے فولادی ارادے اور عزم بالجزم کا پتہ چلا، تو اس نے اپنے گاؤدی، وطن فروش اور کمینے نوکر محمد رضا خان کو حکم دیا کہ اسلام طلبی کی وہ آوازیں نیست و نابود کر دی جائیں جو امریکہ کے مقابلے میں آکھڑی ہوئی ہیں، اور ہم سب نے دیکھا کہ ان غدّاروں اور پٹھوؤں نے اس مکروہ حکم کی تعمیل میں لمحہ بھر کی بھی تاخیر نہیں کی اور فرض، آزادی اور عظیم تمدن کے دروازے تک پہنچنے کے نام پر اس قوم کے کُشتوں کے پُشتے لگا دیے اور فیضیہ سے یونیورسٹی تک، یونیورسٹی سے کوچہ و بازار تک اور سڑکوں سے مسجد و محراب تک، ہمارے ملک کے در و دیوار کو ہمارے پیاروں اور خدا و رسولؐ کے پیروکار تکبیر کہنے والے نوجوانوں کے خون سے رنگین کر دیا، اور ان حالات میں کہ جب شاہی حکومت کے جلّاد آزادی کے شجرۂ طیبہ کے پر و بال اور شاخ و برگ نوچ کھسوٹ رہے تھے، تمام جہانخواروں نے بین الاقوامی سطح پر پروپیگنڈے کے طور پر یک آواز شاہ کو متمدن، ترقی پسند اور آزادی طلب اور مسلمانوں کو رجعت پسند اور ان کے اسلامی مطالبات کو ارتجاع سیاہ (تاریک رجعت پسندی) کے طور پر متعارف کرایا۔"

تحریمِ تمباکو کا واقعہ

ایران اور دوسرے اسلامی ممالک میں، دین کی سیاست سے علیحدگی کے معاملے میں سلطنتِ برطانیہ کی ہٹ دھرمی کی ایک اہم وجہ وہ دھچکا تھا، جو علماء کی طرف سے برطانوی مفادات کو خصوصاً تحریمِ تمباکو کے مسئلے میں لگا۔

ناصر الدین شاہ کے تیسرے سفرِ یورپ اور برطانیہ میں اس کے قیام کے دوران، ایک انگریز میجر جیرالڈ ٹالبٹ کے نام، جو اس وقت کے برطانوی وزیر اعظم لارڈ سالیزبوری کے مشیروں اور عزیزوں میں سے تھا، ایرانی تمباکو کی اجارہ داری کے ابتدائی معاملات زیرِ عمل آئے۔ یہ ٹھیکہ یا خصوصی اجازت، ناصر الدین شاہ کی واپسی کے بعد ۲۸ — رجب ۱۳۰۷ھ ق (۱۲۶۹ھ ش) / ۲۰ — مارچ ۱۸۹۰ء کو "رژی" نامی برطانوی کمپنی کو منتقل ہو گئی (۱)

سب سے پہلے جس گروہ نے یہ ٹھیکہ دیے جانے کی مخالفت کی، وہ علماء، روحانیون اور کچھ

(۱) انگریز میجر ٹالبٹ نے ناصر الدین شاہ کو ۲۵ ہزار لیرہ نذر کر کے اور کمپنی کے توسط سے سرکاری خزانے کو ۱۵ ہزار لیرہ سالانہ کی ادائیگی کے عوض ناصر الدین شاہ سے مذکورہ خصوصی اجازت نامہ لے لیا، جس کی رُو سے ممالک محروسہ ایران کے تمام توتون اور تمباکو کی خرید و فروخت اور اندرون ملک اور بیرون ملک اس کے بنانے کے اختیارات پچاس سال کے لیے رژی کمپنی کو مل گئے۔ ساتھ ہی مذکورہ کمپنی نے امین السلطان، کامران میرزا ولیعہد اور تمام بااثر درباریوں کو چار لاکھ تومان رشوت دے رکھی تھی۔

سب سے پہلے جن لوگوں کو اس ٹھیکے کے نقصانات کا احساس ہوا اور جنہوں نے اس کی منسوخی کے لیے تبلیغ شروع کی، ان میں مرحوم سید جمال الدین اسد آبادی، میرزا رضا کرمانی اور استنبول میں متعین ایرانی سفیر حاج محسن خان معین الملک سرِ فہرست تھے۔ ناصر الدین شاہ کا خصوصی معالج ڈاکٹر فوریہ اپنی کتاب "دربار ایران میں تین سال" میں لکھتا ہے:

برطانوی کمپنی نے "یہ ٹھیکہ دو ملین فرانک سے زیادہ کی بھاری رشوت دے کر حاصل کیا ہے اور سچی بات یہ ہے کہ اس کے حصول کے لیے اتنا خرچ کوئی زیادہ نہیں ہے"۔

سید جمال الدین نے سب سے پہلے علمائے ایران کو ایک خط لکھا، پھر مرحوم میرزا محمد حسن شیرازی کے لیے ایک خط سامرا بھیجا اور تحریمِ تمباکو اور اس شرمناک اجازت نامے کے خلاف علماء کے متحدہ اقدام کی درخواست کی۔ سید جمال الدین اسد آبادی، جو بلاشبہ دورۂ مشروطیت کے مجاہد علماء اور منتخب لوگوں میں سے تھے، کے حالاتِ زندگی اور ان کے بلند افکار سے آگاہی کے لیے دیکھیے:

کتاب "سید جمال الدین، اندیشہ ھایِ او": تالیف جناب مرتضیٰ مدرسی چہاردہی، انتشارات پرستو

محبِ وطن ایرانی تھے جو اس امر کو شرعی قوانین کے مخالف اور ملک کی حیثیت و آزادی کے منافی سمجھتے تھے۔

تحریمِ تمباکو کا اقدام، ملکی معاملات میں اغیار کے اثر و رسوخ کے خلاف ایرانی قوم کے تابناک ترین مبارزوں میں سے ہے اور یہ وہ پہلی تحریک ہے جس نے اس علاقے کے لوگوں کو اپنے حق کے حصول کے لیے پُر امید اور استبدادی نظام کے ظلم و ستم کے مقابلے میں مزاحمت اور آزادی طلبی کے لیے تیار کیا۔

ایران کے مذہبی علماء نے ناصر الدین شاہ کو مُنصرف کرنے اور تمباکو کے ٹھیکے کی منسوخی کے لیے بہت کوششیں کیں، یہاں تک کہ حاج میرزا حسن آشتیانی نے، جو تہران کے مشہور علماء میں سے تھے، ناصر الدین شاہ سے ملاقات اور بات چیت کی، لیکن شاہ رژی کمپنی کا ۲۵ ہزار لیرے کا تحفہ قبول کر کے، جو اس کے پہلے سفر اور شاید بعد کے سفرِ یورپ کے اخراجات بھی پورے کرتا تھا، یوں مگن ہو چکا تھا کہ اس نے علماء کی یاد دہانیوں کو کوئی اہمیت نہ دی اور علماء نے مجبور ہو کر مرحوم میرزا محمد حسن شیرازی سے امداد کی درخواست کی جو شیعوں کے مراجعِ تقلید میں سے تھے اور سامرہ میں مقیم تھے، اور میرزا شیرازیؒ نے مشہور اور تاریخی فتویٰ جاری کیا، جو درجِ ذیل ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم "آج سے کسی بھی صورت میں تمباکو اور توتون کا استعمال، امامِ زمانہؑ سے جنگ کے حکم میں ہے" الاحقر محمد حسن حسینی

مرجعِ تقلید کے اسی ایک فتوی سے تمام تمباکو فروشوں نے اپنی دکانیں بند کر دیں، تمام حُقّے اور قلیان اُٹھا دیے گئے یہاں تک کہ شاہی ملازموں اور شاہی حرمسرا کی عورتوں تک نے بھی دخانیات کا استعمال ترک کر دیا۔ (۱)

تحریم کا حکم صادر ہونے کے بعد حکومت نے پہلے ایران میں تمباکو فروشی کی داخلی اجارہ داری منسوخ کر دی، لیکن جب علماء نے مخالفت نہ چھوڑی اور ملک کے تمام علاقوں

(۱) تیموری، ابراہیم: قرارداد ۱۸۹۰ رژی، تحریم تنباکو اولین مقاومت منفی در ایران انتشارات کتابخانہ سقراط، ص ۲۸، ۴۹

میں عوامی غم و غصہ روز بروز بڑھتا گیا اور یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ کہیں ناصر الدین شاہ کی استبدادی حکومت کے خلاف عام بغاوت نہ ہو جائے، تو آخر کار دربار نے ہتھیار ڈال دیے اور رژی کمپنی کو بھاری جرمانہ ادا کر کے مذکورہ شرمناک اجازت نامہ سرکاری طور پر منسوخ کر دیا۔

ایران میں کامیاب و کامران اسلامی انقلاب کے رُونما ہونے سے ہمارے ملک میں دین و سیاست میں جدائی کی سازشی جڑیں حقیقی معنوں میں خشک کر کے رکھ دی گئی ہیں۔ اسلامی جمہوریہ نے یہ اعلان کر کے کہ دین عین سیاست ہے اور سیاست عین دین، استکباری حاکمیت پر اب تک کا سب سے بڑا وار کیا ہے۔ اسی لیے استکبار اپنی پوری قوت سے انقلابِ اسلامی کے مقابلے پر ڈٹ گیا ہے اور مختلف حیلوں بہانوں سے اسے کمزور اور نیست و نابود کر دینے کے درپے ہے۔ (۱)

علم اور دین میں تضاد

اصولاً استکبار کے ہاں دین کی کوئی قدر و قیمت نہیں اور اس نے معاشروں میں توحید کو ماننے والے ادیان کی تباہی اور ان کے خاتمے کے لیے علم اور دین میں تضاد کا مسئلہ پیش کیا اور یہ ظاہر کیا کہ گویا علم کا دین سے کوئی رابطہ نہیں، علم تمام دینی اقدار کی نفی اور تردید کرتا ہے، اور اگر کوئی شخص دیندار ہے تو وہ غیر علمی کام کا مرتکب ہوا ہے۔
استکبار نے تیسری دنیا کے ممالک میں علم اور دین میں تضاد کے نظریے کا اتنا پرچار کیا ہے کہ ایک طالبعلم کی سوچ یہ ہے کہ اگر وہ مادی و سائنسی علوم کا عالم بننا چاہتا ہے اور اسکی یہ تمنّا ہے کہ وہ دنیا میں ایک صاحبِ نظر علمی شخصیت کے طور پر جانا پہچانا جائے تو اسے دین کی قطعی طور پر مخالفت کرنی چاہیے۔ کیونکہ مذہبی ہونا اور دین سے موافقت رکھنا ایک مخالفِ علم شخصیت ہونے کے مترادف ہے۔

---

(۱) اپنے تمام منصوبوں اور سازشوں میں مکمل شکست کے بعد استکبار نے آخر کار اپنی ایک پٹھو حکومت یعنی عراقی حکومت کا سہارا لیا اور اس خیال سے کہ مسلّط کردہ جنگ شروع کر کے اسلامی جمہوریہ کے نظام کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دے گا، بری، فضائی اور بحری راستوں سے اسلامی جمہوریہ پر جارحیت کی۔

پہلے سے طے شدہ سازشوں کے مطابق گذشتہ حکومت کی نرسری اور سکول کی نصابی کتابوں تک میں اس پر زور دیا جاتا تھا، انسانی معاشروں کی ترقی صرف اور صرف انسان کے علم کی مرہونِ منّت متصور ہوتی تھی۔ یونیورسٹیوں میں یہ کیفیت اس حد تک قبول کرلی گئی تھی کہ یونیورسٹی میں اسلامی احکام پر عمل اور فریضۂ نماز کی ادائگی کو رجعت پسندی اور متشددانہ تعصّب سمجھا جاتا تھا۔ ایسی پالیسی اس لیے ٹھونسی جاتی تھی کہ معاشرے کے مستقبل کے افسران کی اکثریت چونکہ یونیورسٹیوں ہی سے نکلتی ہے، اس لیے مستقبل میں ملک کے ذمہ دار افراد کے ہاں دین کی کوئی قدر و منزلت نہ ہو۔

اس طرح بے دین افسروں کی تربیت کرکے، معاشرے میں دین کے کردار کو بتدریج سپردِ طاقِ نسیاں کیا جاتا رہا۔ (۱)

دین و علم میں تضاد کا تاریخی پس منظر پندرہویں اور سولہویں صدی عیسوی تک پہنچتا ہے، جب کلیسا ہر طرح کی علمی ترقی کی مخالفت کیا کرتا تھا۔

ایران کے حوزہ ہائے علمیہ میں، چالیس پچاس سال پہلے بھی مذہبی اسباق کے علاوہ طبیعات، ریاضی اور نجوم وغیرہ کے علوم بھی پڑھائے جاتے تھے۔ یوں کہ مرحوم سید جمال الدین اسد آبادی یورپی ادیب ارنسٹ رینان کی رائے کو، جو دین کو علم کے متضاد سمجھتا تھا، مردود جانتے تھے اور دلیل و استدلال سے اس کے نظریات کی مذمت کرتے تھے۔

آجکل استکبار دوسرے ملکوں پر اپنا تسلّط جمانے کے لیے جو بہترین دلائل و توجیہات پیش کرتا ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ پس ماندہ اقوام اپنے گذشتہ مذہبی مسائل کے پیچھے پڑی ہوئی ہیں اور ان کی پس ماندگی کی اصل وجہ مذہبی امور کی پیروی ہے۔ وہ مختلف علمی شعبوں میں اپنی ترقی کی وجہ امورِ مذہبی سے آزادی و خلاصی قرار دیتے ہیں۔ جبکہ حقیقت میں پس ماندہ ممالک کے ترقی نہ کرنے کی بنیادی وجہ دین (اپنے خالص اور حقیقی معنوں میں) سے غفلت اور اس کی پابندی نہ کرنا ہے۔ کیونکہ دین حصولِ علم پر زور دیتا ہے اور کہتا

---

(۱) تعہد و تخصص یا مکتبی و متخصص کے مابین جنگ، جسے اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد دائیں اور بائیں بازو کی جماعتوں اور خاص طور پر مغرب سے وابستہ لبرلز نے ہوا دی، حقیقت میں اس سازش کی ایک اور شکل تھی۔ یہ سازش اربابِ اختیار اور آگاہ اور انقلابی عوام کی ہوشیاری سے ناکام ہوگئی اور اس طرح آج کی دنیا میں نئی اسلامی تحریک کے خلاف کی جانے والی ایک عظیم اور خطرناک سازش کا خاتمہ ہوگیا۔

ہے: "طَلَبُ العلمِ فریضۃٌ علیٰ کُلِّ مُسلمٍ" (طلبِ علم تمام مسلمانوں پر واجب ہے) لیکن اصولِ دین پر عمل نہ کرنے کے سبب سے ہی ۷۰یا ۸۰ فیصد مسلمان ان پڑھ ہیں۔

اس ضمن میں قرآنِ کریم کا ارشاد ہے:

"یرفع اللہ الذین آمنوا منکم والذین اوتوا العلم درجٰت" (۱)

اللہ تم میں سے ان لوگوں کا مقام بلند کرتا ہے جو ایمان لائے ہیں اور جو لوگ صاحبِ علم ہیں، ان کا مقام بدرجہا بلند ہے۔"

اس طرح اللہ اس آیت میں صاحبانِ ایمان کے لیے درجات کا ذکر فرماتا ہے۔ لیکن صاحبانِ علم کے بارے میں کہتا ہے کہ ان کا مقام بدرجہا بلند ہے۔ اور یہ وہ اہمیت ہے جو قرآن نے علم کے لیے مقرر کر رکھی ہے۔

حضرت امام خمینی (قدس سرہ) اپنے ایک بیان میں اس سازش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، دین و علم کی علیحدگی کے ردّ میں فرماتے ہیں: "ہم استعماری تربیت و ثقافت کے مخالف ہیں، علوم اور مظاہرِ تمدّن کے نہیں۔" (۲)

اس بناء پر اگر اسلامی معاشروں نے ترقی نہیں کی اور اقتصادی و صنعتی اور مجموعی طور پر مادّی لحاظ سے پس ماندہ ہیں تو اس کی حقیقی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اسلام اور اس کے زندگی بخش احکام و تعلیمات پر عمل نہیں کیا، یہ نہیں کہ اس پر عمل کی وجہ سے وہ پس ماندہ رہ گئے ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک طرف علم و دین کی علیحدگی اور دوسری طرف دین و سیاست کی علیحدگی کا پروپیگنڈا اس وقت زور و شور سے کیا جاتا ہے جب دنیا بھر کی تمام علمی و تحقیقی کانفرنسوں میں وسیع پیمانے پر یہ کوشش کی جاتی ہے کہ علوم کے مختلف شعبوں کی تقویت و وسعت کے لیے انسانی علم و حکمت کے رنگا رنگ شعبوں میں ربط و تعلق قائم کیا جائے تاکہ ایک دوسرے کی تقویت کے ساتھ ساتھ انسانی علم میں نئی جہات روشن ہوں۔ یہ بات خود دین کو بے معنی اور علم کو بے مقصد کرنے اور سیاست پر اجارہ داری قائم کرنے کے لیے استکبار کے پہلے سے طے شدہ پروگرام اور سازش کی نشاندہی کرتی ہے۔

---

(۱) سورۂ مجادلہ، آیہ ۱۱—

(۲) صحیفۂ نور، ج ۹، ص ۱۵۸—

فصلِ سوّم: چند جملوں میں

o ---- استعمار ثقافتی چالیں چل کر لوگوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتا ہے کہ ان کے معیارات و اقدار ہی ان کے مرتبہ و مقام کے شایانِ شان اور ان کے ہدف سے ہم آہنگ ہیں، اور صرف یہی اقدار انہیں آج کی ترقی و تمدن تک پہنچاتی ہیں۔

o ---- استعمار خالص اور برتر انسانی اقدار کو بے وقعت اور بیہودہ کہتا ہے تاکہ مغرب کی مصرفی اور گمراہ ثقافت کو ان کی جگہ دلا سکے۔

o ---- عالمی استکبار تمام انسانی اور اصلاح طلب تحریکوں پر حقوقِ بشر، آزادی اور جمہوریت کی مخالفت کا لیبل لگا دیتا ہے، تاکہ ان تحریکوں کا تشخص زائل کرکے، لوگوں کے دلوں میں ان کے لیے نفرت پیدا کر دے اور اپنی بے شرمی و بے حیائی کی ثقافت کو دوبارہ واپس لانے کا امکان روشن کرے۔

o ---- جو حکومتیں چاہتی ہیں کہ اپنے ملکوں سے بنیادی طور پر وابستگی کے ذرائع اور بنیاد کا خاتمہ کر دیں ان کے لیے کوئی مناسب ثقافت و تعلیم نہایت ضروری ہے جس سے وہ ایک آزاد اور خود اعتماد قوم کی تشکیل کر سکیں۔

o ---- پہلوی حکومت نے دینی مدارس اور یونیورسٹیوں کو ایک دوسرے سے الگ الگ کرنے کی بہت کوشش کی۔ اس کی کوشش رہی کہ یونیورسٹی معنویت سے خالی ہو جائے اور غیر مذہبی یا مذہب مخالف افراد کی تربیت کا مرکز بن جائے۔

o ---- نوجوانوں اور جوانوں کی تربیت کے نئے طریقوں اور تعلیم و تربیت کے صحیح پروگرام کے نہ ہونے سے ان کے قابل ذہن استعمار کے بیج بونے کے لیے بہترین اور مناسب ترین کھیتی بن جاتے ہیں اور اس طرح وہ انحراف و گمراہی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

o ---- فساد اور گمراہی کے فروغ کی وسیع سازش رینگتی ہوئی زیرِ عمل آتی ہے اور اس کا نتیجہ دشمن کے ساتھ مسلّح جنگ سے بھی زیادہ خطرناک اور بھاری ہوتا ہے۔

o ---- یورپی حکومتوں نے لوگوں کو ایک دوسرے سے دور کرنے اور نو آبادیات میں اپنی استعماری پوزیشن مستحکم کرنے کے لیے "تفرقہ ڈالو اور حکومت کرو" کا حربہ آزماتے

ہوئے قومیت کے بارے میں تعصب کا پرچار کیا، اس ذریعے سے اپنے مقاصد حاصل کیے اور یوں ہمیشہ کے لیے ہمسایہ اقوام کے ذہنوں میں کینہ و نفرت کا بیج بو دیا۔

o ——— مذہب تمام زمانوں میں لوگوں کے دلوں میں رابطہ برقرار رکھتا تھا، استعمار نے اس کی نفی کر کے نیشنلزم کو اس کی جگہ دلادی اور محبِ وطن روشن خیال کو مذہبی روشن خیال کے مقابلے میں لاکھڑا کیا۔

o ——— عالمی استکبار نوجوان قوتوں کو اپنے دامن میں کھینچ کر، انہیں محدود علوم و فنون سے استفادے کا موقع دے کر، اس جذباتی اور پڑھے لکھے طبقے کو اپنا پٹھو، مطیع اور تابع فرمان بنالیتا ہے جو عام طور پر اپنے وطن واپس جاکر افسر بنتے ہیں یا کسی اہم عہدہ و منصب پر فائز ہوتے ہیں اور یوں وہ ہر ملک کے فیصلے کرنے والے حساس ترین لوگوں کے ذریعے اپنے مقاصد پالیتا ہے۔

o ——— موجودہ اصطلاح میں، ترقی پذیر معاشروں کی فکری قوتوں کی ترقی یافتہ مغربی ممالک میں منتقلی کو "ذہنوں کے فرار" کا غلط نام دیا جاتا ہے، حالانکہ روشن خیال لوگوں کی مغرب کو ہجرت و منتقلی "خدمتگار و پٹھوؤں کا اِدھر اُدھر ہونا" ہے۔

o ——— دین سے سیاست کی علیحدگی کا نظریہ، جو قرونِ وسطیٰ اور اس کے بعد کے کیتھولک کلیسا کے گھناؤنے کردار سے حاصل ہونے والی مغربی سوغات ہے، مغرب زدہ روشن خیالوں اور تعلیم یافتہ لوگوں کے توسط سے اسلامی ممالک منجملہ ایران میں در آیا اور اس طبقے نے متحجر کلیسا کے بے حس مذہب سے اہلِ مغرب کی نفرت کی وجہ سمجھے بغیر ہی اسے آزادی بخش اور روشن کرنے والے اسلام اور مجاہد اور آگاہ علمائے کرام سے مقابلے کے لیے نمونۂ عمل قرار دے دیا۔

o ——— "نجات بخش الٰہیات" (عیسائیت میں) روشن خیال کیتھولک علماء خصوصاً لاطینی امریکہ کے ممالک کے علماء کی طرف سے سامنے آئی۔ وہ حضرت عیسیٰؑ کی حقیقی تعلیمات کی طرف واپسی کی ضرورت کا نعرہ لگاتے ہیں اور اسے دنیا کی محروم اور مستضعف اقوام کے لیے ظلم و ستم کے مقابلے کا واحد راستہ سمجھتے ہیں۔

فصلِ چہارم

اقتصادی چالیں

استکباری نظام کے مجموعی نقطۂ نظر سے اقتصاد، بنیادی مسائل میں سے ہے، یا بنیادی طور پر تحریکوں کا اہم محور ہے۔ حقیقت میں وہ اپنی اقتصادی قوت کو اپنی زندگی اور قوت کی بنیاد سمجھتے ہیں لہذا اپنی اقتصادی قوّت کے قیام اور اس کی حفاظت کے لیے انہیں لازمی طور پر دوسروں کا استحصال کرنا پڑتا ہے۔

ترقی پذیر ممالک اب اس سوال کا سامنا کر رہے ہیں کہ جو سر زمینیں کرۂ ارض کی دولت کے بنیادی ذخائر سے مالامال ہیں، وہاں کی اقوام کی غربت و افلاس کے اسباب و عوامل کیا ہیں؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ کسی ایسے خطّے میں بے شمار انسانی جانیں غربت، بیماری اور جہالت کے بھنور میں پھنسی ہوئی ہوں، جو اصلی اور بنیادی معدنی اور غیر معدنی مواد سے بھرپور ہو؟ اس سلسلے میں ماہرین کے وسیع اور غیر جانبدارانہ مطالعات کا نتیجہ یہ ہے کہ تیسری دنیا کی اقوام کی حد سے بڑھی ہوئی غربت کی بنیادی وجہ، ان ممالک کے ذخائر اور سرمائے کی دنیا کے صنعتی اور سرمایہ دار ممالک کو منتقلی ہے۔

گذشتہ کئی صدیوں کے دوران استعماریوں نے زیرِ تسلّط ممالک کے ذخائر سے استفادے کے لیے وسیع سرمایہ کاریاں کیں اور حاصل ہونے والا منافع اپنے ملک منتقل کر لیا ہے۔ انہوں نے ان ممالک کے باسیوں کو بھی بیگار میں پکڑ کر، دولت و سرمایہ کے تمام پیداواری مراکز، خواہ وہ زمینی ہوں یا زیر زمینی، اور اسی طرح انسانی قوت کا بھی اپنے منافع اور سود کی خاطر آخری ممکن حد تک استحصال کیا ہے۔

اب ہم مزید آگاہی کے لیے، اس ضمن میں استکبار کی اقتصادی پالیسیوں کی مختلف چالوں کا تجزیہ کرتے ہیں۔

۱ ـــــ زیرِ تسلّط ممالک کے اقتصاد کو وابستہ اور واحد پیداواری بنانا

مغرب کی اقتصادی گرم بازاری اور بے حساب دولت کی ایک اہم ترین وجہ، تیسری دنیا کے ممالک پر ایسا اقتصاد ٹھونسنا، جو صرف ایک بنیاد پر استوار ہو، ان کی واحد پیداوار اور ان کے ذخائر کی لوٹ کھسوٹ ہے۔

ترقی پذیر ممالک کا پست معیارِ زندگی، مغربی دنیا کے بلند معیارِ زندگی کا بنیادی ضامن قرار دیا جاچکا ہے اور مغرب نے کئی صدیوں سے جبراً اور مکروفریب سے ایسا غیر مستحکم تناسب برقرار رکھا ہوا ہے۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد استعمار کے دفتری روابط کی جگہ غیر منصفانہ معاہدوں، کسٹمز کے معاہدوں، سیاسی دباؤ اور مالی قید و بند نے لے لی۔ استعماری قوتوں نے جو جنگ کی وجہ سے کمزور ہو چکی تھیں، تیسری دنیا کی اقوام کی آزادی طلب تحریکوں سے مقابلہ کرنے کے لیے، نظامِ استعمار کی شکل میں تبدیلی کر دی جبکہ نظام کے بنیادی ڈھانچے اور ماہیت میں کوئی تغیر و تبدل نہ کیا گیا۔ اس لیے بہت جلد ہی تیسری دنیا کے بلاواسطہ یا بالواسطہ نظم و نسق چلانے اور دیگر ممالک پر قبضہ جمانے کی جگہ شدید مالی کنٹرول نے لے لی۔

تیسری دنیا کی اقوام جو اب کئی صدیوں کی خوابِ غفلت سے بیدار ہو چکی تھیں، ”ترقی پذیر علاقوں سے ترقی یافتہ علاقوں“ کو ہونے والی اموال و ذخائر کی ناجائز منتقلی دیکھ کر اور اس شرمناک اور کھلم کھلا لوٹ کھسوٹ کے مقابلے میں اپنے جائز مفادات کے تحفظ کی خاطر اُٹھ کھڑی ہوئیں، ان کی بیداری مغرب کی استکباری حکومتوں کے روّیے میں تبدیلی کا سبب بنی۔ اب کی بار انہوں نے استعماری روابط برقرار رکھتے ہوئے، نو آبادیات کو آزادی عطا کر دینے کا چکّر دے کر حقیقت میں مالی و اقتصادی استحصال کو اپنی پہلی پالیسیوں کی جگہ دلائی۔

استعماری حکومتوں کا نظریہ تھا، اور اب بھی ان کا یہی خیال ہے کہ ان کی صنعتی و زرعی پیداوار، تیسری دنیا کی ضروریات پوری کرنے کے لیے کافی ہے اور اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ یہ ممالک خود ان اجناس کی پیداوار شروع کر دیں۔ یہ، ترقی پذیر ممالک کی

اقتصادی ترقی کو عالمی مارکیٹ کی ضروریات و احتیاجات کے تابع سمجھتے ہیں، اس لیے ان ممالک کے اقتصاد کو ایسے مواد کی پیداوار کا راستہ دکھاتے ہیں، جس کی، استعماری ممالک کی صنعتوں کو ضرورت ہوتی ہے۔ اسی لیے امریکیوں نے تمام مستکبر استعماریوں کے مقابلے میں، زیرِ تسلّط ممالک کو واحد پیداواری کرنے کے لیے سب سے زیادہ کوشش کی اور اس سلسلے میں نمایاں کامیابیاں حاصل کر کے وہ اپنے سیاسی، فوجی اور ثقافتی تسلّط کو وسعت دے سکے ہیں اور اس کی جڑیں مضبوط کر سکے ہیں۔

حقیقت میں امریکہ کے زیرِ تسلّط اور اس سے وابستہ ممالک اسی ایک پیداوار کے اسیر ہیں، جس کی امریکہ کو ضرورت ہے۔ مثلاً برازیل قہوہ، ارجنٹائن گوشت اور اون، وینزویلا تیل اور بولیوی قلعی کا اسیر ہے، اور انقلاب سے پہلے تک کیوبا کی واحد پیداوار بھی گنّا تھی اور اس لحاظ سے اس ملک، انقلاب اور قومی اقتصاد کو مہلک ضربیں برداشت کرنی پڑیں۔

یہ پالیسی جو جاں بلب واحد پیداواری اقتصاد کی توجیہ کرتی ہے، حقیقت میں قید کر لینے والی وہی مضبوط رسّی ہے جو مالی امپیریلزم کے نظام میں فوجی قبضے کا کردار ادا کرتی ہے اور انقلابی تحریکوں کے وقت اس سے، مزاحم مستضعف ممالک کے لیے سولی کی رسّی کا کام لیا جاتا ہے۔ جیسا کہ حضرت امام خمینی (قدس سرہ) نے یہی بات مختصر لفظوں میں بیان کی ہے:

"اقتصادی وابستگی، سیاسی اور فوجی وابستگی کا سبب ہے۔" (۱)

نکاراگوا کا ملک امپیریلزم کی واحد پیداواری پالیسی کے ٹھونسے جانے کی ایک اور مثال ہے۔ یہ ملک اپنے انقلابِ ۱۹۷۹ء سے پہلے تک سوموزا کے عہدِ حکومت میں مکمل طور پر امریکہ کے زیرِ تسلّط تھا۔ اس کے سرمائے کا واحد منبع اس کی زرعی اور ڈیری کی اجناس تھیں، جسے وہ ترجیحی قیمتوں پر امریکہ کو فروخت کیا کرتا تھا ________ انقلاب کے بعد سانڈنیسٹی حکومت کی پالیسیاں دیکھ کر امریکہ نے نکاراگوا کی برآمداتی اجناس کی خریداری روک دینے کا فیصلہ کر لیا۔ (۲)

---

(۱)— صحیفۂ نور، ج ۱۱، ص ۲۰۴۔

(۲)— اگرچہ سانڈنیسٹی حکومت اپنے دوست ممالک مثلاً ایران وغیرہ سے اپنی اجناس کے خریدار پیدا کر سکتی تھی لیکن راستے کی دوری اور امریکہ کی فوجی رکاوٹیں مثلاً اس ملک کی بندرگاہوں پر دھماکہ خیز سرنگیں وغیرہ جیسے مسائل نے بغیر کسی سردردی کے ان اجناس کی برآمد کو خاصا مشکل بنا دیا تھا اور مرکزی امریکہ کے اس غریب ملک کو اس سے بڑے بڑے نقصانات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

اقتصاد کو محدود کرنے اور صرف ایک جنس یا خاص مادے کی پیداوار کی پالیسی ٹھونسنا تیسری دنیا کی پسماندگی اور غربت کے دوام کی ایک بنیادی وجہ ہے۔ خاص طور پر جبکہ مذکورہ مواد سے وابستہ اجناس کی پیداوار میں صنعتی ممالک کا رنگا رنگ اقتصاد اور ان کا لین دین بھی اس غیر صحت مندانہ روش کے تسلسل میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔

مارشل پروگرام، چوتھی دفعہ ترقی پذیر ممالک کو دیے جانے والے قرضوں اور بلامعاوضہ امداد کی صورت میں دی جانے والی امریکہ کی مالی امداد کا اس کے سوا اور کوئی مقصد نہیں ہے کہ امریکی اشیاء و اجناس کی مانگ اور دنیا کی مالی تسخیر برقرار رہے۔ اس مالی تسلّط کے حفظ و بقاء کے لیے ان ممالک کی صنعتی ترقی میں رکاوٹ ضروری تھی اور پھر ان ممالک کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محتاج رکھ کر اور ان کے اقتصاد کو امریکی قرضوں اور بلامعاوضہ امداد سے وابستہ کر کے ان حکومتوں کی سیاسی قوت بھی امریکی حکومت کے زیرِ اختیار آجاتی تھی۔ (۱)
لاطینی امریکہ کا برِاعظم عظیم معدنی ذخائر، وسیع جنگلات، بے پناہ مویشیوں، مچھلیوں اور دوسرے سمندری جانوروں سے بھرے ہوئے ساحلوں کی وجہ سے دنیا کے امیر ترین علاقوں میں سے ہے، وہ اپنے آپ میں ایک خوشحال معاشرے کو جگہ دے سکتا ہے اور اس معاشرے کے لیے بارونق زندگی فراہم کر سکتا ہے۔ لیکن جس چیز نے اس فطری امر میں خلل اندازی کی ہے وہ ان تمام ممالک کی اقتصادی صورتِ حال ـــــ اور نتیجتہً ان کے سیاسی و سماجی حالات ـــــ ہیں جو براہِ راست مسلط کردہ واحد پیداواری اقتصاد کے موجود حالات کے تابع ہیں۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ ان کے ذخائر بھی غیر ملکی تجارتی کمپنیوں کی تحویل میں دے دیے گئے ہیں، یہی بین الاقوامی مبادلات میں تبدیلیوں کے مقابلے میں ان ممالک کے اقتصاد کے زیادہ حساس ہونے اور اس کے نتیجے میں اس سے زیادہ سے زیادہ وابستگی کا سبب بنا ہے۔
مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے لاطینی امریکہ ابھی تک اپنے اقتصاد کے ابتدائی مرحلے میں ہے اور صنعتی ہونے کے مرحلے تک نہیں پہنچا، جو اقتصادی ترقی کی علامت ہے۔ لیکن اس خطّے کے صنعتی نہ ہونے کے آخر کیا اسباب و عوامل ہیں؟

(۱) ـــ ڈاکٹر بہار، مہدی: میراث خوار استعمار، انتشارات امیر کبیر، صفحہ ۲۶۵۔

استعمار کے دور سے لے کر اب تک، بڑے صنعتی ممالک کی بھاری سرمایہ کاری نے اس برِاعظم میں منافع و مفادات بنا لیے ہیں۔ لاطینی امریکہ کے عظیم قدرتی ذخائر نے غذائی مواد اور خام مال کا بھرپور سرچشمہ صنعتی ممالک کے اختیار میں دے رکھا ہے اور دے رہے ہیں تاکہ وہ ممالک اپنی سرزمینوں میں انہیں بنی ہوئی اشیاء اور اجناس میں تبدیل کر لیں۔

عام طور پر بڑی طاقتوں، امریکی کمپنیوں یا کثیر الاقوامی کمپنیوں نے دنیا کے اس حصّے میں جو سرمایہ کاری کی ہے وہ ریل، بجلی، بندرگاہوں اور بینکوں وغیرہ میں کی گئی ہے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ بڑی طاقتیں ان سرمایہ کاریوں سے، بنیادی سرگرمیوں کے مختلف اور حساس شعبوں پر غلبہ حاصل کر کے قومی اقتصاد پر کس طرح اپنا مضبوط تسلّط جماتی ہیں اور ان ممالک میں وابستہ اور غیر صحت مند اقتصاد پیدا کرتی ہیں۔

اگرچہ اب لاطینی امریکہ بظاہر سیاسی اعتبار سے آزاد اور خود مختار ہے لیکن اقتصادی لحاظ سے ایک نیم نوآبادیاتی خطّہ ہے جس کی برآمدات ابتدائی مواد کی ایک مقررہ تعداد تک محدود ہیں اور یہ مواد بھی غیر ملکی ٹھیکوں کے الجھے ہوئے جال میں پھنسا ہوا ہے۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ نے مرکزی امریکہ اور کارائب کے علاقے کو ہمیشہ اپنا زیرِ اثر علاقہ اور اپنی عظیم تجارتی کمپنیوں کی جولانگاہ سمجھا ہے۔ یہ حکومت اس علاقے میں دخل اندازی کے لیے اپنے آپ کو جن مخصوص ٹھیکہ دارانہ حقوق کی حامل سمجھتی ہے، ان کا انحصار زیادہ تر منتخب برسرِ اقتدار طبقات یا "دوست" حکومتوں پر ہوتا ہے، یہاں تک کہ کسی وقت یہ حکومتیں اپنی قوت سے ظالمانہ طور پر ناجائز فائدہ اُٹھاتی ہیں، یا معاشرتی و اقتصادی جدّت طرازیوں اور جمہوری خواہشات کی شدید مخالفت کرتی ہیں۔ (۱)

ایسی بہت سی مثالیں گنوائی جا سکتی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ امریکہ نے اپنی اقتصادی کوتاہ اندیشی، نظریاتی مفروضات، آزادی پسند تحریکوں کے عدمِ ادراک اور ہر چیز کو مالی مفادات، اجارہ داری اور سرمائے کے پھیلاؤ کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہوئے تیسری دنیا کے ممالک کے اقتصادی، سیاسی اور ثقافتی حالات کو کس طرح تہس نہس کیا ہے۔

---

(۱)— برانٹ، ویلی: جہانِ مسلّح، جہان گرسنہ، ترجمہ: ہرمز ہمایون پور، ص ۲۸۶۔

اس سلسلے میں قرآنِ کریم فرماتا ہے:

"وَمِنَ النَّاسِ مَن یُعجِبُکَ قولہ، فی الحیٰوۃِ الدّنیا و یُشھد اللہ علیٰ مَا فی قلبہ وَھُوَ اَلدُّ الخصام۔ وَاِذَا تَوَلّیٰ سَعٰی فی الارض وَیُھلِکَ الحَرثَ وَالنَّسل وَ اللہ لَا یُحِبُّ الفساد وَاِذا قیل لَھُمُ اتّقِ اللہ اَخَذَتہُ العِزَّۃَ بِالاِثمِ فَحَسبُہُ جَھَنَّم وَ لَبِئسَ المھاد۔"(۱)

"اور کوئی شخص (منافقین میں سے) ایسا بھی ہے جس کی چکنی چپڑی باتیں (اس ذرا سی) دنیوی زندگی میں تمہیں بہت بھاتی ہیں اور وہ اپنی دلی محبت پر خدا کو گواہ مقرر کرتا ہے حالانکہ وہ تمہارے دشمنوں میں سب سے زیادہ جھگڑالو ہے۔ اور جہاں (تمہاری محبت سے) مُنہ پھیرا تو اِدھر اُدھر دوڑ دھوپ کرنے لگا تاکہ ملک میں فساد پھیلائے اور زراعت اور مویشی کا ستیاناس کرے اور خدا فساد کو اچھا نہیں سمجھتا اور جب کہا جاتا ہے کہ خدا سے ڈر تو اسے غرور گناہ پر اُبھارتا ہے۔ پس ایسے (کمبخت) کے لیے جہنّم (ہی) کافی ہے اور بہت ہی بُرا ٹھکانا ہے۔"

۲— قومی اور روایتی اقتصاد کی پراگندگی

ہر انسانی معاشرے کا اپنا ایک مخصوص ڈھانچہ ہوتا ہے۔ اور یہ ڈھانچہ اپنے معاشرے کی آبادی کی تقسیم کی کیفیت، سماجی اداروں اور جغرافیائی اور ثقافتی حالات کی پیداوار ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر ملک کے عوام کے جغرافیائی احوال و اوضاع اور ان کی باطنی خصوصیات کے فرق کی وجہ سے ان کے اقتصاد کی نوعیت اور معیارِ زندگی کی کیفیت مختلف ہوتی ہے اور اس علاقے کے قدرتی وسائل اور مقامی افراد کی طرزِ زندگی اور رسوم و رواج کے پیشِ نظر ایک خاص طرح کے اقتصاد کی تشکیل و ترقی کا امکان ہوتا ہے۔

جو پیداواری منصوبے ملک کے شمال میں قابلِ عمل ہو سکتے ہیں، اگر ملک کے مرکز، جنوب مشرق یا مغرب میں ان پر ہو بہو عمل کیا جائے تو وہ قطعاً کامیاب نہیں ہوں گے، کیونکہ ایران کا شمالی علاقہ ایک خاص آب و ہوا اور ماحول کا حامل ہے جو مرکز یا جنوب میں نہیں ہے۔ شمال کا فراواں پانی، جنوب میں عنقا ہے، اسی لیے شمال میں آبپاشی کے سلسلے میں

---

(۱)— سورۂ بقرہ، آیہ ۲۰۵۔

کوئی مشکل پیش نہیں آتی جبکہ جنوب میں خشک آب و ہوا اور ماحول کی وجہ سے قنات (کاریز، زیرِ زمین نہر) کے نظام سے آبپاشی کی جاتی ہے جو خشک سر زمینوں کی آبیاری کے لیے ایک روایتی اور آزمودہ نظام ہے۔ (۱)

استکبار کی کوشش ہوتی ہے کہ اپنے تمام زیرِ اثر ممالک میں وابستگی کے میزان میں اضافہ کرے تاکہ ان کا قومی اور روایتی اقتصاد تباہ ہو جائے۔ اس لیے تیسری دنیا کے اکثر ممالک میں روایتی کھیتی باڑی کا نظام اور وہاں کی مقامی صنعتیں ختم ہو گئی ہیں اور ان کی جگہ در آمد شدہ مصرفی نظام نے لے لی ہے۔

"ایران میں میرزا تقی خان امیر کبیر کی صدارتِ عظمیٰ کے زمانے تک مرکزی حکومتیں اقتصادی سیاست اور اقتصادی منصوبہ بندی کے لیے ضروری بصیرت سے محروم تھیں۔ امیر کبیر نے اپنی اقتصادی سیاست کی بنیاد قومی اقتصاد کی حمایت پر رکھی۔ اس کے اقتصادی افکار کا نچوڑ یہ تھا کہ داخلی صنعت ترقی کرے، ایران کی بر آمدات میں اضافہ ہو، ملک میں انگریزی اجناس کی مانگ کم ہو، وگرنہ ایران اسی طرح غیر ملکی اشیاء کو استعمال کرنے والا ملک بنا رہے گا۔ نہ اقتصادی قوت حاصل کرے گا اور نہ اس کے نتیجے میں سیاسی لحاظ سے اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے گا۔

اسی لیے میرزا تقی خان کی اقتصادی سیاست کا عمومی پہلو روس اور برطانیہ کی اقتصادی رقابت اور تجارتی آزادی کے خلاف تھا۔ غیر ملکی تجارت کی بنیاد آزادیِ تجارت پر رکھی گئی تھی۔ جبکہ یہ صورتِ حال ایرانی اقتصاد کی طبعی ترقی کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ اس کی سیاسی شکست اور روس اور برطانیہ کے سرمایہ داری نظام کے ٹھونسے جانے کی وجہ سے تھی، جس کی

---

(۱)— قنات (کاریز)، بے آب زمینوں کی آبیاری کا نظام ہے اور شاید یہ ان سب طریقوں میں سے بہترین ہے جو انسان نے ایسے علاقوں میں ہزاروں سال زندگی گزار کر دریافت کیے ہیں اور ان سے استفادہ کیا ہے۔ ایران میں ایسی قناتیں موجود ہیں جن کی لمبائی ۰، کلومیٹر تک ہے یعنی اپنے سرچشمے سے لیکر آبپاشی کی جگہ تک ان کا فاصلہ ۰، کلومیٹر ہے۔ اس طرح پانی کو روایتی طریقے سے قنات کے ذخائر سے مناسب جگہ پر لایا جاتا ہے اور اس سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ اس نظام کو اس طرح مرتب کیا جاتا ہے کہ سارا سال ایک خاص مقدار میں آبپاشی ہوتی رہتی ہے۔ بد قسمتی سے گذشتہ حکومت سے وابستہ اقتصاد نے گہرے اور نیم گہرے کنوئیں کھدوائے جس سے بہت سی قناتوں کو نقصان پہنچا، وہ تباہ ہو گئیں اور ان کا پانی خشک ہو گیا۔ مقامِ مسرت ہے کہ اس انقلاب کے بعد "جہادِ سازندگی" نے بہت سی قناتوں کی ازسرِ نو کھدائی کر کے انہیں دوبارہ قابلِ استعمال بنا دیا ہے۔

بنیاد ترکمانچای کے معاہدے (۱۲۴۲) پر تھی جس کی رو سے طے پایا تھا کہ "ایران اور روس، دونوں حکومتیں اپنے متبعین کو ان تمام منافع اور فوائد سے بہرہ مند کریں گی جو تجارتی آزادی سے حاصل ہوتے ہیں۔" اس کے بعد برطانوی حکومت نے بھی "دولتِ کاملۃ الوداد" کی بنیاد پر اور عثمانی حکومت نے بھی "معاہدۂ ارزنۃ الروم" کی بنیاد پر انہی مراعات سے فائدہ اٹھایا۔"(۱)

ایران کا غیر صحت مند اقتصاد، خصوصاً غیر ملکی اجناس پر ملک کے دروازوں کا کھلا ہونا، ایرانی سونے کے باہر نکل جانے کا سبب بنا۔ کیونکہ یورپی اجناس کی خریداری کے لیے صرف سونا ہی، زرِ مبادلہ بنتا تھا۔ امیر کبیر نے سونے کی برآمد کی ممانعت کردی لیکن ترکی اور ہندوستان کے راستے اس کی سمگلنگ جاری رہی۔

قاجاری دور کے اواخر اور پھر پہلوی حکومت کے زمانے میں ایران کے روایتی اقتصاد کی تباہی و بربادی کی رفتار اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ یہاں تک کہ اسلامی انقلاب سے پہلے ایران کی زراعت تقریباً ختم ہو کر رہ گئی اور گندم اور دوسری غذائی اجناس ایران کی بنیادی درآمدات بن گئیں۔

ایران مغربی ممالک کی اشیاء کی مصرفی مارکیٹ کی حیثیت میں اپنی ضرورت کی تمام چیزیں درآمد کرتا تھا اور صنعتی ہونے کے نام پر زیادہ تر غیر ضروری اور ملک میں اسمبل ہونے والی صنعتیں لگا کر کسانوں کو شہروں میں کھینچ رہا تھا۔ وہ لوگ حکومتوں کی بے توجہی سے کھیتوں اور دیہاتوں میں کام جاری رکھنے کو ناممکن پا کر اپنا گھر بار چھوڑ کر شہروں کو سدھار گئے اور وہاں اکثر معمولی کاموں اور خوانچہ فروشی میں لگ گئے۔ دستکاریاں، یہاں تک کہ ایران کی قالین سازی کی صنعت بھی جسے عالمی شہرت حاصل ہے، اس سازش سے محفوظ نہ رہ سکی۔ شاہ کی حکومت کے آخری دنوں میں قالینوں کی برآمد میں بھی غیر معمولی کمی آگئی اور اس پر جمود طاری ہو گیا۔

استعمار نے بھی ان حالات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھایا اور تیل اور ہمارے قومی ذخائر کو لوٹا اور اس کے بدلے میں ایران کو مصرفی اشیاء اور غذائی مواد فراہم کیا۔ خوش قسمتی سے انقلاب کے بعد اقتصادی خود کفالت کے حصول اور قومی اقتصاد، زراعت اور مقامی صنعتوں

(۱)— آدمیت، فریدون: امیر کبیر و ایران، ص ۳۵۳۔

کی حمایت کے سلسلے میں بہت سی کوششیں کی گئی ہیں اور مسلّط کردہ جنگ میں پھنس کر بھی "جہاد سازندگی" (تعمیری جہاد) نے بھرپور انداز میں سعی کی ہے کہ کھیتی باڑی اور دستکاریوں کا احیاء ہو، دیہاتیوں کی ضرورت کے ادارے بنائے جائیں اور دیہاتوں کی طرف واپسی اور وہاں آبادکاری کے سلسلے میں کسانوں کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ "جہادِ سازندگی" نے اس مہم کی انجام دہی میں بہت کامیابیاں حاصل کرلی ہیں یہاں تک کہ انقلاب کے بعد کے چند سالوں میں زرعی پیداوار میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔

۳— بین الاقوامی انحصاری اداروں کا قیام (تجارتی انجمنیں اور ٹرسٹ)

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں بہت سی پیداواری کمپنیوں کے قیام سے بعض بڑی کمپنیوں کے مفادات خطرے میں پڑ گئے۔ انہوں نے نئے حریفوں کے خاتمے کے لیے، خفیہ معاہدے کر کے تجارتی انجمنیں اور ٹرسٹ قائم کئے جنہوں نے وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ سرمایہ داری کے عفریتوں اور استعمار کی بدروحوں کی صورت میں عالمی اقتصاد کی تمام مارکیٹوں میں اپنے پنجے گاڑ دیے اور ان پر اپنا اثر و تسلّط جمالیا۔

درحقیقت ایک جیسی پیداوار والی کچھ کمپنیوں کے اتحاد و اتفاق کو کارٹل اور ان کمپنیوں کے کسی ایک برابر اور مکمل مقصد کے لیے کیے گئے اتحاد کو ٹرسٹ کہا جاتا ہے۔ (۱)

---

(۱)— اقتصادی لغت میں کارٹل اور ٹرسٹ کا مطلب یہ بیان کیا گیا ہے:

کارٹل کا مطلب ہے:

الف:— اپنے اراکین کے ذریعے، مقررہ اجناس کی خرید، پیداوار اور فروخت کو منظّم بنانے کے لیے کسی ایک ملک یا کئی ممالک کی آزاد اقتصادی کمپنیوں کا معاہداتی اتحاد۔

ب:— مارکیٹ پر مکمل یا جزئی اجارہ داری قائم رکھنے یا اس حالت کے تحفظ اور اس کے دفاع کے لیے، ایک جیسی اجناس پیدا کرنے والی صنعتی کمپنیوں کے مابین محدود اور عارضی اتحاد و اتفاق۔

ٹرسٹ کا مطلب ہے:

الف:— حصص کی کمپنی یا حصص کی کئی کمپنیوں کی انجمن جو کسی ایک جنس یا ایک چیز کی پیداوار اور اس کی تقسیم و فروخت کے سلسلے میں مکمل یا نیم اجارہ دارانہ کنٹرول رکھتی ہو۔

ب:— پیداواری اجناس یا مال کی پیش کش میں اجارہ داری قائم کرنے کے لیے کچھ بڑی کمپنیوں کا باہمی تعاون۔

ڈاکٹر فرہنگ، منوچہر: فرہنگِ علومِ اقتصادی، مطبوعات نیل ص ۱۶۴، ۱۳۲۳۔

"دوسری عالمی جنگ کے خاتمے اور یورپ اور شمالی امریکہ میں اقتصادی ترقی کے دور کے آغاز کے بعد، تیسری دنیا کے ممالک کی ترقی روک دینے کا خیال ایک بار پھر عظیم بین الاقوامی کمپنیوں کے مالکوں کے پروگرام میں شامل ہوگیا۔

۱۹۵۰ء کی دہائی میں صنعتی ممالک نے ایک بار پھر دنیا میں اپنے اثر ورسوخ اور غلبہ و تسلّط کے علاقے قائم کرنا شروع کر دیے۔ بہت سے ایسے معاہدے عمل میں آئے جن کے مطالب پر نظر ثانی کی زحمت بھی گوارا نہیں کی گئی۔ وہ جنگ اور بحران سے نکل چکے تھے، جو کمپنیاں پوری دنیا میں سرگرمِ عمل تھیں، آپس میں مل گئیں اور انہوں نے نئے کارٹلز بنائے۔ مختصر یہ کہ "کثیر الاقوامی" دور کا آغاز ہوا۔

انہوں نے آپس میں مارکیٹیں تقسیم کرکے، ایک طرف قیمتوں کو اپنے اختیار میں لے لیا اور اپنے منافع کو انتہائی حدوں تک پہنچا دیا تو دوسری طرف کاروباری رقابت ختم کرکے اجناس کے معیار میں بہتری کی کوششیں بھی روک دیں۔ یوں ایسے معاہدوں کی رو سے دنیا تین حصّوں میں تقسیم ہوگئی:

۱— اجارہ دارانہ علاقے (غلبہ و تسلّط کے خطّے)

۲— غیر اجارہ دارانہ علاقے (مشترکہ غلبہ و تسلّط کے خطّے)

۳— معاہدے کے دائرے سے خارج علاقے (عام خطّے)

یوں "بین الاقوامی تقسیمِ کار" کے نام سے یا دوسرے لفظوں میں فروخت کی مارکیٹ کو دائمی کرنے کے لیے دنیا کو دو حصّوں — صنعتی ممالک اور اصطلاح میں ترقی پذیر ممالک — میں تقسیم کرنے کا سنگِ بنیاد رکھ دیا گیا۔ (۱)

بڑے بڑے کارٹلوں نے دنیا کو آپس میں تقسیم کرکے یہ کوشش بھی کی کہ داخلی مارکیٹیں بھی اپنے اپنے ممالک میں بانٹ لی جائیں تاکہ بعد ازاں وہ ہر طرح کی رقابت سے کنارہ کش ہو جائیں کہ اس وجہ سے کہ ایسے بہت سے ممالک میں کارٹل اور ٹرسٹ کے خلاف قوانین رائج تھے، بظاہر ان کارٹلوں نے دنیا کے لوگوں کو اس دھوکے میں رکھا کہ بڑی کمپنیوں کے درمیان سخت مقابلہ جاری رہتا ہے، اس لیے مارکیٹ "آزاد رقابت" کی بنیاد پر کام کرتی ہے۔ نتیجتہً کمپنیوں کے درمیان قیمتوں کے تعیّن اور سامان کی قسم کی پسند

---

(۱)— ڈاکٹر الٰہی، ہمایون: دیکتاتوریِ کارتلھا، مطبوعات امیر کبیر، ص ۲۳۔

کے بارے میں کوئی خفیہ سازش ہونے نہیں پاتی۔ یہ کمپنیاں عام طور پر اپنے ظاہری امور کو اس طرح بنا سنوار کر پیش کرتی ہیں کہ عوام آسانی سے ان کے فریب میں آجاتے ہیں اور خیال کرنے لگتے ہیں کہ جیسے یہی اقتصاد کا اصلی اور بنیادی اصول یعنی "رسد و طلب" ہے جو پیداوار اور فروخت کے جملہ مراحل میں قیمتیں متعین کرتا ہے جبکہ حقیقت میں پس پردہ کارٹلز کی رُکن کمپنیوں کا سازشی عُنصر جو بظاہر ایک دوسرے کا رقیب ہوتا ہے وہی سامان کی مقدارِ رسد، اُسکی قیمت کا تعین اور اُسے منڈی میں بھجوانے کے لیے کار فرما رہتا ہے۔ (۱)

حکومتوں کی طرف سے کارٹلوں کی حمایت

کثیر الاقوامی کارٹلوں کو اپنے جملہ اقدامات میں حکومتوں کی بالواسطہ یا بلاواسطہ حمایت حاصل ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں بہت سی حکومتیں فی الواقع اپنی بقا، طاقت و اقتدار کی حفاظت اور اپنے استحکام کے لیے کارٹلوں اور ٹرسٹوں کی طرف سے متین و سنجیدہ حمایت کی ضرورتمند رہتی ہیں۔ یہ اس لیے کہ کمزور حکومتوں کے مقابلے میں ان کے پاس بہت زیادہ اور بہت قوی امدادی وسائل موجود ہوتے ہیں۔ ان کی یہ باہمی حمایت کبھی آشکارا ہوتی ہے اور کبھی خفیہ سرانجام پاتی ہے۔ جس وقت تیسری دنیا کی کوئی حکومت "کھلے دروازوں" کی سیاست پر عمل کرتی ہے تو اسے کارٹلز کی بالواسطہ حمایت کا نام دیا جاتا ہے۔ یہی وہ طریقہ ہے جس سے مقامی صنعتوں کے نشوونما پانے کا امکان سلب ہو جاتا ہے اور ان کے نابود ہو جانے کی سند پر مُہر لگ جاتی ہے۔ ایسی حکومتیں ظاہر میں تو صرف کرنے والے کی حمایت میں ہوتی ہیں لیکن اصل میں ان کا منشاء داخلی پیداوار کا خاتمہ اور کارٹلز کی مصنوعات کی فروخت کو وسعت دینا ہوتا ہے۔ پھر لوگوں کو دھوکا دینے اور عوام کی توجہ اپنی طرف منعطف کرانے کے لیے غذائی اجناس کو گراں نرخوں پر باہر سے درآمد کیا جاتا ہے اور یہ

---

(۱)—مثال کے طور پر برازیل میں ویٹنگ ہاؤس کمپنی نے زیرِ زمین برقی ریل گاڑی چلانے کا کام اپنے ذمہ لیا تھا جبکہ دو اور فرموں یعنی جنرل الیکٹرک اور براؤن بیوری نے جو کہ بظاہر ویٹنگ ہاؤس کے سخت رقیب ہوتے ہیں، سڑکوں پر چلنے والی برقی ریل کا انتظام کیا۔ اسی طرح اور بہت سے خفیہ معاہدوں کے مطابق جرمنی کی ریڈیو اور ٹیلی ویژن مارکیٹ پر غلبہ حاصل کر لیا اور اس طرح وہ چھوٹے بڑے دسیوں کارخانوں کا جو کثیر الاقوامی کمپنیوں کے ساتھ وابستہ تھے دیوالیہ نکالنے کا باعث بنا۔ (مزید اطلاع کے لیے کتاب 'دیکتاتوری کا تلہا' صفحہ ۲۵ کے بعد ملاحظہ فرمائیں)

سستے داموں صارف کو فروخت کی جاتی ہیں۔ اس طرح مقامی کسانوں اور اجناس پیدا کرنے والوں کو دیوالیہ کر کے ناکارہ محض بنا کر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ (۱)

یہی صورتِ حال صنعتی شعبے کی بھی ہے۔ مشینوں میں لگنے والے فاضل پرزوں کا درآمدی محصول اور ٹیکس وغیرہ معاف کرا کے جس پر بڑی حد تک کارٹلز کی اجارہ داری قائم ہے، کارٹلز کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ طرح طرح کے اور کم قیمت فاضل پرزوں کی شکل میں موٹر کاروں، رفریجریٹر اور ٹیلی ویژن کے پُرزے درآمد کریں اور انہیں جوڑ میل کر تیار مصنوعات کی صورت میں بھاری قیمت پر فروخت کریں۔ ظاہر ہے کہ اس کے نتیجے میں کوئی پیداواری یا خود مختار تجارتی اشیاء بنانے والی صنعت زیرِ تسلّط ممالک میں نہ تو قائم ہو سکتی ہے اور نہ ہی نشوونما پاسکتی ہے۔

دہشت گردی اور طاقت کے ہتھکنڈوں سے فائدہ اُٹھانا

کثیر الاقوامی کارٹلز ہر طرح کے مکروفریب سے سازش کر کے 'پولیس راج' قائم کرنے کی خاطر یہاں تک کہ دہشت گردوں کے گروہ منظم کر کے بھی اپنے مقاصد میں کامیاب ہونے کا وسیلہ ڈھونڈنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔

فِلپس کے صنعتی گروپ کے منتظمِ اعلیٰ نے ۲۶ جنوری ۱۹۷۱ء کو صنعتوں کے امریکی نظماء کی یُونین میں جو بہت طاقتور اور بااثر انجمن سمجھی جاتی ہے، یہ اعلان کیا کہ۔

"حکومتِ امریکہ کو چاہیے کہ وہ اپنے اقتصادی مفادات کی ضمانت دے خواہ اس کے لیے اُسے دنیا میں کہیں بھی پولیس راج قائم کرنا پڑے یا 'پولیس سٹیٹ' کی حمایت کرنی

(۱) — اس ضمن میں ایران کی گذشتہ حکومت گندم، ویجی ٹیبل تیل اور گوشت بڑے گراں نرخوں پر باہر سے درآمد کر کے صارف کو نہایت ارزاں نرخوں پر مہیا کرتی تھی۔ ظاہر میں تو ایرانی صارف ان اشیاء کو ارزاں نرخوں پر حاصل کر کے بہت خوش ہوتا تھا لیکن وہ اس حقیقت سے بے خبر تھا کہ اس کے نتیجے میں آگے چل کر کیا ہوگا! لاکھوں کسان بیکار ہو کر رہ جائیں گے اور ان کے ٹھٹ کے ٹھٹ شہروں کا رخ کریں گے کیونکہ ان کی پیدا کردہ اجناس کی اصل قیمت حکومت کی درآمد کردہ غیر ملکی اجناس سے کہیں زیادہ ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایران میں زراعتی کاروبار ٹھپ ہو کر رہ گیا اور اس کے بدلے غیر ملکی سامان اور اجناس کی فروخت بڑھ گئی اور یہ سب کچھ ایرانی قوم کی دولت کے بِرتے پر ہی ہوا جو اس وقت کی حکومت نے خرچ کی۔

پڑے۔"

یہ مشورہ اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ تیسری دنیا میں بہت سی مقبولِ عام تحریکیں کیوں ناکامی سے دوچار ہو جاتی ہیں یا مذکورہ انقلابی ممالک کس لیے ہر طرف سے استکباری سازشوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔

آج کی دنیا میں کثیر الاقوامی کارٹلز اور بعض صورتوں میں بڑی طاقتوں کی طرف سے دھمکی دھونس اور قتل کے جو اقدامات کئے جا رہے ہیں، یہ کوئی نئی بات نہیں۔ گذشتہ ادوار میں بھی استکبار کے ایجنٹ کے طور پر کام کرنے والی تجارتی کمپنیوں جیسے ایسٹ انڈیا کمپنی ——— نے لوٹ مار اور غارتگری ایسے اپنے مقاصد میں کامیاب ہونے کے لیے ایک بڑی فوج تیار کر رکھی تھی۔ لیکن بڑی کمپنیوں کے طرزِ عمل میں ماضی سے اس حد تک عدم مطابقت پائی جاتی ہے کہ لوٹ مار، دھمکی، دھونس اور قتل و غارتگری کے کام براہِ راست یہ کمپنیاں یا استکباری ریاستیں انجام نہیں دیتیں بلکہ بالواسطہ طور پر تیسری دنیا کی پٹھّو حکومتیں یا ان ممالک میں کثیر الاقوامی کارٹلز کے مقیم ایجنٹ انجام دیتے ہیں اور دہشت گردوں کے گروہ منظم کر کے بھی ان سے یہ کام لیا جاتا ہے۔

مارکیٹوں پر اقتصادی غلبے کے نفاذ اور تسلسل کے لیے ذخیرہ کرنے کی پالیسی

کارٹلز کی زندگی بھر کے موضوعات میں سے ایک اہم اور بنیادی موضوع دنیا کی مصرف منڈیوں پر اپنے تسلّط کی حفاظت اور اس کا دوام ہے۔ جب کبھی زیرِ تسلّط ممالک کا میلان صنعتی ہونے کی طرف زیادہ بڑھ جاتا ہے تو وہ ملک کے اندر ہی کوئی پیداواری صنعت لگانے کا اہتمام کرتے ہیں لیکن کارٹلز آگے بڑھ کر ان کا راستہ روکتے ہیں تاکہ ان ممالک میں نشوونما پانے والی مستقل صنعتوں کو پھولنے پھلنے سے روک دیں۔

تیسری دنیا میں نئی نئی لگائی گئی صنعتوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا مروّجہ طریقہ یہ ہے کہ مطلوب و مرغوب سامان و اجناس کو بہت ہی سستے اور مصنوعی داموں پر ملک کی منڈیوں

سے خرید کر ذخیرہ کرلیا جائے۔ یہ کارٹلز اپنے بے پناہ مالی وسائل کے سبب اُن نقصانات کو آسانی سے برداشت کر لیتے ہیں جو انہیں مصنوعی داموں کی وجہ سے اُٹھانے پڑتے ہیں جبکہ مقامی طور پر غریب پیداکار کا تو دیوالہ ہی نکل جاتا ہے اور وہ کسی گنتی میں نہیں آتا۔ اس طرح وہ مارکیٹ دوبارہ مکمل طور پر کارٹلز کے قبضۂ اختیار میں آجاتی ہے۔ مارکیٹ پر قابو پالینے کے بعد کارٹلز فوراً اپنے سامان کی مرغوبیت میں کمی لانے کا باعث بن جاتے ہیں اور مال کی قیمت بھی بڑھا دیتے ہیں اور اس طریقے سے جو نقصان وہ پہلے اُٹھا چکے تھے، اُسے بہت جلد پورا کر لیتے ہیں۔

یہ بے انصافی پر مبنی رقابت جو ہمیشہ نئے اور مستقل پیداکار کی ناگزیر شکست پر منتج ہوتی ہے، ایک اور خصوصیت کی بھی حامل ہے اور وہ یہ کہ نئی نئی آزاد ہونے والی اقوام کے پیداکاروں کے ذہنوں میں اس غلط خیال کی تربیت کی جاتی ہے کہ اصولی طور پر ان میں پیداواری کام کاج کرنے کی نہ تو قابلیت و ہمّت موجود ہے اور نہ ہی وہ اتنی صلاحیت رکھتے ہیں۔(۱)

مشین سازی کی صنعت اور کارٹلوں سے وابستہ صنعتوں کی حوصلہ افزائی

سرمایہ دار ملکوں کی صنعتیں کسی تردید کے بغیر اپنی زندگی کو تیسری دنیا کے ممالک کی درآمدات کا مرہونِ منّت سمجھتی ہیں۔ اسی لیے وہ کوشش کرتی ہیں کہ بین الاقوامی محنت

(۱)— دنیا کے مسائلِ ترقی کو سروے کرنے کا خود مختار کمیشن جو مغربی جرمنی کے سابق چانسلر ولیم برانڈنٹ کی زیرِ سرپرستی قائم ہوا تھا، بین الاقوامی کارٹلز اور ٹرسٹوں کے متعلق اپنی رپورٹ مطبوعہ ۱۹۸۳ء میں کہتا ہے: ”دنیا کی پیداوار کا ۳/۱ حصّہ ان کے زیرِ تصرف ہے اور ۴۰ فیصد بین الاقوامی تجارتی سودے ان کے ذریعے طے پاتے ہیں۔ بعض معاملات خصوصاً خام مال کی نقل و حمل میں ۹۰ فیصد کاروبار ان کے ہاتھوں انجام پاتا ہے۔ گذشتہ عشرے میں ان کی سرگرمیوں کی افزائش کا پیمانہ دنیا کی پیداوار اور تجارتی توسیع کا دُگنا تھا۔

ترقی پذیر ممالک سے جو اوسط منافع انہیں ملتا ہے وہ صنعتی معاشروں میں ان کے خانگی منافع سے دُگنا ہے بعض اقوام ان کے وسائل سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاتی ہیں۔ یہاں پسماندگی بہر حال قابلِ تنقید ہے کیونکہ ایسی حکومتوں کے پاس ان کمپنیوں کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔

(برانڈنٹ ولی، جہان مسلح، جہان گرسنہ، ص، ۲۴۵)

کی تقسیم کے متعلق کسی بھی انتظام میں یہ ممالک ہمیشہ کے لیے مصرفی مارکیٹ کی شکل اختیار کئے رکھیں۔ اس نو آبادیاتی نظریئے کے نفاذ کی پیروی میں آزاد اور بھاری قسم کی پیداکار صنعتوں کا قیام منع ہے اور اس ضمن میں اگر پہلے سے بھی کوئی اقدام کیا جاچکا ہے تو اسے روک دیا جائے گا۔ لیکن جب مشین سازی کے کارخانے لگانے کا سوال پیدا ہوتا ہے تو کثیر الاقوامی کارٹلز اپنا تعاون پیش کرنے کے لیے ہمیشہ آمادہ نظر آتے ہیں۔

اس کا سبب یہ ہے کہ صرف مشین سازی کے کارخانے لگا کر ہی کثیر الاقوامی کارٹلز کے اہداف یعنی مصرفی مارکیٹوں کی توسیع اور انکی اجارہ داری کے امکانات واضح نظر آنے لگتے ہیں اور اس طرح ایک ملک کو صارف معاشرے میں بہ آسانی ڈھالا جاسکتا ہے۔

مشین سازی کے کارخانوں کا قیام در حقیقت گذشتہ دور میں نو آبادیاتی معراج ثابت ہوا ہے۔ اس نوع کی صنعتیں قائم کرکے:

اول یہ کہ بھاری صنعتوں کے بنائے ہوئے کل پرزوں پر انحصار ناگزیر ہو جاتا ہے۔

دوم یہ کہ پیداکار ملک سے صارف تک حمل و نقل کے اخراجات میں کمی واقع ہوتی ہے۔

سوم یہ کہ تیسری دنیا کے ممالک میں سستی مزدوری کے سبب صنعت کو اس کی تیار شدہ شکل میں لانے کے لیے کم اخراجات آتے ہیں۔

چہارم یہ کہ درآمدہ فاضل پرزوں پر ٹیکس معاف ہوتا ہے اور کسٹم محصول صرف انہی تیار شدہ اشیاء پر لگتا ہے جو باہر کے ملکوں سے درآمد کی جاتی ہیں۔ مزید بر آں پٹھو حکومتیں پرزے جوڑ کر یکجا کی ہوئی اشیاء کو "خانہ ساز" کہہ کر بڑے پیمانے پر اُن کی نشر و اشاعت کرتی ہیں اور عوام کے جذبات سے کھیل کر انہیں یہ خانہ ساز اشیاء خریدنے پر مائل کرتی ہیں۔ اس کے نتیجے میں ان کی بکری تیزی سے بڑھتی رہتی ہے (۱)۔

---

(۱)— ہمارے ملک میں ان صنعتوں کا نمونہ "ایرانی آٹو موبائل اسمبلی پلانٹ" (سابق ایران ناشینل) ہے جو پیکان موٹر کاریں تیار کرتا ہے۔ اسکی پیداوار کا انحصار ان فاضل پُرزوں پر ہے جو برطانیہ میں بنائے جاتے ہیں۔ اگر اس کارخانے کو بند کر دیا جائے تو محنت کشوں کی ایک بڑی تعداد بے روزگار ہو کر رہ جاتی ہے اور اگر یہ اپنی پیداوار جاری رکھتا ہے تو برطانیہ سے انجن اور فاضل پُرزے خریدنے کے عوض ملک کا سارا زرمبادلہ رفتہ رفتہ ہڑپ کر جاتا ہے۔ دوسری جانب بد قسمتی سے وہ وسائل اور ماہرین بآسانی دستیاب نہیں جو پیداواری طریقوں میں تبدیلی لاسکیں اور اس کے لئے تازہ سرمایہ کاری اور بہت وقت درکار ہے جو بجائے خود ایک اُلجھا دینے والا مسئلہ ہے۔

رشوت دہی

بین الاقوامی ٹرسٹوں اور کارٹلوں نے زندگی کو طول دینے اور اپنے لوٹ مار کے کاموں کو آگے بڑھانے اور تیسری دنیا کے ممالک میں ہر طرح کے فروغ نیز اقتصادی اور زرعی ترقی کو روکنے کے لیے ان ممالک میں اپنے دلالوں اور کام کرنے والوں کو رشوت دیکر اپنے مذموم مقاصد تک پہنچنے کا ذریعہ بنالیا۔

اگرچہ رشوت دہی کے ان رسوا کُن واقعات کی تشہیر عالمی اخبارات کے سرورقوں پر جلی حروف میں ہوتی رہی ہے مثلاً امریکہ میں جہازوں کی لاک ہیڈ کمپنی کے بارے میں جس نے کئی ممالک کے فرماں رواؤں کو رشوتیں دیکر عالمی بدنامی مول لی۔ ان میں مغربی جرمنی، جاپان اور سعودی عرب کے وزراء سے لیکر ہالینڈ کی ملکہ کے شوہر تک کو رشوت دیئے بغیر نہیں چھوڑا۔ (۱)

غیر ملکی سرمایہ کاری کا تباہ کُن دور

پٹھو حکومتوں کے لیے باعثِ افتخار ایک یہ بات ہوتی ہے کہ وہ غیر ملکی سرمایہ اپنی طرف کھینچنے میں کامیاب رہتے ہیں۔ بڑی بڑی کمپنیوں کے ڈائریکٹر بھی ترقی پذیر ممالک میں اپنی غیر معمولی سرمایہ کاری کی ڈینگیں مارتے ہوئے اسے اپنی کمپنیوں کی انسان دوستی، ترس و دردمندی اور ایثار کا نام دیتے ہیں حالانکہ اس عوام فریبی (غیر ملکی سرمائے کا حصول) کے علاوہ جس کا پراپیگنڈہ پٹھو حکومتیں اور کثیر الاقوامی کارٹلز تیسری دنیا کے ملکوں میں سماجی اور اقتصادی ترقی و فروغ دینے کی کوشش کے طور پر کرتے رہتے ہیں، ایک ایسی تلخ اور تکلیف دینے والی حقیقت بھی مضمر ہے جو اُس گہرائی اور بین الاقوامی فنڈ سے وابستہ کمپنیوں اور بنکوں کے توسط سے وسیع پیمانے پر ہونے والی لوٹ مار اور غارتگری کی نشاندہی بھی کرتی ہے۔ (۲)

---

(۱)— دیکھئے کتاب 'دیکتا توری کار تلہا'، صفحات ۶۰، ۶۲، مذکورہ رپورٹ کی نشر واشاعت اور اُس کے نتیجے میں رشوتوں اور ملکی نیز غیر ملکی کمپنیوں کے منافع پر کمیشن کی فیصد شرح نے اچھی خاصی شہرت حاصل کی ہے۔

(۲)— فرنانڈو فج زائلبر (FernandoFajnzylber)

چلّی کا ایک ماہرِ اقتصادیات اپنی رپورٹ مطبوعہ ۱۹۷۶ء میں رقمطراز ہے: "دوسرے ممالک میں کثیر الاقوامی کمپنیاں اپنے مالی وسائل اور داخلی مارکیٹ سے بہت بڑے پیمانے اور افزائشی طور پر فائدہ اٹھاتی ہیں"۔

مثال کے طور پر ۱۹۷۳ء/۱۳۵۲ شمسی میں جب فوجی حکومت نے پیرو میں ماہی گیری سے متعلق صنعتوں کو جو پوری طرح غیر ملکی قبضے میں تھیں قومیالیا تو بڑی حیرانی سے یہ بات محسوس کی گئی کہ اس اقدام سے صرف داخلی سرمایہ کاری متاثر ہوئی ہے حالانکہ اس سے قطع نظر کہ مچھلی مہیا کرنے سے متعلق صنعتوں کے اصل مالک جو کارٹلز تھے، انہوں نے ماہی گیری کی پوری صنعت کو غیر ملکی سرمایہ کھینچنے کی غرض سے اپنے قبضے میں لے رکھا تھا اور اس کام سے جو منافع ملتا تھا وہ اسے زرِ مبادلہ کی شکل باہر بھیج دیتے تھے اور حقیقتاً یہ اصل سرمایہ پیرُو کے عوام کا ہوتا تھا۔

کثیر الاقوامی کارٹلز نے پیرُو کے قرضہ دینے والے اداروں سے بڑی آسان اور قابلِ قبول شرائط پر قرضہ حاصل کرکے "غیر ملکی سرمائے کے حصول" کا بہانہ کرکے اس لحاظ سے کامیابی حاصل کرلی تھی کہ وہ اپنی ضروریات کو اپنے داخلی وسائل سے ہی پورا کرینگے اور پھر بہ آسانی اس کاروبار کی ساری آمدنی باہر بھیج دیں گے۔ (۱)

تیسری دنیا کے ملکوں میں غیر ملکی سرمایہ کاروں کو قرضہ فراہم کرنے اور منافع کی رقم کو غیر ملکی سرمایہ کاری کے کاموں میں لگے ہوئے سرمائے کا ایک حصّہ سمجھتے ہوئے باہر کے ملکوں میں منتقل کرنے کے لیے عام طور پر بہت سی سہولتیں حاصل ہیں۔ اس طرح کارٹلوں کے مالک پیداواری کاموں میں اپنا سرمایہ لگاتے ہیں اور ہر سال کافی رقم کما کر ملک سے باہر بھیجتے ہیں۔

تیسری دنیا کے ممالک کے مالی وسائل سے صنعتی دنیا کو سرمایہ فراہم کرنے کی ایک مثال مشہور سابق جرمن کمپنی "مانس مان" کی ہے۔

۱۹۵۰ء کے درمیانی عشرے میں مذکورہ کمپنی نے برازیل میں لوہا ڈھالنے کا ایک کارخانہ قائم کیا جو حکومتِ برازیل کے لئے بجا طور پر وجہ افتخار تھا اور غیر ملکی سرمایہ کھینچنے کی ایک علامت کے طور پر اس کا پراپیگنڈا ابھی اس حد تک ہوتا رہا کہ "مانس مان" کا تجارتی نشان ہی یقین و

(۱) — ملاحظہ کیجئے کتاب 'دیکتاتوری کارتلہا' ترجمہ و اقتباس از ڈاکٹر ہمایون الہٰی۔ انتشارات امیر کبیر، ص ۱۳۔

اعتبار کا مظہر بن گیا۔

کچھ عرصہ بعد مذکورہ کمپنی نے آئین و قواعد کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اپنے کارخانے کے غیر رجسٹری شدہ حصص برازیلی مارکیٹ میں فروخت کے لئے پیش کئے۔ برازیلی سٹاک ایکسچینج کے مراکز میں بھی ان حصص کی خرید و فروخت شروع ہو گئی۔ بہت سے لوگوں نے بھی جو کمپنی کی اچھی شہرت اور پراپیگنڈے سے متاثر تھے، لمبے چوڑے منافع کی امیّد میں کمپنی کے حصص خرید لئے۔ اس طرح کمپنی نے برازیل کے عوام سے ۶۰ ملئین مارک کی مجموعی رقم حاصل کرلی جو کارخانے پر لگے ہوئے اصل سرمائے سے کئی گنا بڑھ کر نکلی۔ ۱۹۶۵ء میں کمپنی نے اچانک یہ اعلان کیا کہ اُس کے حصص سر ٹیفیکیٹ پر ایک دستخط جعلی کئے گئے ہیں۔ اس بناء پر کمپنی اپنے جملہ حصص کو غیر اعتباری اور غیر مصدّقہ تصّور کرتی ہے۔

یہ شرمناک واقعہ جو برازیل میں پیش آیا، اس کے باوجود برازیل کے وزیرِ مالیات نے برازیل پر جرمنی کے مسلسل دباؤ کے تحت اپنی ہار مان لی اور جرمن کمپنی کو فائدہ پہنچانے کی خاطر اُس نے کمپنی کے حصص کے برازیلی خریداروں کی مدد کرنے سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ یہ کمپنی مذکورہ صدر ۶۰ ملئین مارک کی سرمایہ کاری کرکے دسیوں ملئین مارک کی آمدنی سے اپنی جیبیں بھر سکتی تھی۔ چناچہ ایسا ہی ہوا اور اسی آمدنی میں سے آخر کار کہیں دس سال بعد جاکر وہ یہ ۶۰ ملئین مارک واپس کرنے پر رضامند ہوئی۔

کثیر الاقوامی کارٹلوں کے درمیان ایک قرارداد کی رُو سے جو دنیا میں سگرٹ کی منڈیوں کی تقسیم کے متعلق تھا، برازیل کی سگریٹ مارکیٹ پر برطانوی / امریکی تمباکو کمپنی کو پوری اجارہ داری حاصل تھی۔ (۱) اس کمپنی نے ۲٫۵ ملئین ڈالر پہلے ابتدائی دو برسوں میں باہر سے برازیل منتقل کئے تھے (یعنی ۲٫۵ ملئین ڈالر کا غیر ملکی سرمایہ کھینچا تھا)۔

---

(۱) برطانوی / امریکی کمپنی اور فائر سٹون ٹائر کمپنی - دونوں نے برازیل میں ۴٫۱ ملئین ڈالر کی کُل سرمایہ کاری کی تھی۔ صرف مقامی اعمال ہی سے کمپنی کی حاصل آمدن ۴۴٫۵ ملئین ڈالر ہوگئی یعنی اپنے اصل سرمائے کا گیارہ گُنا جبکہ زرمبادلہ کی شکل میں اس کمپنی کی طرف سے دس برسوں کے دوران باہر منتقل کردہ رقم کی میزان ۴۸ ملئین ڈالر یعنی کمپنی کے اصل سرمائے کا بارہ گُنا ہوتی ہے۔ بہر حال یہ خیال رہے کہ جملہ اعداد و شمار کا جمع کرنا ممکن نہیں اور ان کمپنیوں کے حسابات کے پیچیدہ ہونے کے سبب بھی ان کا صحیح صحیح جائزہ لینا دشوار ہے۔

برازیل میں از سرِ نو سرمایہ کاری جو کمپنی کے کمائے ہوئے سود سے کی گئی وہ ۱۲۹ ملئین ڈالر کی تھی یعنی کمپنی کے اصل سرمائے سے پچاس گنا افزوں اور یہ آمدنی برازیل میں صرف سگرٹ فروشی سے ہوئی۔ ۱۹۶۵ء تا ۱۹۷۵ء یعنی دس برس کے دوران اس کمپنی کی طرف سے زرِمبادلہ کی منتقلی تقریباً ۸۱۳ ملئین ڈالر کی تھی جو یہ ظاہر کرتی ہے کہ اصل لگائے گئے سرمائے کے مقابلے میں صرف ایک عشرے میں مذکورہ سرمائے کو گویا ۳۲ بار باہر منتقل کیا جا چکا ہے اور کمپنی نے برازیل کے اندر بھی ۱۲۹ ملئین ڈالر کا اضافی سرمایہ حاصل کر لیا ہے۔

ان حقائق سے تیسری دنیا کے ملکوں میں غیر ملکی سرمایہ کاری کے نتائج کے عام نمونوں کی نشاندہی ہوتی ہے جو صنعتی ممالک کو بہت ضروری سرمایہ فراہم کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ کارٹلز تیسری دنیا کے ممالک میں موجود صنعتوں کے جن میں انہی ملکوں کا سرمایہ لگا ہوا ہے، مالک و مختار بنے بیٹھے ہیں۔

ارجنٹائن کا ایک ماہرِ اقتصادیات (۱) لکھتا ہے:

"۱۹۶۹ء — ۱۹۷۰ء کے دوران لاطینی امریکہ میں کثیر الاقوامی کارٹلز کی شاخوں کی قابلِ حل ضروریات میں سے ۸۷ فیصد مقامی سرمائے ہی سے پوری کر لی گئیں۔"

برازیل کے منصوبہ بندی کے وزیر (۲) نے ۱۹۷۶ء میں اعلان کیا تھا کہ تین برسوں کے اندر تقریباً ۱۱ فیصد نئی سرمایہ کاریاں یا سرمایہ کارانہ ترقی غیر ممالک سے منتقل شدہ رقم سے ہوئی تھی۔

اس کے مقابلے میں برازیل کی آٹوموبائل کمپنیوں نے ۱۹۷۴ء میں اپنی بکری کا صرف ۲ فیصد داخلی شعبہ میں سرمایہ کاری کے لئے علیحدہ نکال کر رکھا تھا۔

اوپر دیئے گئے اعداد و شمار سے دو نکات واضح ہو جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ برازیل میں تقریباً ۹۰ فیصد سرمایہ کاری کو داخلی سرمائے نے یقینی بنا رکھا ہے اور دوسرے یہ کہ منافع یا سود کا بہت بڑا حصہ بھی باہر منتقل کیا جا چکا ہے۔

بڑے افسوس کا مقام ہے کہ تیسری دنیا میں بہت سے مغرب زدہ ماہرین دانستہ یا نادانستہ

---

(۱) — آلڈو فیئرر — AldoFerrer

(۲) — ریس ولاسو — ReisVellosso

طور پر ابھی تک غیر ملکی سرمائے کو اپنی طرف کھینچنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔

حالانکہ تیسری دنیا کے ممالک کے پاس خود ان کے اپنے وسائل موجود ہیں۔

افرادی قوت، توانائی کے سرچشمے، ابتدائی خام مال، سرمایہ داری اور ماہرین و متخصصین وغیرہ عوام کے اندر صرف خود اعتمادی کی روح پھونکنا ہے۔ اُنہیں صحیح قیادت مہیّا کرنا ہے اور ہوشیار و خبردار انتظامیہ بہم پہنچانا ہے۔ یہی چیزیں ہیں جو استعمار پسندوں کے زیرِ اثر اپنی افادیت کھو بیٹھی ہیں۔ انہیں دوبارہ پُر افادیت بنانا ہے۔ ان ممالک کے اقتصادی اور سیاسی شعبوں میں کثیر الاقوامی کارٹلوں کی دست اندازی و مداخلت کو بھی روکنا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس طرح وہ مؤثر اقدامات کئے جاسکیں جن سے خود کفالت اور زرعی و اقتصادی ترقی کی راہ پر گامزن ہوا جا سکے اور غربت و پسماندگی کے خلاف جنگ لڑی جا سکے۔

ان حالات کا صحیح نمونہ ایران میں انقلاب کے بعد کی صورت میں دیکھا جاسکتا ہے، جہاں بے شمار استکباری سازشوں کے باوجود ٹھونسی ہوئی جنگ کو شدید اور طویل کرنے کی لیے "فتح ہونے تک ڈٹے رہنے کے عزم" نے دشمن کے جملہ عزائم کو خاک میں ملا کر رکھ دیا اور ایمانی قوت نے خود کفالت کی راہوں پر گامزن رکھا۔

انقلاب کی قوّتِ محرّکہ نے نہ صرف زرعی اور صنعتی شعبوں میں بلکہ فوجی صنائع میں بھی حیرت ناک کارنامے سرانجام دئے ہیں اور یہ انقلاب ہمارے لیے اپنے مفاد کی خاطر مشرق ہو کہ مغرب ان دونوں سے قطعِ وابستگی کرنے کی خوش خبری لیکر آیا ہے۔

۴۔ زیرِ تسلّط ممالک کے ذخائر و وسائل کی تاراجی:

استکبار نے گذشتہ کئی برسوں سے اپنے زیرِ اثر ملکوں کو خود کفیل اقتصادیات کو نشوونما دینے سے روک رکھا تھا اور یہ اس لیے تھا کہ وہ اپنی سرمایہ کاری سے ان کے تمام وسائل پر اپنی اجارہ داری قائم کرلے۔ چنانچہ اس نے یورپی / امریکی سرمایہ تیسری دنیا کے ممالک میں پانی کی طرح بہادیا اور بڑی بڑی کان کنی کی صنعتیں لگا کر ان کی اقتصادیات کو زیادہ سے زیادہ

واحد پیداواری کارخانے تک محدود کر دیا۔

لاطینی امریکہ، مشرقِ وسطیٰ، مشرقِ بعید اور افریقہ اس سرمایہ کاری کے بڑے میدانِ عمل اور تجربوں کے مناسب اڈّے ثابت ہوئے۔

یہ سرمایہ کاریاں جو دوسری عالمی جنگ کے بعد غالباً یورپی/امریکی سرمائے سے کی گئی تھیں، نجی مالی اداروں اور زیرِ تسلّط ملکوں کے مابین باہمی سمجھوتوں کے مطابق کارخانوں، ریل کی پٹڑیوں اور کان کنی سے وابستہ صنعتوں کے قیام کا باعث بنیں۔ اس کے باوجود واحد پیداواری اقتصاد اور ان ممالک کے مالی انحصار کی اصل صورت میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی اور ان اقوام کی قوتِ خرید اور قومی دولت بھی روزبروز کمزور اور کم ہوتی گئی۔ یہ اس لیے کہ استعماریوں کا کام تو سرمائے اور ان ملکوں کی قومی دولت کو ہڑپ کرنا اور بالآخر اپنی آمدنی اور منافع کا یورپ اور امریکہ کے بینکوں میں اپنے ذاتی حسابات میں منتقل کرانا ہوتا ہے۔

غیر ترقی یافتہ ممالک سے سرمائے کی مسلسل منتقلی جو بین الاقوامی مالی اجارہ داری اہداف کی تکمیل سے پوری طرح ہم آہنگ ہے، امریکہ اور یورپ کی روزافزوں اقتصادی ترقی کو مزید رونق دینے کا موجب بن گئی ہے۔ امریکہ کو پورا اعتماد ہے کہ نجی امریکی کمپنیوں کا تیسری دنیا کے مالی وسائل پر متصرف ہونا اور ان ملکوں میں امریکہ کے اقتصادی اور مالی اثرات کا پھیلنا غیر ترقی یافتہ ممالک کے لیے ایک طرح کی امداد و اعانت کے مترادف ہے۔ لیکن امرِ واقعہ یہ ہے کہ امریکی صنائع، اُسکی سرمایہ کاری اور اپنے قومی سرمائے سے ایجاد کردہ صنائع —— ان دو قسم کی سرمایہ کاریوں سے جو نتائج حاصل ہوئے ہیں، ان میں جو واضح فرق موجود ہے، تیسری دنیا کی قومیں اسے خوب پہچانتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی قومی دولت اور سرمائے کے مُلکی اخراج کو جو غیر ممالک کی سرمایہ کاری کا براہِ راست نتیجہ ہوتا ہے، بڑے غصّے اور نفرت سے دیکھا جاتا ہے۔

اس قسم کی سرمایہ کاری کا مقصد صرف زیرِ زمین وسائل کی چوری چکاری یا لوٹ مار ہوا کرتا ہے تاکہ صنعتی ممالک کے اقتصادی دیووں کے لیے ابتدائی خام مال مفت مہیّا کیا جاسکے۔ یہ سرمایہ کاریاں عموماً ذخیرہ اندوزی کے ذریعے بڑے کم عرصے میں کئی گنا سرمایہ لوٹا دیتی ہیں۔ یہ سرمایہ جو دراصل قومی اور ملکی ہوتا ہے، اسے ملک سے خارج کر کے غیر ملکی

بنکوں میں جمع کرادیا جاتا ہے۔

امریکی تاجروں نے ایک ایسی مشین سے کام لینا شروع کر دیا ہے جو سابقہ نو آبادیاتی یا نیم نو آبادیاتی ممالک پر چڑھ دوڑنے کے لیے فقط امریکی اقتصادی تسلّط کا راستہ ہموار کرتی ہے۔ یعنی ان ملکوں پر غلبہ پانے کے لیے جنہیں اصطلاح میں غیر ترقی یافتہ ممالک یا تیسری دنیا کہا جاتا ہے۔

یہ مشینی حرکت جو صرف مادّی نوعیت کی ہے، اسے عوام کے ملّی جذبات، خواہشوں اور امیدوں نیز مادّی و روحانی ضرورتوں سے کسی قسم کا کوئی سروکار نہیں۔

اس کے علاوہ امریکی حکومت جب بھی مظلوم و ستم دیدہ اقوام کے لوگوں کی لڑائیوں سے بچنے کے لیے کوئی حفاظتی کونہ ڈھونڈ لیتی ہے تو پھر ان لوگوں کو کمیونسٹ قرار دیکر یا ان پر دشمن ایجنٹ تحریک کا لیبل لگا کر نیست و نابود کر دیتی ہے، محض اس لئے کہ انہوں نے اُس جہنمی نظام کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا تھا جو اُن پر ٹھونسا گیا تھا۔ یہ اُسی طرح ہے جیسے روس مقبول عام تحریکوں اور کمیونسٹ مخالف عناصر پر جاگیردار، سرمایہ دار، رجعت پسند جیسے لیبل لگا کر انہیں کچلنے کے اقدامات کرنے پر آمادہ رہتا ہے۔

گذشتہ دو صدیوں کے دوران تیسری دنیا کے تقریباً تمام ممالک میں وسائل کی تاراجی و تباہی کے ایسے بے شمار واقعات کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے اور اس غارتگری کا سلسلہ تو دنیا کے بعض علاقوں میں ابھی تک جاری ہے۔

ایران میں ناصرالدین شاہ قاچار کے عہد میں زیرِ زمین ذخائر اور ملکی دولت کا استحصال شروع ہوا۔

ایران کے زیرِزمین ذخائر کی کان کنی کا پہلا اجارہ نامہ ناصرالدین شاہ نے ۲۵، جون ۱۸۷۳/۱۸ جمادی الاول ۱۲۹۱ھ کو انگلستان کے ایک شخص بارول جولیوس دوررویٹر نامی کو عطا کیا۔

"یہ اجازہ نامہ جو اپنی حدودِ اجارہ داری کے لحاظ سے بہت ہی نادر واقع ہوا تھا پوری سرزمینِ ایران پر محیط تھا۔ اسکی رُو سے سونے، چاندی اور قیمتی پتھروں کو چھوڑ کر ریلوے، ٹراموے اور جملہ معدنی وسائل کی کان کنی کی مکمل اجارہ داری ستر سال کے لیے رویٹر کو دے دی گئی تھی۔ اس اجارہ داری کے عوض رویٹر نے مبلغ چالیس ہزار

پونڈ سٹرلنگ کی رقم نیک نیتی ظاہر کرنے کے لیے رقم خیر خواہی کے طور پر ناصر الدین شاہ کی خدمت میں پیش کی۔

سال بعد جب شاہ پیٹرزبرگ کے دورے پر گیا تو روسی دربار نے رویٹر کو دیئے گئے اجارہ نامہ پر شاہ سے صاف صاف اپنی نارضامندی کا اظہار کیا۔ چنانچہ اس کے نتیجے میں ۱۸۷۳ء کا اجارہ نامہ منسوخ کر دیا گیا اور مذکورہ رقمِ خیر خواہی بھی ضبط کر لی گئی"۔ (۱)

بعد ازاں ناصر الدین شاہ قاچار نے ۲۰، اکتوبر ۱۸۸۹ء / ۲۴، صفر ۱۳۰۷ھ کو اپنے تیسرے دورۂ یورپ سے تہران واپس آکر ایرانی تمباکو کا اجارہ نامہ ۲۴، مارچ ۱۸۹۰ء / یکم فروردین ۱۲۶۹ شمسی کو میجر ٹالبوٹ نامی اک انگریز کے حوالے پچاس سال کے لیے کر دیا۔

اس اجارہ نامہ کے مطابق تمباکو اور متعلقہ سازوسامان کی خرید و فروخت کے جملہ حقوق، پیداکاروں سے ہر نوع کے مالی اور تجارتی روابط کی استواری اور تمباکو فروشوں کو لائسنسوں کا اجراء یہ تمام فرائض ایرانیوں کے ہاتھ سے لیکر شاہی رژی کمپنی کے سپرد کر دیئے گئے۔ کمپنی کے ان غلط فیصلوں، نفع آور کاموں اور منفعت بخش اقدامات نے ایرانی پیداکاروں، فروخت کرنے والوں اور سمگلروں کی تقدیر پر حکومت کرنا شروع کر دی۔ اس ضمن میں تجارتی لین دین میں اشیاء کی قیمتوں کا تعین بھی عملی طور پر کمپنی ہی کا امتیازی حق تسلیم کیا جانے لگا۔

شاہ نے اس طرح کئی ملئین پونڈ رقم جو اصل میں عوامی حقوق اور منافع کی تھی، ضائع کر دی تاکہ وہ ہر سال پندرہ ہزار پونڈ اصل آمدنی کے ۱/۴ کے علاوہ، حصّہ داروں کو سرمایہ ادا کرتے ہوئے پانچ فی صد منہائی کے بعد، کمپنی سے وصول کرتا رہے جبکہ کمپنی نے خود اپنے لئے نصف ملئین پونڈ سٹرلنگ کی آمدنی کا اندازہ لگا رکھا تھا۔ (۱)

رویٹر کا اجارہ نامہ منسوخ ہونے کے بعد ۱۲۸۰ شمسی / ۱۹۰۱ عیسوی میں مظفر الدین شاہ قاچار نے ولیم ڈورسی نامی ایک انگریز کو ۶۰ سال کے لئے تیل اور اسکی ذیلی مصنوعات کی تلاش، اخراج، حمل و نقل اور فروخت کا اجارہ نامہ عطا کیا۔ ساتھ ہی اُسکو یہ بھی اجازت دے دی گئی کہ وہ پانچ شمالی اضلاع (بلحاظِ قربتِ زارِ رُوس) کے علاوہ پورے ملک میں تفحص و

---

(۱)— یہ اجارہ نامہ تحریم تنباکو کے مشہور فتوے جو مرجعِ مبارز "میرزا حسن شیرازی" کے توسط سے جاری ہوا، منسوخ ہو گیا تھا۔ اسکی کیفیت کا ذکر 'دین سے سیاست کی جدائی' میں موجود ہے۔

جستجو عمل میں لاسکے گا۔ اجارہ دار نے یہ بھی وعدہ کیا تھا کہ وہ دو سال کے اندر ایک کمپنی قائم کرے گا جو اجارے کا استحصال کر کے منافع کا ۱۶ فیصد حصّہ حکومتِ ایران کو بطور رائلٹی دے گی۔ (۱)

رویٹر قرارداد ۱۹۳۳ء میں رضا خان کے دور تک بعض ترامیم کے ساتھ جاری رہی لیکن بالآخر اُردی بہشت سال ۱۳۳۰ میں ڈاکٹر محمد مصّدق کے زمانے میں اسے منسوخ کر کے غیر قانونی قرار دے دیا گیا۔

اس کے فوراً بعد ہی یعنی ۲۸ مرداد ۱۳۳۲/ ۱۹ اگست ۱۹۵۳ء کے فوجی انقلاب نے ایرانی تیل کو دوبارہ ایک کنسورشیم کی تحویل میں دے دیا۔ یہ کنسورشیم ۴۰ فیصد برطانوی، ۴۰ فیصد امریکی، ۱۴ فیصد ہالینڈ (ڈچ) اور ۶ فیصد فرانسیسی کمپنیوں پر مشتمل تھا۔ اپنی اپنی باری پر یہ کمپنیاں ایک معمولی سی رقم رائلٹی کے طور پر دے دیا کرتی تھیں اور ملک کے جنوبی علاقوں میں تیل کی دولت لوٹنے میں لگی رہتی تھیں۔

خلاصہ یہ کہ ایرانی تیل کی تاریخ ایک المیہ ہے۔ اسلامی انقلاب کی فتح و کامیابی تک یہ ایک ایسا سیاسی و اقتصادی واقعہ ہے جو غم انگیز ہی نہیں بلکہ ضرر رساں بھی ہے۔ تیل کا یہ معاملہ قاجاری اور پہلوی خاندانوں کے سیاہ ترین گناہوں کا ایک حصّہ ہے جسے اپنی جگہ بڑی تفصیل و تفسیر کے ساتھ سب کے لیے درسِ عبرت کے طور پر دہرانا چاہئیے خاص طور پر ان جوانوں کو سبق لینے کی ضرورت ہے جنہوں نے پچھلی حکومتوں کے ادوار دیکھے ہی نہیں۔

۵ــــ ممالک کو مقروض بنا کر انہیں زیر بار کرنا

استکبار کی نگاہوں میں جن پالیسیوں کو خصوصی اہمّیت حاصل ہوتی ہے وہ دراصل اقتصاد سے تعلق رکھنے والی پالیسیاں ہوتی ہیں۔ استکبار کے زیرِ تسلّط ملکوں میں ان پالیسیوں نے عملی طور پر بینکنگ اور سودی لین دین کے نظام کو فروغ دے کر وہاں کے لوگوں کی نہ صرف محنت کو لوٹا ہے بلکہ اُن کی مشقّتوں پر بھی ڈاکہ ڈالا ہے۔

آجکل دنیا بھر میں چھائے ہوئے امریکی، یورپی اور رُوسی بینکنگ نظام آمدنی کے بہت

(۱)ــــ روحانی، فواد، تاریخ ملّی شدن صنعت نفت ایران، انتشارات کتابهای جیبی صفحہ ۵۸۔

بڑے ذرائع شمار ہوتے ہیں۔ عملی طور پر تیسری دنیا کے ممالک میں ان بنکوں کی پالیسیاں بڑے اختلافات کا موجب بنی ہوئی ہیں، اسطرح کہ ۱۰ فیصد عوام آمدنی کا ۹۰ فیصد اپنے لئے وقف رکھتے ہیں جبکہ بقیہ ۹۰ فیصد آبادی ۱۰ فیصد آمدنی پر گذارہ کرتی ہے۔ اس قسم کا طبقاتی امتیاز اور آمدنی کا اتنا بڑا فرق معاشرے کے دو طبقوں کے درمیان سرمایہ دار اقلیت کے ہاتھ میں طاقت کی مرکزیت کے رُخ گھومتا رہتا ہے۔

دولت ہی عام طور پر طاقت اور اثرونفوذ کا سرچشمہ ہوتی ہے۔ اس لیے استکباری حکومتیں بھی دوسرے ممالک کے ساتھ اپنے روابط میں ہمیشہ سرمایہ دار اور دولت مند طبقے پر انحصار کرتی ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہر ملک میں اس قسم کے بااثر عنصر کے وجود کو استکباری حکومتوں کے اثرونفوذ کو استحکام بخشنے کا ایک مؤثر عامل سمجھا جاتا ہے۔

ان افراد کو کنٹرول کرنے کا ایک اہم طریقہ بنکینگ کا نظام ہے۔ نوآبادیاتی طاقتیں بینکنگ کے نظام سے فائدہ اُٹھا کر ملکی اقتصاد کو کلّی طور پر اپنے قبضے میں لے آتی ہیں اور پھر شرحِ سُود، بنک کھاتے کی میزان اور پیداواری، صنعتی نیز خدماتی مراکز کو قرضہ جات فراہم کرکے ہر مُلک کے ایک بڑے حصّے پر قابض ہو جاتی ہیں۔

آج کی دنیا کے مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ مغرب کے بڑے بڑے صنعتی ممالک سے لیے ہوئے قرضوں کی وہ رقمیں ہیں جو تیسری دنیا کے ممالک کے ذمّے واجب الادا ہیں۔

دوسری جنگِ عظیم اور پُرانے استعماری دور کے بعد، استعماری ممالک نے اقتصادی تسلّط پر تاکیداً اور پُرانے طریقوں کی بجائے اقتصادی اور سیاسی تسلّط کو جگہ دیتے ہوئے یا تو مطلقاً سیاسی تسلّط کا یا سیاسی و فوجی تسلّط کا راستہ اپنے لیے منتخب کرلیا ہے۔

موجودہ صدی اور خاصکر دوسری جنگِ عظیم کے بعد جب یورپی اور امریکی سرمایہ داروں کا اثرونفوذ رفتہ رفتہ عالمی بنک میں سرایت کرگیا تو انہوں نے آگے چل کر صرف ایک ہی مقصد کو یعنی مدتِ مدید تک تیسری دنیا کے ممالک کو مقروض بنائے رکھنے کی خواہش کو مدّ نظر رکھا تاکہ اپنے اثرونفوذ کو مستحکم کیا جاسکے اور ان ممالک کو اقتصادی لحاظ سے ایک ایسے اقتصادی نظام کا دست نگر بنا دیا جائے جو یک پیداواری اقتصاد پر مبنی ہو۔

چنانچہ مالی امداد کی پیشکشوں، توسیعی قرضوں اور بظاہر بہت آسان منصوبوں کی تجاویز نے گذشتہ عشروں میں بہت سے ممالک کے لیڈروں اور سیاست دانوں کو ان فریب کاریوں

میں مبتلا کر کے چکرا رکھا ہے۔ یہ ممالک عام طور پر دو قسم کے واقع ہوئے ہیں:

پہلا گروہ ان ممالک کا ہے جو کُلی طور پر سرمایہ دارانہ نظام کا دست نگر ہے اور اس کے پاس اس کے سوا کوئی اور چارۂ کار نہیں کہ اپنے معاشی مسائل کو حل کرنے کے لیے غیر ملکی امداد حاصل کرے۔ بڑی طاقتیں بھی انہیں قرضہ فراہم کرنے میں حیل و حجّت سے کام نہیں لیتیں کیونکہ اس طرح ایک تو وہ اپنے ماتحت حکومتوں کی سرپرستی کرتی ہیں اور دوسرے وہ ان ممالک میں آئندہ کے لیے اپنی ساکھ اور اپنے اثر و نفوذ کی توسیع و تحکیم کو یقینی بنا لیتی ہیں۔ دوسرے گروہ میں وہ ممالک شامل ہیں جن کی استکباری طاقتوں کے ساتھ کوئی خاص وابستگی نہیں لیکن صنعتی ملکوں اور بین الاقوامی بنکوں کی فضا انہیں اس بات پر آمادہ کر دیتی ہے کہ وہ اپنے عوام کا معیارِ زندگی بلند کرنے کے لیے، انکی فلاح و بہبود کے لئے اور اپنے ملک کی اقتصادی حالت بہتر بنانے کے لیے موجود امکانات سے فائدہ اُٹھائیں۔

مجموعی طور پر سرمایہ دارانہ نظام کو بین الاقوامی اقتصادی روابط میں جن کا تعلق پیداوار، تقسیم اور بنیادی ساز و سامان جسے حربی یا مصلحتی مال بھی کہا جاتا ہے، کے صرف سے بھی ہوتا ہے، تعین کرنے والا نفوذ اور کنٹرول حاصل ہے۔ گندم یا جو۔ چاول، قہوہ یا چینی اور خام مال۔ زیرِ زمین ذخائر جیسے تیل اور گیس۔ معدنی مواد جیسے سونا، چاندی، یورینیم، تانبا، سکّہ اور ٹین۔ ان تمام اشیاء پر مغربی سرمایہ دار طاقتوں کی اجارہ داری قائم ہے۔ چنانچہ جو ممالک ان اشیاء کے واقعی ضرورت مند ہوتے ہیں، وہ مجبوراً استعماری ممالک کے توسطّ سے اُن ممالک کے ساتھ باہمی روابط استوار کر کے حاصل کرتے ہیں۔

بالفرض اگر کوئی ملک اس بات کا واقعی تہیہ کر لے کہ وہ اپنی اقتصادی حالت کو استکباری قوتوں کے ساتھ کسی اساسی وابستگی کے بغیر اکیلا خود ہی ٹھیک کر لے گا تو اس صورت میں استکبار اس ملک پر اپنے نفوذ و کنٹرول کے اساسی لیور اپنے ہاتھ سے کھو بیٹھے گا۔

بڑی طاقتوں کی طرف سے نت نئی اور طرح طرح کی سازشیں جو ہماری کوششوں کے خلاف اور ایران میں اسلامی انقلاب کا راستہ روکنے کے لیے کی جا رہی ہیں، اس بات کی دلیل ہیں کہ استکباری نقطۂ نظر سے اسلامی جمہوریۂ ایران کا اقتصادی آزادی اور خود کفالت کی پالیسی اپنانا

اُنکی منفعت اندوزی کی راہ میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ استکبار کو اس بات کا علم ہے کہ وابستگی و دست نگری کے رشتوں کا انقطاع ہی دراصل سیاسی آزادی کا منبع ہے۔ اسی لیے اسلامی جمہوریۂ ایران کے نظام کے مستحکم ہونے کی بنیاد جو مشرق و مغرب کے ساتھ ہر طرح کے رشتۂ وابستگی کا انقطاع ہے۔ غلامی کی زنجیروں میں یہ جکڑی ہوئی اقوام کے خشک اور اشتعال آمادہ خرمن اور تیسری دنیا کے تمام ممالک کی آزادی کی تحریکوں کے غیظ و غضب کے واسطے چنگاری کا کام دے گی جس کے نتیجے میں استعماری مستکبروں کے محلات ایک ہی دفعہ دھڑام سے زمین پر سجدہ ریز ہو جائینگے۔

استکباری نظام کی گوناگوں سازشیں جس میں عراقی تحریک بھی شامل ہے، ان سب نے ملکر ایران پر جنگ اس لیے مسلّط کی کہ اُسے یا تو تہس نہس کر دیا جائے یا کم از کم اس ملک کی رفتارِ ترقی و نشو و نما کو روک دیا جائے۔ لیکن اللہ تعالیٰ جلّ شانہ' کے فضل و کرم، ایرانی قوم کے جذبۂ اتحاد و اتفاق اور حضرتِ امام خُمینی (رضوان اللہ علیہ) کی رہبری کے طفیل اسلامی انقلاب اپنی اُسی رفتار سے قوّت اور حرَکی عمل بن کر آگے ہی آگے بڑھ رہا ہے اور زیادہ وقت نہیں لگے گا کہ استعماری رگ و ریشے کو نہ صرف ایران کی سرزمین میں بلکہ مشرقِ وسطیٰ کے علاقوں میں کہیں بھی پنپنا نصیب نہیں ہو گا۔

٦— تیسری دنیا کے ممالک کے قرضہ جات

تیسری دنیا کے بہت سے ملکوں کو اپنی قومی دولت کے استحصال اور لُوٹ مار کے سبب اقتصادی نقطۂ نظر سے بڑی ناگوار صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ملک کے اقتصادی پہیّوں کو حرکت میں لانے کے لئے وہ صنعتی ملکوں اور استعماری بنکوں سے ناچار قرض لینے پر مجبور ہیں لیکن اس طرح نہ صرف ان کی حکومتوں کی اقتصادی دست نگری میں اضافہ ہو جاتا ہے بلکہ عملی طور پر بھی اُنہیں اپنے اقتصادی وسائل کا ایک حصّہ ان قرض دہندگان کی نذر کرنا پڑتا ہے۔

تیسری دنیا کے ملکوں کی اقتصادی حالت کا سرسری جائزہ لینے سے اس بات کی نشاندہی ہو جاتی ہے کہ دو تین سال کے بعد ہی بھاری سودی شرح پر محدود رقم کا قرضہ لے کر بعض

ممالک کو اصل قرضے سے دگنی یا تگنی رقم سے زیادہ سُود ادا کرنا پڑا ہے اور اس کے باوجود وہ مقروض کے مقروض ہی رہے ہیں کیونکہ قرضے کی اصل رقم تو ابھی تک ان کے ذمّے واجب الادا چلی آرہی ہے۔

استعماری ملکوں کے بنک جیسے بین الاقوامی مالیاتی فنڈ اور عالمی بنک وغیرہ، ان کا کام تو ملکوں کو قرضہ دینا ہے۔ اس کے عوض قرضہ لینے والے کو عام طور پر اپنی ضروریات انہی سے یا ان کے متعارف کردہ وسائل کے ذریعے پورا کرنی پڑتی ہیں۔ یہ طریقِ کار حقیقت میں پوری رقمِ قرضہ کی اُس ملک کو جسے متذکرہ بنک نے متعارف کرایا تھا یا خود ان بنکوں کو واپسی کے مترادف ہے۔ قرض سے خریدا ہوا مصرفی مال معمول کے مطابق تھوڑے عرصے میں صرف ہو کر ختم ہو جاتا ہے جبکہ بنکوں کی شرح سُود سال بسال بڑھتی رہتی ہے جس سے اصل قرضے کی رقم میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس طرح مقروض ممالک کی گردنوں میں پھانسی کا پھندا سخت سے سخت تر ہوتا چلا جاتا ہے۔

سال ۱۹۸۴ء کے خاتمے پر تیسری دنیا کے ذمّے مجموعی قرضوں کی رقم ۹۲۰ بلئین ڈالر سے کچھ زیادہ تھی جو ۱۹۸۶ء میں ایک ہزار بلئین ڈالر سے بھی متجاوز ہو گئی۔ کم از کم ۳۶۰ بلئین ڈالر تقریباً یعنی قرضوں کی مجموعی رقم کے نصف کا تیسرا حصّہ لاطینی امریکہ کے ممالک نے حاصل کیا تھا۔ (۱)

لاطینی امریکہ کے ممالک پر قرضوں کے دباؤ نے ان ملکوں کی اقتصادیات کو مفلوج بنا کر رکھ دیا تھا جسکی وجہ سے موجودہ صدی کا سخت ترین اقتصادی بحران پیدا ہوا۔ ان قرضہ جات کے نتیجے میں دس برسوں کے بعد اب کہیں جا کر اس علاقے کے عوام کا معیارِ زندگی رُوبہ تنزل ہوا ہے۔

چنانچہ اگر ان کی موجودہ حالت کا مقابلہ ہم پہلے کی دس سالہ صورتِ حال سے کریں تو اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ ترقی پذیر ممالک نے آج تک جو سُود (ہر سال ۹۰ بلئین ڈالر سے زیادہ) ادا کیا ہے، وہ مجموعی طور پر ان قرضوں سے بھی زیادہ ہے جو اُنہوں نے دس سال پہلے لئے تھے۔

پسماندہ معاشروں کے لئے ہوئے قرضوں کی ادائی کی کل میزان اُس مالی امداد کی رقم سے

(۱)— برانٹ ویلی: جہان مسلّح، جہانِ گرسنہ، ترجمہ از ہرمز ہمایون پور، انتشاراتِ انقلابِ اسلامی، ص ۲۱۳۔

تین گُنا بڑھ جاتی ہے جو ان معاشروں کو مغرب سے ملی تھی۔

اعداد و شمار کے ایک اور پریشان کُن تقابل سے ظاہر ہوتا ہے کہ ترقی پذیر اور تیل درآمد کرنے والے معاشروں کا بازادائی خسارہ ۱۹۶۰ء کا عشرہ شروع ہونے سے ابتک دس گُنا ہو چکا ہے۔

لاطینی امریکہ کے مجموعی قرضوں کی رقم ۱۹۸۴ء کے اختتام تک ۳۶۰ بلئین ڈالر سے بڑھ چکی تھی۔ بڑے بڑے مقروض ممالک کے ذمّے واجب الادا قرضوں کی رقوم حسبِ ذیل ہیں۔ (۱)

برازیل ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۰۰ بلئین ڈالر۔ (۲)

میکسیکو ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ تقریباً ۹۰ بلئین ڈالر۔ (۳)

ارجنٹائن ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۵۰ بلئین ڈالر۔

وینزویلا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۳۵ بلئین ڈالر۔

بنک ان قرضوں پر ۴۵ بلئین ڈالر کا سالانہ سُود وصول کرتے ہیں۔

افریقی ممالک کے ذمّے بھی ۱۵۰ بلئین ڈالر کا قرضہ واجب الادا ہے۔

ایک طرف تو بازادائی کی مدت میں توسیع، ملک میں روزانہ اُجرتوں کے اضافے کا سبب ہوئی ہے تو دوسری طرف مقروض ممالک کی بجٹ وصولیوں پر کڑی شرطیں عائد کر کے قرضوں کے بوجھ کو پہلے سے بھی زیادہ ناقابلِ برداشت بنایا جا رہا ہے۔ ان حالات میں قرضہ دہندگان کا فیصلہ عام طور پر معاشرے کے غریب طبقے کے لیے نقصان دہی کا باعث بنتا ہے یعنی ان طبقات کے لئے جن کا معیارِ زندگی پست ترین ہے اور جو حکومت کی سرپرستی کے سب سے زیادہ مستحق ہوتے ہیں اور شاید اس حمایت کے علاوہ ان کے پاس زندگی گذارنے کا کوئی اور ذریعہ نہیں۔

ریوٹر کی اطلاع کے مطابق عالمی بنک نے گذشتہ چند برسوں کے دوران کئے گئے اپنے ایک مایوسانہ تجزیئے میں اس بات کی طرف اشارہ کیا تھا کہ اگر تیسری دنیا کے اقتصادی حالات میں

---

(۱)— برانٹ ویلی: جہانِ مسلح، جہان گرسنہ، ترجمہ از ہرمز ہمایون پور — انتشاراتِ انقلاب اسلامی، ص ۲۱۶۔

(۲،۳)— عالمی بنک اور ایسوسی ایٹڈ پریس کی رپورٹ کے مطابق ۱۹۸۶ء کے اختتام تک برازیل اور میکسیکو کے ذمّے قرضے کی جو رقم واجب الادا تھی وہ بڑھ کر علی الترتیب ۱۰۸ اور ۱۰۰ بلئین ڈالر ہو گئی ہے۔

ترقی نہ ہوئی تو قرض خواہوں اور قرض دینے والوں کے باہمی تعلقات ٹوٹ کر رہ جائینگے اور انجامِ کار بین الاقوامی مالیاتی نظام اور عالمی اقتصاد پر اس کا طویل المدت منفی اثر پڑے گا۔

اس رپورٹ کی بناء پر عالمی بنک نے یاد دلایا تھا کہ ۱۹۸۶ء میں ترقی پذیر ممالک کے ذمے واجب الادا قرضوں کی رقم بڑھ کر ۱۰۳۵ بلئین ڈالر ہو چکی ہے جبکہ ۱۹۸۵ء میں اصل رقمِ قرضہ تقریباً ۹۹۲ بلئین ڈالر تھی۔ عالمی بنک نے یہ پیش بینی کی تھی کہ ۱۹۸۷ء میں تیسری دنیا کے ملکوں کا قرضہ ۴ فیصد بڑھ چکا ہے اور قرضے کی مجموعی رقم ۱۱۰۸ بلئین ڈالر ہو گئی ہے۔ (۱)

مریض کے خُون کی مُنتقلی تندرست میں

گذشتہ چند برسوں میں قرض دینے والے ممالک سرمایہ برآمد کرنے والے بھی بن گئے ہیں اور یہ بڑی حیرت افزا اور عجیب سی صورتِ حال ہے۔ زرِ نقد کی بڑی بڑی خطیر رقمیں غریب ملکوں سے امیر معاشروں میں بہائی جا رہی ہیں۔ یہ رقمیں خصوصی بنکوں میں جمع کروادی جاتی ہیں اور ان کے واصل باقی (چٹھے) روشن سے روشن ترین ہوتے چلے جاتے ہیں۔

مقروض ملکوں کے پاس غالباً اس کے علاوہ کوئی اور چارۂ کار نہیں کہ اپنا قرض چُکانے کے لئے وہ انھی بنکوں سے قرض حاصل کریں۔ یہاں تک کہ امریکہ میں بھی "دیوالیہ ممالک کی رقوم کی تباہ کُن منتقلی" کا موضوع زبانِ زدِ خاص و عام رہا ہے۔ (۲)

میکسیکو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے جو برازیل کے بعد دوسرا ملک ہے جس نے غیر ملکی قرضوں کی سب سے بڑی رقم لے رکھی ہے۔

قرضوں کی بازادائی کی مدّت بڑھانے کا دوسرا پروگرام جو چودہ سال پر محیط ہے، اس ملک کے قرضے کی رقم کو ۱۳۰ بلئین ڈالر یعنی قرض کی اصل رقم کے ڈیڑھ گنا تک بڑھا دے گا۔

میکسیکو شہر میں بہت سی حکومتوں کے نمائندوں کے ایک اجلاس میں اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ آیا قرضوں کی بازادائی کی مدّت بڑھانے کے پہلے پروگرام میں قرضے کے تقریباً ۳۰ فیصد کے برابر رقم سُود اور خدمات کے عوض ادائگی میں صرف ہوئی تو سب کی

---

(۱)— روزنامۂ اطلاعات، مورخہ ۱۲ فروری ۱۹۸۷ء (۱۳۶۵/۱۲/۳) میں شائع شدہ ایک رپورٹ جو عالمی بنک کی رپورٹ سے نقل کی گئی—

(۲)— برانٹ ویلی: جہانِ مسلّح، جہان گرسنہ، ترجمہ از ہرمز ہمایون پور، انتشاراتِ انقلاب اسلامی، ص، ۲۱۹—

طرف سے اسکی تائید ہوئی کہ کم و بیش اتنی ہی رقم واقعاً صرف ہوئی ہے۔

دنیا کے مقروض ممالک کے موجودہ حالات کچھ اس طرح کے ھیں:

- ۳۶۰ بلئین ڈالر کا غیر ملکی قرضہ لینے کی وجہ سے لاطینی امریکہ کو صرف ۱۰ فیصد شرح سود پر ۴۰ بلئین ڈالر کی سالانہ ادائیگی نیویارک، لندن اور فرینکفرٹ کو کرنا پڑتی ہے۔ در حقیقت ۱۹۸۴ء میں لاطینی امریکہ کے سرمائے کی منتقلی ۵۵ بلئین ڈالر کے برابر تھی۔

- ۱۹۸۴ء کے شروع میں جب امریکی قرضوں کی طویل المدت سُودی شرح تقریباً تین فیصد تک جا پہنچی تو لاطینی امریکہ کے ملکوں کے قرض کی میزان میں اچانک ۵ بلئین ڈالر کا اضافہ ہو گیا۔

- ۱۹۸۴ - ۱۹۸۳ء میں سُود کے طور پر جو رقم لاطینی امریکہ کے ممالک نے ادا کی وہ اُن کی بر آمدات کی آمدنی سے بھی سو فیصد بڑھ جاتی ہے۔

ان حالات و شواہد کے زیرِ نظر مقروض ممالک مجبور تھے اور مجبور ہیں کہ اپنی بر آمدات سے کمائی ہوئی آمدنی کا ایک بڑا حصّہ حاصل کردہ قرض پر سُود کی شکل میں دوسروں کی نذر کر دیں۔ اگر 'ادائگیِ زرِ نقد' کو بھی شمار کر لیا جائے تو بعض ممالک میں سُود کے طور پر ادا کی جانے والی مجموعی رقم بر آمدات کی آمدنی سے بھی سو فیصد بڑھ جاتی ہے۔

بین الاقوامی مالیاتی فنڈ

بین الاقوامی مالیاتی فنڈ کی سیاست جو امریکی تجویز کے تحت عمل میں آئی تھی ابھی تک امریکہ ہی کے قبضے میں ہے اور اسی کی مرتب کردہ پالیسیوں کے مطابق کام کر رہی ہے۔

"جب ۱۹۷۱ء میں اس مالیاتی فنڈ نے دنیا کی مقروض حکومتوں کو اپنی من مانی شرائط سے آگاہ کیا تو اُس وقت کے صَدرِ امریکہ نکسن نے عالمی مالیاتی قوانین کو تبدیل کر دیا جسکی وجہ سے بین الاقوامی مالیاتی فنڈ کا ادارہ خاموش ہو کر رہ گیا۔ یہ امریکہ کی جانب سے بین الاقوامی مالیاتی فنڈ پر امریکی اثر و نفوذ کا ایک اور ثبوت ہے۔"

---

(۱)— مجلّہ آفریک آزی سے ایک نقل جو روزنامہ اطّلاعات مورخہ ۷ اپریل ۱۹۸۷ء (۱۳۶۶/۱/۱۸) میں شائع ہوئی۔

مقروض ممالک کی گلو خلاصی کے لیے عمومی اقدامات زیادہ تر ان تحریکوں میں نظر آتے ہیں جو بین الاقوامی مالیاتی فنڈ کی طرف سے عائد شدہ مالی پالیسیوں کے خلاف عوام کی پیدا کردہ تھیں۔

ایک دوسری اصل وجہ دنیا میں بڑھی ہوئی سُودی شرح ہے جسے ریاست ہائے متحدہ کے وسیلے سے عمومی مزاحمت کا سبب بنتے ہوئے نافذ کیا جاتا ہے۔ بعض ممالک میں تو یہ مزاحمت کافی منظم شکل میں ہوتی تھی لیکن چند ایک میں اسکی حیثیت از خود یا رضا کارانہ بھی رہ چکی ہے۔ افریقہ میں بین الاقوامی فنڈ کے خلاف عوامی تحریکیں بہت جوشیلی اور پُر تشدّد رہتی ہیں۔

گذشتہ چار سالوں کے دوران بین الاقوامی مالیاتی فنڈ کی ہدایات کے بموجب غذائی مواد کے سلسلے میں دی جانے والی امدادی رقم کی منسوخی اور عوامی خدمات کی سہولتوں میں کمی کر دینے کے باعث گھانا، زمبیا، مراکو، مصر، ٹیونس اور سوڈان میں کئی ایک پُر احتجاج مظاہرے ہوئے اور احتجاج کرنے والوں نے اپنے ملکوں کے خلاف لیا ہوا قرضہ واپس کرنے کے عام نعرے لگائے۔

تنزانیہ کے لیڈر جولیئس نائررہ نے جسے افریقی انجمن کا صدر منتخب کر لیا گیا تھا، نومبر ۱۹۸۴ء میں یہ کہا تھا:

"افریقی اقوام کو غیر ممالک کے قرضوں کی بازادائی سے انکار کر دینا چاہیے۔ ان پر لازم ہے کہ وہ قرض لازم ہے کہ وہ قرض دہندگان کو عالمی اقتصادی مشکلات حل کرنے میں زیادہ سے زیادہ تعاون کرنے پر مجبور کریں۔"

نائررہ نے اعلان کیا کہ تیسری دنیا کے ممالک قرض لینے یا دینے کے بارے میں خود ہی فیصلہ کر سکتے ہیں اور انہیں چاہیے کہ وہ قرضوں کی واپسی سے اُس وقت تک انکاری ہو جائیں جب تک وہ انہیں آسانی کے ساتھ واپس کرنے کے قابل نہ ہو جائیں۔

اگر افریقہ اپنے قرضہ جات ادا نہ کرے اور یہ اعلان کر دے کہ قرضہ جات اُس وقت تک واپس نہیں کیے جائیں گے جب تک ان کے طریقۂ واپسی کے متعلق کوئی سنجیدہ فیصلہ نہیں کر لیا جاتا تو اس صورت میں مغربی طاقتیں اپنا اجلاس بلا کر ان مسائل پر غور و خوض

کرینگی۔

غیر ملکی قرضوں کی بے اہمیتی کا بھانڈہ تو نائررہ نے علانیہ پھوڑ کر رکھ دیا تھا اور اس کا احساس کئی عشرے گذر جانے کے بعد اُس وقت ہوا جب سرمایہ دار اور صنعتی ممالک مالی اور تجارتی عالمی نظام میں کئی تبدیلیاں لا چکے تھے اور کئی ملئین افراد کو فقر وفاقہ میں مبتلا کر چکے تھے۔ ورنہ نائررہ پہلا اور آخری شخص نہ ہوتا جو مقروض ممالک کو لئے ہوئے قرضوں کی واپسی کے متعلق کہتا۔ ان حالات کے باوجود مقروض ممالک نے ابھی تک اس ضمن میں کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ وہ اس لئے کہ ان میں اتحاد نہیں۔ وہ ایک دوسرے سے علیحدہ ہیں اور قرض دہندگان اپنی اپنی سازشوں میں لگے ہوئے اور اپنی چالیں چلنے میں مصروف ہیں۔

اس عدم توافق کا بنیادی سبب یہ ہے کہ مقروض ملکوں میں خوشحال اور دولت مند اقلیتی گروہ اپنے آقاؤں کی طرف سے زمامِ اختیار سنبھالے ہوئے ہے اور دنیا میں اُن مروجہ قوانین کی حمایت کرتا ہے جس کی حفاظت اور نگہداشت اُس کی ذمہ داری ہے۔ اس گروہ کے افراد موجودہ قوانین کو اکثریت کے پسندیدہ قوانین پر ترجیح دیتے ہیں کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کریں تو عوامی و انقلابی طاقتوں کے ہاتھوں نیست و نابود ہو کر رہ جائیں۔

فصلِ چہارم؛ چند جملوں میں

o ـــــ استکبار جو اقتصاد کو زندگی کے عمدہ محور اور اصل مسائل میں سے ایک مسئلہ سمجھتا ہے، اپنی اقتصادی قوّت کی حفاظت اور اسے برقرار رکھنے کے لئے دوسری اقوام کے مختلف وسائل کے استحصال اور ان سے فائدہ اُٹھانے کو جائز قرار دیتا ہے۔

o ـــــ مسلّط کردہ یک پیداواری اقتصاد تیسری دنیا کے ممالک کو اپنے پھندے میں پھنسا کر بھی مغرب کی بڑھتی ہوئی دولت اور اقتصادی خوشحالی میں اضافہ کر رہا ہے۔

o ـــــ اگرچہ دوسری جنگِ عظیم کے نتیجے میں استعماری طاقتیں کمزور ہو چکی تھیں مگر استعمار گرانہ نصب العین اُسی طرح برقرار تھا۔ اس کے باوجود استعمار کی شکل و روش میں تبدیلی آگئی تھی۔ اب عوامی مزاحمت کو طاقت اور اسلحہ کی مدد سے کچلنے کی بجائے ان ممالک کے مالی و اقتصادی معاملات پر پوری طرح اپنا قبضہ جما کر بالواسطہ یا بلاواسطہ ان ممالک پر حکومت کی جانے لگی۔

o ـــــ استکباری حکومتوں کو یقین ہے کہ ان کی صنعتی و زرعی پیداوار تیسری دنیا کی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے کافی ہے۔ لہٰذا تیسری دنیا کے ملکوں میں صنعت و زراعت سے متعلق اشیاء پیدا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ استکبار کا یہ رویہ فی الواقع اپنی گرفت کو اسطرح مضبوط کرنے کے مترادف ہے کہ تیسری دنیا کے ممالک اپنی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے ان کی غلامی کا جُوا اپنے گلے میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ڈالے رہیں۔

o ـــــ بنکوں اور بڑی طاقتوں کا سرمایہ جو تیسری دنیا کے ملکوں میں قرضے کی صورت میں جاتا ہے، وہ ریلوے، بجلی گھروں، بندرگاہوں اور بنکوں وغیرہ کی کمپنیوں کو مصروفِ عمل رکھتا ہے۔ اسطرح وہ ان ممالک کے اقتصاد کے اہم اور بہت حساس شعبوں پر اپنا تفوّق قائم رکھتے ہیں اور ان ممالک کے اقتصادی مرض کو مُزمن بنا دیتے ہیں۔

o ——— ایسی کمپنیوں کے گروپ کے اتحاد و الحاق کو جو ایک ہی قسم کا سامان تیار کرتی ہوں کار ٹلز کہا جاتا ہے۔

o ——— ٹرسٹ ان کمپنیوں کے متحدہ کاروبار سے عبارت ہے جسمیں متوازی خطوط پر سب کا تعاون حاصل ہو۔

o ——— کثیر الاقوامی کار ٹلز اپنی مطلب بر آری کے لئے جائز و ناجائز طریقے سے پولیس راج قائم کرنے سے لے کر دہشت پسند گروہ تشکیل دینے تک ہر طرح کی سازشیں کرتے رہتے ہیں۔

فصلِ پنجم

انقلابِ اسلامی کے مقابلے میں استکباری سازشیں

ابتدائیہ:

سیاسی اصطلاح میں انقلاب کا مطلب یہ ہے کہ علاقے یا ملک کے عوام اپنا مطلوبہ نظام لانے کیلئے موجودہ حاکمیت کے خلاف بغاوت کر دیں۔ دوسرے لفظوں میں انقلاب عملی طور مروّجہ حالات کے خلاف اس شورش انگیزی کو کہا جاتا ہے جس سے کوئی نئی صورتِ حال پیدا ہو سکے۔ (۱) یہ تو انقلاب کا اصطلاحی اور عملی مفہوم ہے لیکن اس کے لُغوی معنی "قلب" کے مادہ سے ماخوذ ہیں جس کا مطلب تہ و بالا کرنا اور عام تغیّر و تبدّیل لانا ہے۔

عام طور پر انقلاب کے سلسلے میں دو نظریات پیش کئے جاتے ہیں۔

پہلا نظریہ: در حقیقت دنیا کے جملہ معاشرتی انقلابات اگرچہ بظاہر ان کی شکل و وضع ممکن ہے ایک دوسرے سے مختلف ہو لیکن بلحاظِ ماہیت وہ اقتصادی اور مادّی واقع ہوئے ہیں۔

دوسرا نظریہ: جملہ انقلابات محض مادّی اصل کے ہی حامل نہیں۔ اس دوسرے نظریئے کے مطابق اقتصادی اور معاشرتی نقطۂ نظر سے معاشرے کے خوش حال اور محروم، دو طبقوں میں تقسیم ـــــ انقلاب لانے کے لیے ـــــ شرطِ لازم نہیں ہے کیونکہ اس بات کا بہت امکان ہوتا ہے کہ انقلابی بھی انسانی خوبیوں کے حامل ہوں اور عوام اپنے کھوئے ہوئے حقوق حاصل کرنے کے لئے باغی ہو جائیں۔

ان مذکورہ دو نظریوں کے علاوہ انقلاب کی ماہیت تصوّری و خیالی بھی ہو سکتی ہے۔ جو

---

(۱)ـــ اُستاد شہید مطہری، مرتضےٰ: پیرامونِ انقلابِ اسلامی۔ انتشارات صدرا، ص ۲۹۔

لوگ ایک مکتبِ فکر پر ایمان و یقین رکھتے ہیں اور اس مکتبِ فکر کی روحانی قدروں کے ساتھ سختی سے وابستہ ہیں، جب وہ دیکھتے ہیں کہ انکا مکتبِ فکر معرضِ خطر میں ہے اور اُسے فسخ کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں تو وہ غصّے سے بھڑک اٹھتے ھیں اور برافروختگی کے عالم میں اپنے اصولِ مکتب کو برقرار رکھنے اور اسے ترویج دینے سے روکنے پر غصّے میں انقلاب لانے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ (۱)

انقلابِ اسلامی کے عوامل کی تفسیر و تجزیہ کرتے ہوئے بعض حلقے اس بات کے قائل ہیں کہ انقلاب صرف ایک ہی سبب کا نتیجہ تھا۔ لوگوں کے ایک گروہ کا یہ خیال ھے کہ انقلاب کے پیچھے صرف اقتصادی اور مادی عوامل کارفرما تھے۔ ایک اور گروہ صرف حُریّت طلبی کے جذبے کو اس کا محرک قرار دیتا ہے اور بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ روحانی اور دینی معتقدات ہی اصل میں انقلاب کی بنیاد ثابت ہوئے ہیں۔

"انقلابِ اسلامِ ایران جیسا کہ بہت سے اہلِ نظر اور اربابِ دانش نے اعتراف کیا ہے، اپنی نوعیت کا واحد انقلاب ہے جسکی مثال دنیا میں نہیں مل سکتی۔ جو گروہ تین خود مختار عوامل کا قائل ہے، وہ انقلاب کی یکتائی کے متعلق کہتا ہے:

دنیا میں کسی ایسے انقلاب کا نشان تک نہیں ملتا جسمیں ان تین عوامل نے دوش بدوش کام کیا ہو۔ اس طرح مذکورہ حلقہ بھی گویا اس انقلاب کو بے مثال تسلیم کرتا ہے۔

اسلامی انقلاب کا مطلب اس راستے پر گامزن ہونا ہے جو اسلام اور اسلامی اقدار کی طرف لے

---

(۱)— عوامی اور فوجی انقلاب کے مابین فرق یہ ہے کہ عوامی انقلاب اپنی ماہیت میں عوامی بغاوت کا نتیجہ ہوتا ہے، جبکہ فوجی انقلاب کی شکل یہ نہیں ہوتی۔ فوجی انقلاب کے معاملے میں ایک مسلح اقلیت یا گروہ کو مزاحمت کرکے دوسرے گروہ یا اقلیت پر جو معاشرے کی اکثریت پر حاکم ہو غلبہ حاصل ہو جاتا ہے۔ اسطرح غلبہ پانے والا گروہ وہاں کے قائم شدہ نظام کو بدل دیتا ہے اور اسکی جگہ نیا نظام نافذ کرتا ہے۔ تاریخِ انسانی میں ابتک جو فوجی اور عوامی انقلابات رونما ہو چکے ہیں، انقلابِ اسلامی ایران اپنے لفظی معنوں میں درحقیقت ایسا انقلاب ہے جسکی نظیر اگر ہم دیکھنا چاہیں تو صدرِ اسلام میں شاید دیکھ سکیں۔ اس انقلاب کی انقلابی ماہیت تاریخِ عالم کے بہت سے خالص ترین انقلابات سے بھی خالص تر ہے اس انقلاب میں عوام کی اکثریت نے جس میں زن و مرد اور پیر و جوان سبھی شامل تھے خالی ہاتھوں لیکن انقلابی جذبے کے ساتھ ایک طاقتور حکومت کے خلاف عَلم بغاوت بُلند کیا اور کامیابی حاصل کی۔

(اُستاد شہید مطہری، مرتضیٰ: پیرامونِ انقلابِ اسلامی، انتشارات صدرا، ص ۳۰)

جائے۔ لہٰذا انقلاب لانے یا جدوجہد کرنے کی اصل غایت بھی یہی ہے کہ اسلامی قدروں کی حفاظت ہو اور ان کا کماحقہٗ اجراء کیا جائے۔" (۱)

عظیم اسلامی انقلاب نے ۱۱ فروری ۱۹۷۹ (۲۲ بھمن ۱۳۵۷) کو اپنی کامیابی کے بعد طرح طرح کے ان خطروں کو عبور کیا جو بالواسطہ یا بلاواسطہ استکبار کے وسیلے سے اسکی راہ میں پیدا کئے گئے تھے اور یہ اسی شجرۂ طیبہّ کی مانند ابھی تک بڑی شان سے پروان چڑھ رہا ہے۔

استکبار نے اس انقلاب کے خاص کردار یا اسکی خاص خوبیوں کے زیرِ نظر ہر طرح کے حیلوں بہانوں سے کام لیا کہ ایران میں اس نئے نئے قائم شدہ اسلامی نظام کو زوال آشنا کر کے شکست دی جائے۔ چنانچہ پہلے تو اس نئے نظام کو منتشر اور ختم کرنے کے لئے کردستان، ترکمان صحرا، خوزستان، گبند، ارومیہ اور بلوچستان وغیرہ میں داخلی جھگڑے، اشتعالات، تفرقہ پردازی اور قومی مسائل چھیڑ کر رخنہ اندازی کی گئی۔ بعد میں اپنی تمام طاقتیں دائیں اور بائیں بازو کی جماعتوں کے انتہا پسند عناصر کی حوصلہ افزائی کرنے اور اُنہیں تقویت دینے میں صرف کر دیں۔ علاوہ ازیں استکباری سازشوں نے معروف شخصیتوں کے قتل، فوجی بغاوت کی منصوبہ بندی، براہِ راست فوجی حملے، ایک طویل المیعاد جنگ مسلّط کرنے اور اسلامی جمہوریۂ ایران کے خلاف عراق کو ننگی جارحیت کرنے پر اُکسانے کے اقدامات بھی کئے۔

خوش قسمتی سے ان تمام سازشوں کے باوجود اسلامی انقلاب تیز قدمی سے رواں دواں ہے اور اس نے دنیا بھر سے استعمار اور استعمار گروں کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنے اور مستضعفین کی امداد کرنے کا تہیّہ کر رکھا ھے تاکہ وہ مستکبرین کا مقابلہ کر سکیں۔ اب جدوجہد آزادی کے میدان میں اسلامی انقلاب نے غیروں کے تسلّط سے رہائی حاصل کرنے کے لئے نئے نئے راستے متعارف کروا دیئے ہیں۔

اسمیں کوئی شک نہیں کہ بین الاقوامی جھگڑوں اور کشمکشوں میں عالمی استکبار کے ساتھ آزادی بخش تحریکوں کے مقابلے میں اسلامی انقلاب نے ایک بالکل نیا نمونہ اور نئی مثال قائم کی ہے

دنیا کی کمزور اور مستضعف اقوام کی نگاہیں اب اسلامی انقلاب کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ اُنہیں

---

(۱)— استاد شہید مطہری، مرتضیٰ: پیرامونِ انقلابِ اسلامی، انتشارات صدرا، ص ۴۰، ۵۳۔

اسپر تعجّب ہے کہ ایک مثالی نظام جو روحانیات پر مبنی ہے اور عوامی مدد جو جذبۂ ایثار سے مملو ہے وہ مقابلے کے تمام میدانوں میں دنیا بھر کے ظالموں اور مستکبروں سے بازی لے جائے! اس کے علاوہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ موجودہ تقطیبات کو دنیامیں کسی قسم کی اہمیت دیئے بغیر بڑے اعتماد کے ساتھ آزادانہ طور پر پیش روی بھی کی جاسکتی ہے اور مشرق و مغرب کی چھوٹی بڑی حکومتوں کا سہارا لئے بغیر اُن کی حکم عدولی یا ان کا مقابلہ بھی کیا جاسکتا ہے؟

استکبار نے اس وسیع دامنِ انقلاب کو کُچلنے کے لئے ہر طرح کے دھوکے، فریب اور سازش سے کام لیا اور نت نئی شکلوں میں روز نئے فریبوں اور نئی چکربازیوں سے اسلامی انقلاب کا مقابلہ کیا جاتا ہے۔ بلاخوف تردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ ظالم و جابر اور مستکبر طبقے نے جو بھی سازش پورے تاریخی نشیب و فراز میں عوامی انقلابات اور مذہبی و عوامی تحریکوں کے خلاف کی ہے وہ بڑی طاقتوں خصوصاً امریکی شیطانِ بزرگ نے اسلامی انقلاب کے خلاف ضرور آزمائی ہے۔ برطانیہ، امریکہ، صہیونی حکومت، روس، فرانس، اور جملہ توابع ریاستوں اور پٹھو حکومتوں نے مل کر نئے قائم شدہ اسلامی انقلاب کے خلاف متحدہ محاذ بنا رکھا ہے اور اسلامی جمہوریۂ ایران کے خلاف ثقافتی، تبلیغاتی، نفسیاتی اور سیاسی جنگ کے علاوہ بے اعتمادی، افواہ طرازی اور اقتصادی ناکہ بندی سے لے کر جنگ مسلّط کرنے اور انقلاب دشمن رجحانات کو تقویت دینے اور ان سے فائدہ اُٹھانے تک ہر طرح کی سازش کی منصوبہ بندی کی جارہی ہے۔

اگلے ابواب ان سازشوں کے بعض حصّوں کے جائزے اور تجزئے پر مشتمل ہیں۔

اسلامی جمہوریۂ ایران کے خلاف ثقافتی جنگ

ایران میں اسلامی انقلاب کی ظفرمندی دنیا بھر، خصوصاً مشرقِ وسطیٰ میں ایک نئے دور کی نقیب ثابت ہوئی۔ اگرچہ شروع میں انقلاب اپنی وسعتوں اور پُر تیلے نیز جامع اثرات کی وجہ سے صحیح طور پر پہچانا نہ جاسکا لیکن جونہی انقلاب کے آثار نظر آنے لگے، انہی ابتدائی

مہینوں اور سالوں میں ملک کی جغرافیائی حدود سے باہر چھوٹی اور بڑی طاقتوں کی جانب سے انقلاب کے خلاف اُن کا ردِّ عمل بھی آنے لگ گیا۔

مخالفین کے مقابلے میں استکبار کے ردِّ عمل کے عمومی خصائص

ابتک دنیا نے خاص طور پر بیسیویں صدی میں بہت سے انقلابات دیکھے ہیں ان میں سے شائد ہی کوئی انقلاب مختصر سی مدت میں اتنا کارگر اور سریع الاثر ثابت ہوا جیسا کہ اسلامی انقلابِ ایران خصوصی طور پر مشرقِ وسطیٰ اور عمومی طور پر دنیا بھر میں ہوا ہے۔ اس لئے ابتدائی برسوں سے ہی اس انقلاب کے خلاف سنجیدہ قسم کا ردِّ عمل شروع ہو گیا تھا۔ اس کے نتیجے میں انقلاب کو ہمیشہ مخالف قوتوں یعنی ملک کے اندر تو غیر ملکی ایجنٹوں اور ملک سے باہر انقلاب دشمن طاقتوں کا براہِ راست مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ مختصراً ردِّ عمل کے ان اقدامات کے مخصوص خصائص حسبِ ذیل ہیں:—

۱— اس کی جامعیّت

مخالفین صرف بُنیادی اقتصادی، تبلیغاتی اور نفسیاتی مقابلے پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ وسیع تر فوجی اور عملی اقدامات کا بھی سہارا لیتے ہیں۔ اس طرح وہ ہر طرف عوامی جنگ کے آغاز کا موجب بن جاتے ہیں۔

۲— سازشوں کی منصوبہ بندی

ردِّ عمل کے ہر پہلو کے لئے کم، اوسط اور زیادہ مدّت کی منصوبہ بندی تو پہلے ہی تیار کی ہوئی ہے۔ قدرتی طور پر وہ اندازہ لگالیتے ہیں کہ اگر ان کی کم مدّت والی منصوبہ بندی کامیاب نہ ہوئی تو پھر انہیں اوسط یا زیادہ مدّت والی منصوبہ بندیوں میں سے کوئی ایک اختیار کرنا پڑے گی۔

دوسری طرف جیسا کہ پہلے ذکر ہوچکا ہے، مثال کے طور پر اگر وہ اقتصادی یا فوجی محاذ پر کامیاب نہ ہوسکے تو ممکن ہے ثقافتی یا تبلیغاتی میدان میں کامیابی سے ہمکنار ہو جائیں اور آگے چل کر یا زیادہ مدّت کی منصوبہ بندی کے مطابق عام جنگ کا اعلان کر دیں۔

۳۔ تشدُّد و تمرُّد

یہ بڑا سخت اور کھٹن مقابلہ ہے۔ معاصر ممالک کی تاریخ میں کسی انقلاب کے خلاف اس قسم کے تشدّد اور وسیع نبرد آزمائی کی مثالیں بہت کم مشاہدے میں آئی ہیں۔ اگر اس موضوع کا مطالعہ فوجی نقطۂ نظر سے کیا جائے تو مسئلہ بالکل صاف ہوجاتا ہے۔ اگر اسے جوابی پراپیگنڈے کے زاویئے سے دیکھا جائے پھر بھی صاف طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اب تک اس قسم کی پراپیگنڈہ مُہم کسی انقلاب، کسی قوم یا کسی مکتبِ فکر کے خلاف دیکھنے میں نہیں آئی۔ ثقافتی زاویئے سے اس کے ابعاد تو بعد میں بیان کیے جائیں گے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس نوعیت کے ردِّ عمل کی مثال کہیں اور نہیں ہے۔

اس کے باوجود کہ ثقافت ہی تمام جھگڑوں اور لڑائیوں کا اصل منبع ہے اور انسانی تاریخِ معاشرت کے ابتدائی ایام سے ثقافتی مقابلہ ہی تمام تر رقابتوں کا سرچشمہ بنا رہا ہے۔ یہ اہم مسئلہ پھر بھی صحیح طور پر زیر بحث نہیں آیا۔ شائد اسکی وجہ یہ ہو کہ ہم زیادہ تر توجہ اقتصادی پہلوؤں جیسے اقتصادی جنگ، اقتصادی ناکہ بندی، اقتصادی سازشوں اور اس طرح کی دیگر جہات کی طرف مرکوز کرتے رہے ہیں۔ لیکن اس معاملے کا اگر بنظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو ہم دیکھیں گے کہ ان جھگڑوں کی اصل وجہ وہی ثقافت کا تضاد و تقابل ہے جس کی طرف ہم نے کوئی توجہ نہیں دی اور دشمنوں نے انقلابِ اسلامی کا سامنا کر کے اس پر کافی توجہ دی ہے۔

دوسرے لفظوں میں اس انقلاب کی عظمت کسی اور چیز سے زیادہ اس کے ثقافتی ابعاد میں ہے۔ چنانچہ انقلاب کے ثقافتی پہلو ہی کو زیادہ قوی اور سخت ترین دفاع کا ہدف بنایا گیا۔

ثقافتی جنگ کی خصوصیات

ثقافتی جنگ کی کچھ اپنی ہی خصوصیات ہوتی ہیں اور ان کا مقابلہ محض آج کی دنیا کو پیش آنے والے واقعات کی نسبت سے اسلامی انقلاب کے ساتھ نہیں کیا جاسکتا لیکن دنیا سے یہ ثقافتی مڈبھیڑ آج مخصوص امتیازات کی حامل ہے اور کبھی کبھی تو بہت تند و تیز اور پُر تشدّد ہو جاتی ہے۔

اسکی چند خصوصیات درج ذیل موضوعات سے عبارت ہیں:

۱— دراز مُدّت

ثقافتی جنگ کو اسلامی انقلاب کے خلاف استکباری چیلنج کے طویل المیعاد پروگراموں کا ایک حصّہ بھی کہا جاتا ہے۔ تبلیغاتی جنگ کی توّجہ زیادہ تر کم مدّت کی منصوبہ بندیوں پر مرتکز رہتی ہے جبکہ ثقافتی جنگ ثقافت کے دیرپا اور ریشہ دار ہونے کے سبب طویل المیعاد جنگ ہے اور خصوصًا اس کام کے لئے بڑی بھاری سرمایہ کاری بھی کی جاتی ہے۔

۲— بُنیادی اور انتہا پسندانہ

ثقافتی جنگ بُنیادی اور اپنی جڑ یا اصل سے متعلق ہوتی ہے۔ بہ الفاظِ دیگر اگر دشمنوں کو کسی نہ کسی طرح ہر محاذِ جنگ پر شکست کا سامنا کرنا پڑے اور اُن کی سازشیں ناکام ہو جائیں یا اُن کے اپنے حساب کے مطابق مکمل فتح حاصل نہ ہو سکے لیکن ثقافتی جنگ میں کامیاب ہو جائیں (خواہ وہ کتنی ہی طویل المیعاد کیوں نہ ہو) تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ انہوں نے اپنے تمام مقاصد حاصل کر لئے ہیں۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ بُعد کی صورت میں اس انقلاب کی بنیادیں جو نئی ثقافتی قدروں اور معیاروں پر اُٹھائی گئی ہیں یکسر ہل کر رہ جائینگی اور منہدم ہو جائیں گی۔

مذکورہ حقیقت کے باوجود مخالفین، اسلام اور اسلام کی بنیادی تعلیمات کے خلاف ہرزہ سرائی کرتے ہیں۔ وہ یہ کہتے پھرتے ہیں کہ اسلام کے ثقافتی ابعاد انقلاب کو بہت سے زاویوں سے غیر ضرر پذیر بنانے کا سرچشمہ ہیں جسکی وجہ سے انقلاب کو یہ عظیم حیثیت حاصل ہوئی ہے۔ لہٰذا ان کے نقطۂ نظر سے اِسی بُعد کو حملہ آوری کا نشانہ بنانے کی ضرورت ہے۔
یہاں یہ ذکر بے جا نہ ہوگا کہ اس انقلاب کے اسلامی پہلو کو چیلنج کرنا اگرچہ استکباری ثقافت کے طویل المیعاد پروگرام کا ایک حصّہ ہے تاہم کم عرصے کی پراپیگنڈہ مُہم میں بھی اس امر کو مدِ نظر رکھا گیا ہے اور یقیناً یہ اقدامات بھی اسی لئے کئے گئے ہیں کہ ثقافتی جنگ کو مشتعل کرکے اُسے کامیابی سے ہمکنار کرنے کی کوشش کی جائے۔

۳۔۔۔ بظاہر حق بجانب اور قانونی

دوسری طرف یہ جنگ عام جنگوں کے برخلاف غیر محسوس اور غیر مرئی ہے۔ بہ الفاظِ دیگر ظاہری طور پر یا کم از کم صریحاً ایسی کوئی چیز دکھائی بھی نہیں دیتی جس میں آپس میں مقابلہ جاری ہو اور اگر ایسی کوئی چیز موجود ہے بھی تو اُسے قابلِ قبول، رسمی، قانونی اور حق بجانب طریقے سے پیش کیا جائے یا سامنے لایا جائے۔ ہر فرد، ہر گروہ اور ہر مکتبِ فکر کو اپنی بقا اور اپنے مخالفین کے خلاف بعض اقدامات کرنے پڑتے ہیں اور یہ فطری امر ہے۔ اسلامی انقلاب کے خلاف ثقافتی جنگ بھی اسی فلسفے کے ڈھانچے میں لڑی جارہی ہے۔

۴۔۔۔ بالواسطہ

ایک اور زاویۂ نگاہ سے کہا جاسکتا ہے یہ بالواسطہ جنگ ہے اور اسی وجہ سے غیر محرّک ہے۔ ممکن ہے فوجی جنگ یا اقتصادی جنگ کوتاہ مدّت میں بلاواسطہ مڈبھیڑ پر منتج ہو یا دشمنوں کو شاید ہزیمت اُٹھانا پڑے لیکن اُن کا خیال ہے کہ ثقافتی جنگ مذکورہ صدر دلائل کے زیرِ نظر کوتاہ مدّت میں کسی بلاواسطہ آویزش کا باعث نہیں بنے گی۔ اس لئے یہ منصوبہ طویل مدّت

تک کے لئے جاری رکھا جاسکتا ہے۔

ثقافتی جنگ کے پاس بھی خاص اور جانے پہچانے محوری نکات ہوتے ہیں ان میں بعض نئے نہیں بلکہ پُرانے ہوتے ہیں اور ماضی میں ان سے کام لیا جاتا رہا تھا لیکن حال ہی میں اُن کی تجدید کرائی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے عرب اور غیر عرب کے مابین جنگوں کی پرانی رقابتوں سے ایک نیا حیلہ گھڑ لیا ھے اور اُسے اپنے حالیہ مفادات کے لئے استعمال کیا ھے۔

بیسویں صدی کے آغاز میں حکومتِ عثمانیہ کے انہدام اور ایران و ترکی میں پٹھو حکومتوں کے قیام سے اس حیلہ گری سے استفادے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی لیکن اسلامی انقلاب کی ظفرمندی نےاس حیلہ گری کو پھر کام پر لگادیا۔ یہاں تک کہ مسلّط کردہ جنگ کو اُسکی تمام پیچیدگیوں کے ساتھ اس انکار کے حق بجانب ہونے کے طور پر پیش کیا گیا اور اس جنگ کے فلسفے کو عربوں کی حاکمیت (برتری) اور غیر عربوں کی محکومیت کے رنگ میں بیان کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ "صدام" "قادسیہ" کا مسئلہ پیش کرتا ہے۔

اس ثقافتی جنگ کی دوسری مثال شیعہ اور سُنی فرقوں کے مابین جھگڑوں کی ہے جن میں اکثر گذشتہ صدیوں میں رونما ہوتے رہے ہیں۔ ان جھگڑوں کا ایک اپنا تاریخی پس منظر ہے اور شیعہ سُنی کے درمیان فکری اور اعتقادی اختلافات کا تعلق بھی ایک علیحدہ موضوع سے ہے۔ لیکن واقعتاً یہ کہا جاسکتا ہے شیعہ و سُنی کے درمیان لڑائیوں کا چند صدیاں پہلے کوئی نشان تک نہ تھا حالانکہ دونوں فرقوں کے اعتقادی اختلافات تاریخ سے بھی پرانے ہیں۔ دشمن ان اختلافات کا جو بعض اوقات جنگ پر منتج ہوتے ہیں، تھوڑے سے وقت کے لئے ان سے غلط فائدہ اُٹھا کر، بعد میں اُن سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔

انقلابِ اسلامی کی فتح مندی سے قبل، شیعہ سُنی مسئلے، ان کے باہمی مناقشات اور ان کے متعلق بحث و تمحیص وغیرہ کا پروپگنڈا اسطرح نہیں کیا جاتا تھا جیسے آج کیا جاتا ہے اور اگر کبھی کوئی بحث وغیرہ ہو بھی جاتی تھی تو اسے اعتقادی قالب میں ڈھال کر ختم کر دیا جاتا تھا۔ لیکن انقلابِ اسلامی کی کامیابی کے بعد دوبارہ اس مسئلے کو فوجی جنگ کا نہیں بلکہ محض جنگ کا موضوع ٹھہرالیا گیا۔ یہاں تک کہ آج بھی کُردستان کے علیحدگی پسندوں کی تخریبی کاروائیوں کو حق بجانب قرار دیتے ہوئے ہم اسی موضوع سے دوچار ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں اسکی

موجودگی ہمیں اُس جنگ میں بھی نظر آتی ہے جو عراق نے اسلامی جمہوریۂ ایران پر مسلّط کر رکھی ہے۔

شیعہ و سُنی کے مابین اختلاف خواہ مسلمانوں کے اعتقادی و نفسیاتی مسائل کے نقطۂ نظر سے ہو یا استکبار نے گزشتہ چند برسوں میں جو استحصال کیا ہے، اُس کے زاویہ نگاہ سے ہو، اس پر بحث کرنا بہت دشوار امر ہے۔ یہ نکتہ کہ اسلامی جمہوریۂ ایران نے اب تک اس کی روک تھام کرنے کے لئے کیا اقدامات کئے ہیں خود ایک ایسی بحث ہے جسے چھیڑنے کے لئے مناسب وقت کا انتظار ہے۔ اجمالاً یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسلامی جمہوریۂ ایران نے اس سلسلے میں عالمی سطح پر جو وسیع اور مثبت اقدامات کئے ہیں، ہم خود اس کے شاہد ہیں۔

یہ تذکرہ بھی یہاں لازم ہے کہ بعض معاملات میں فائدہ اٹھانے والے اپنے فائدے کے لئے بے خبر افراد کو بھی آلۂ کار بنا لیتے ہیں۔ موجودہ ثقافتی جنگ میں دنیا کی دو بڑی طاقتیں عالمی سطح پر مل جُل کر کام کر رہی ہیں۔ مثال کے طور پر مشرقی بلاک کی طرف سے مذہب کو دی گئی خاص تفسیر کے باوجود ہمارا مشاہدہ ہے کہ انقلابِ اسلامی کی کامرانی کے بعد انہوں نے بھی شیعہ سُنی کا مسئلہ کھڑا کر دیا اور اس سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں حالانکہ کمیونزم کا فرض یہ تھا کہ اپنے مذہب کے خلاف نظریات کی وجہ سے اسکو موضوعِ بحث نہ بناتا۔ بہر حال ایسے واقعات میں مغرب کا ایک طویل ماضی ہے۔

یہ جنگ اپنی محتویات، مقاصد اور وضع کے لحاظ سے بالکل نئی ہے اور ابتک اس ترکیب اور انداز کی دوسری کوئی مثال سامنے نہیں آئی۔ یہ ایک خطرناک جنگ ہے جس میں "اسلام بمقابلہ اسلام" ہے۔

معاصر صدیوں کے دوران اسلامی دنیا میں نہ کوئی اسلامی طاقت موجود تھی اور نہ ہی کوئی ایسی طاقت کا دعویدار تھا اور جو موجود تھے اُنکی حیثیت غیر ملکی پٹھوؤں اور کاسہ لیسوں کی تھی جسکی وجہ سے دیگر اقوام کی نظروں میں نہ ان کا کوئی اعتبار تھا اور نہ کوئی وقار۔

صرف اسلامی انقلابِ ایران کی ظفر مندی سے اسلامی انقلاب کے مظاہرات، اسلامی نظام، اسلامی قوانین، اسلامی حاکمیت اور حقیقت میں اسلام کی کلّیت و جامعیت ملکی سیاست کے ہر شعبے میں کار فرما ہو گئی۔

استکبار اپنے اُن تجربات کو استعمال میں لا رہا ہے جو اُس نے گزشتہ دو تین صدیوں کے دوران خاص کر مشرقِ وسطیٰ (۱) میں کئے تھے تاکہ وہ اس نئی صورتِ حال سے عہدہ بر آ ہو سکے۔ وہ اپنے ایک بہترین حربے یعنی داخلی خلفشار کو اسلام کے نام پر ہوا دے کر بالآخر "اسلام بمقابلہ اسلام" کی جنگ کا آغاز کر رہا ہے۔ البتّہ اس جنگ کو شروع کرنے والی اور اسکی متولی حکومتِ حجاز ہے (یعنی سعودی عرب کی حکومت) جسکی تیل سے آمدنی کئی بلیئن ڈالر کے برابر ہے۔ (۲) ایک ایسا ملک جو خانۂ خُدا اور حرمین شریفین کی تولیت کا دعویدار ہو! اور وہاں کا سلطان!! جو اپنے آپ کو خادم الحرمین الشریفین کہلانا پسند کرتا ہو۔

قابلِ توّجہ تو یہ بات ہے کہ تحریک اتنی منظم اور وسیع واقع ہوئی تھی کہ گذشتہ تین یا چار برسوں میں ہی اس کے اندر عالمی سطح کے رجحانات نظر آنے لگے۔ سعودی عرب کے فرمانرواؤں نے مذہبی مدارس، یونیورسٹیوں، مسجدوں اور کتب خانوں کے قیام نیز نمازِ جمعہ وغیرہ۔۔۔۔ کے اماموں کو تربیت دینے کے سلسلے میں جو کوششیں پچھلے دو تین سالوں میں کی ہیں نہ صرف یہ کہ ان کی نظیر گذشتہ چند عشروں میں بلکہ پچھلی ایک دو صدی کے دوران بھی کم ہی دیکھنے میں آئی ہے۔

ایک دستیاب تفصیلی رپورٹ سے پراپیگنڈے کی چالوں اور اس مالی امداد کا پتہ چلتا ہے جو سعودی عرب نے ان اداروں کو برقرار رکھنے کے لیے مہیا کی ہے۔ اس رپورٹ کے مطابق سعودی عرب اپنے ڈپلومیٹک لیور (بیرم) بھی ان اہداف تک پہنچنے کے لیے استعمال میں لاتا ہے۔

پچھلے چند برسوں سے سعودی حکومت کے اربابِ اختیار نے برّاعظم افریقہ پر اپنی توّجہ مرکوز کر رکھی ہے۔ سعودی حکومت کی کوشش یہ ہے کہ دو مختلف طریقوں سے وہ افریقی ملکوں سے اپنے روابط استوار کر لے۔ ایک تو سیاسی طریقے سے اور وہ افریقہ کے مختلف ممالک کے ساتھ تعلقات قائم کرکے اور دوسرے اُن اسلامی و مالی اداروں کے توسّط سے جو سعودی عرب سے ملحق ہیں۔

---

(۱)۔۔۔ شائد دنیا کے دیگر حصوں میں استکباری نظام اس قسم کے تجربوں سے فائدہ نہیں اُٹھا سکا۔

(۲)۔۔۔ ایک امر جسکی عالمی سیاست کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی یہ ہے کہ ایک گروہ جو غیر مُلکی طاقتوں کا دستِ نگر ہو ایک قوم کی دولت اور اسکی تقدیر پر مسلّط ہو جائے اور بعد میں ملک کا نام حکومت کرنے والے پٹھو خانوادے کے نام سے بدل دے۔

سالِ گزشتہ رابطۂ عالمِ اسلامی اور اسلامی ترقیاتی بنک کے سربراہوں نے کئی مرتبہ افریقی ممالک کا دورہ کیا۔ وہ خاص اسباب جو سعودی عرب کے لیے اس تحریک کا باعث بنے مندرجہ ذیل ہیں :

الف— اسلامی تشخّص حاصل کرنے کی کوشش؛ اسلامی ممالک کی طرف سے حمایت خواہی اور اسلامی جمہوریہ سے روابط قائم رکھنے کی ہمّت شکنی۔

ب— اسلامی جمہوریہ کے اثر و نفوذ کے خلاف صف آرائی۔

پ وہابیت کی تبلیغ۔

دراصل یہ تینوں اسباب یکساں نوعیت کے ہیں۔ بہرکیف یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ایک ایسی جنگ کے متعلق جو مذکورہ صدر شکل و وضع اور محتویات کی حامل ہو، یہ گمان بھی نہیں کیا جاسکتا کہ وہ سعودی فرمانرواؤں کا براہِ راست اقدام ہوگی۔ احتمال ہے کہ اسکی منصوبہ بندی اور ہدایت کاری دوسری طاقتوں کی مرہونِ منّت ہو کیونکہ سعودی عرب جیسے ملک میں جہاں کسی کام کو شروع یا اسکی منصوبہ بندی کرنے کا فقدان صاف ظاہر ہے۔ یہاں تک کہ معمولی کام بھی وہاں غیر ملکی ہی انجام دیتے ہیں۔ یہ بات تسلیم نہیں کی جاسکتی کہ سعودی عرب اس قسم کی منصوبہ بندی، جس میں تنظیمی قابلیت اور ماہر متخصّصین و تجربہ کار افراد کی ضرورت ہوتی ہے، خود کر سکے ۔

دیگر ذرائع سے موصول ہونے والی اطلاعات سے پتہ چلا ہے کہ سعودی خانوادے نے کمپیوٹر سے کام کرنے والا دنیا میں سب سے بڑا پرنٹنگ پریس مدینے میں لگایا ہے جس پر ۱۵۰ ملین ڈالر کی لاگت آئی ہے اور اس کے لئے ۱۰۰ ملئین ڈالر کی رقم ہر سال بجٹ میں رکھی جاتی ہے۔ فیصلہ کیا گیا ہے کہ یہ چھاپہ خانہ ہر سال قرآنِ مجید کی سات ملئین جلدیں اور اسی طرح شیعہ مذہب کے خلاف بہت سی کتابیں بھی شائع کرے گا۔ یہ ادارہ ایک امریکی فرم کی زیرِ نگرانی و ہدایت کام کرنے کے لئے تشکیل دیا جارہا ہے۔

ثقافتی جنگ کا دوسرا محور ایک طرف مسیحیت اور یہودیت کی جنگ ہے تو دوسری طرف اسلام کی جنگ ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ مسیحیت و یہودیت کا باہمی گٹھ جوڑ ہے جو اسلام کے مقابل نبرد آزما ہے۔ تاہم اسلام کے خلاف ان ہر دو مذاہب کی دشمنی بہت ریشہ دار موضوع کی حیثیت رکھتی ہے جسکی اصل کا سراغ ظہورِ اسلام ہی سے لگایا جاسکتا ہے۔

واقعی اسلام ہی صرف ایک ایسا دین ہے جو ان کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ محض یہی دین خداوندی جسے وہ اپنا مدِ مقابل سمجھتے ہیں، اسلام ہے*۔ اس طرح چودہ صدیوں کے دوران باہمی جھگڑوں اور مقابلوں کا وجود رہا ہے لیکن آج کی دنیا میں ان کی وسعتوں میں بہت اضافہ ہو گیا ہے۔ یہ مسئلہ تمام ممالک میں خصوصاً کاسہ لیس ریاستوں میں پوری طرح مشاہدے میں آتا ہے۔

ثقافتی جنگ کا ایک اور محور لبرلزم (حُریّت پسندی) ہے۔ یہ ممالک اپنی مخصوص ثقافت کے ساتھ کہ ہم جسے لبرلزم (Liberalism) کے عنوان سے پہچانتے ہیں، اپنے خاص حربوں مثلاً انسانی حقوق، عورت کے حقوق، بنیادی آزادیاں وغیرہ کے نام سے اسلام کے خلاف ثقافتی جنگ لڑتے ہیں، تو یہ حربہ صرف اسلامی انقلاب کے ہی خلاف استعمال نہیں کیا جاتا بلکہ ہر مخالف تحریک کے خلاف آزمایا جاتا ہے۔ لیکن یہاں جو چیز زیر بحث ہے وہ ان حربوں سے فائدہ اُٹھانے کی وسعت ہے اور انقلاب کے مقابلے میں ان میں سے بعض کا مخصوص ہونا ہے۔

عالمی استکبار، بین الاقوامی معاشروں کے مروّجہ خیالات و معیارات سے ہم آہنگ ثقافتی مسائل کو متعارف کر کے اور اس ضمن میں انحرافی مسائل کو بیچ میں لاکر اپنے طور پر یہ کوشش کرتا ہے کہ انقلاب کو ثقافتی نقطۂ نظر سے عالمی سطح پر ناکارہ بنا دے اور بالآخر اسلامی ثقافت سے اس کا رشتہ منقطع کر دے۔

ابتک جو کچھ کہا گیا ہے وہ حقیقت میں ادراک و شعور سے متعلق تھا جس کے استعمال سے عاملانہ پروگراموں میں فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ بہ الفاظِ دیگر استکبار، ثقافتی جنگ کے لئے افراد کو ذہنی طور پر آمادہ کرنا چاہتا ہے کہ وہ نئی نئی چالیں چلنے اور جوڑ توڑ کرنے پر تیار ہو جائیں۔

لیکن ثقافتی جنگ نافذ کرنے کے طریقے وہ اقدامات ہوتے ہیں جو اس جنگ کے اصل مقاصد حاصل کرنے کے لئے کئے جائیں۔ یہ اقدامات دو قسم کے ہوتے ہیں:

الف— براہِ راست کئے جانے والے اقدامات جو قدرتاً محدود ہوتے ہیں اور وسعت پذیر نہیں ہو سکتے۔

ب— بالواسطہ کئے جانے والے اقدامات جن میں زیادہ تر کوشش اس بات کی ہوتی ہے کہ جنگ کے اس بُعد کے ساتھ زیادہ سے زیادہ طاقت مُختص کردی جائے۔

براہِ راست اقدام کرنے میں یونیورسٹیوں، مسجدوں اور مذھبی اداروں کے قیام کے متعلق جن باتوں کا بظاہر خیال رکھا جاتا ہے اُن میں افرادی قوّت کی تربیت ضروری ہے جو ان کی منصوبہ بندیوں کا ایک جزو ہوا کرتی ہے۔(۱)

دوسرے الفاظ میں سعودی حکومت اپنے تعلیمی اداروں میں غیر ملکی طلباء کو داخل کرتی ہے اور اُنہیں وہابیت کا مبلغ بننے کی تربیت دیتی ہے اور پھر اُنہیں اپنے اپنے ملکوں میں بھیج دیتی ہے۔ اس کے علاوہ مسیحی مبلغوں کا ذکر بھی یہاں ہونا چاہیے۔ گذشتہ برسوں کے دوران اس سلسلے میں مسیحیت، وہابیت اور دیگر مخالفِ اسلام عوامل کے ہم خود شاہد ہیں۔

وہابیت اپنے اندر بحث کا وسیع موضوع لئے ہوئے ہے۔ ابتک اس کے جو کم سے کم رسمی ادارے قائم ہیں اُن میں فقہِ اسلامی کی اسمبلی اور مساجد کی عالمی کونسل شامل ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ دو سال قبل فقہِ اسلامی کی اسمبلی کے آخری اجلاس میں جو اقرارنامہ متفقہ طور پر منظور ہوا اُسکی ایک شِق یہ بھی تھی کہ شیعیت اور ایران کے دفاع میں اب تک جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں، اُن سب کو نذرِ آتش کردیا جائے۔

دوسری جانب سعودی عرب کے وزیر اطلاعات نے یہ اعلان کیا تھا کہ ہر شخص کو اس بات کی اجازت نہیں ہوگی کہ نمازِ جمعہ یا دیگر نمازوں کی امامت کرے اور منبر پر جاکر عوام سے مخاطب ہو۔

اس کی روک تھام کرنے کے لئے، گئے برسوں میں سعودی فرمانرواؤں نے یہ حکم نافذ کیا

---

(۱)— مثال کے طور پر "فیصل" یونیورسٹی مدینہ کا نام لیا جاسکتا ہے۔ اس میں دس ہزار طلباء کو ہر سال "وہابی مبلغ" بنانے کی تربیت دینے کی گنجائش موجود ہے۔ تربیت حاصل کرنے کے بعد طلباء جب فارغ ہوجاتے ہیں تو انہیں دنیا کے کونے کونے میں بھیج دیا جاتا ہے۔

ایک اور مثال مسیحیوں کے مدارس اور یونیورسٹیوں کی ہے۔ بیروت کی امریکی یونیورسٹی جس کا ریکارڈ نسبتاً پُرانا ہے محض لبنان میں عیسائی مبلغوں کو تربیت دینے کی غرض سے قائم کی گئی تھی۔ یورپ اور امریکہ میں بھی ایسی یونیورسٹیاں قائم ہیں جو عیسائی مبلغوں کے ضروری عملے کے افراد کو تربیت دیتی ہیں۔

تھا کہ نمازِ جمعہ اور دیگر نمازیں پڑھانے والے تمام ائمہ کو اپنی اپنی حکومتوں یا سعودی عرب کی کسی یونیورسٹی سے اس اہلیت کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنا ہو گا جو پیش امام بننے اور منبر سے خطاب کرنے کا جواز ہو گا۔

اہم نکتہ یہ ہے کہ انہوں نے نمازِ جمعہ اور دیگر نمازوں کی پیش امامتی کے لئے صرف چند ایک قاعدے قانون ہی واضح نہیں کئے بلکہ پوری دنیا کے اس شعبے میں اپنی تنظیمی سرگرمیوں کا آغاز بھی کر دیا اور رابطۂ عالمِ اسلامی کے ادارے کو اس مقصد کے لئے کافی بڑی رقم بھی تفویض کی گئی۔

اسی ادارے کی دوسری شاخ کو مذاکرات اور سیمینار منعقد کرانے کی ذمہ داری بھی سونپی گئی۔ چنانچہ وہ جدّہ، ریاض اور دوسرے ممالک میں اس قسم کے مذاکرے اور سیمینار وغیرہ کا انعقاد کراتی رہتی ہے اور اس طریقے سے اپنے ہم خیال افراد کو اکٹھا کر کے فکری تحریکوں کی رہنمائی کرتی ہے۔

ویٹیکن (پاپائی حکومت) بھی اسی طرح برسرِ عمل ہے۔ ان سرگرمیوں میں سے جو خاص طور پر مسیحیت کے توسّط سے عمل میں آتی ہیں، امریکہ اور یورپ کے برّاعظموں سے ایشیا اور افریقہ میں اُن کے محلِ وقوع کی تبدیلی کا ذکر البتہ یہاں کرنا مناسب ہو گا۔ (۱)

ویٹیکن کی گذشتہ کانگرس میں یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ اس صدی کے آخر تک افریقہ کا پورا برّاعظم اعتقادی لحاظ سے عیسائیت کی چھتری تلے آجانا چاہیے۔ چانچہ اس سلسلے میں مشنری سرگرمیوں کے تیز تر ہونے اور انڈونیشیا، ملائشیا، بنگلہ دیش اور بھارت متعلقہ گروہوں کی کارروائیوں کے بڑھنے کی بعض رپورٹوں سے جو کبھی کبھی مبالغہ آمیز بھی ہوتی ہیں، معلوم ہوا کہ گذشتہ ایک یا ڈیڑھ سال کے عرصے میں بنگلہ دیش میں تقریباً ایک ملئین مسلمان اور ہندو آبادی نے عیسائی مذہب قبول کیا۔ اس کے متعلق صریحاً کہا گیا ہے کہ یہ سب کچھ مسیحی مشنریوں کی بڑھتی ہوئی تبلیغی سرگرمیوں کا نتیجہ ہے۔ تاہم بنگلہ دیش کی حکومت کی کمزوری

---

(۱)— اطالوی پریس نے یہ خبر شائع کی تھی "میشل عفلق" نے حال ہی میں ۲۵۰ ڈالر کی رقم افریقہ میں مسیحی سرگرمیوں کو تیز کرنے کے لئے ویٹیکن مشنری فنڈ کو دی تھی۔

اخبار "العراق" کے خبرنامے کے مطابق ویٹیکن مشنری فنڈ نے مشہور ویٹیکن کانگرس کے اجلاس کے بعد کام کرنا شروع کیا تھا۔

کے مابعد اثرات اور اس ضمن میں عیسائی ریاستوں کی طرف سے فراہم کردہ امداد کو بھی نظرانداز نہیں کرنا چاہئے۔ وہ عوام کی غربت اور محرومیت سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہیں اور گذشتہ برسوں میں افریقہ اور اس برّاعظم کے مسلمان ممالک جیسے نائجیریا، بنگلہ دیش اور مراکش (مراکو) میں پوپ کے دوروں کو بھی اس مشن کی تقلید میں دیکھنا چاہیئے۔

دریں حال ایک اور خبر سے جو مذکورہ بالا موضوع سے ہی متعلق ہے اور بڑی دلچسپ ہے، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تمام مخالفانہ کوششوں کے باوجود اسلام کی نشوونما اور وسعت بڑی مؤثر اور کارگر رہی اور شاید اسی وجہ سے مخالفین بھی کوئی نئی چال چلنے پر مجبور ہو گئے۔

اس خبر کا حاصل یہ ہے کہ کلیساؤں کی عالمی کونسل کے لیڈر، عیسائی اقوام میں اسلام کی وسعت گیریوں کے حوالے سے، اس بات کے خواہشمند ہیں کہ عیسائی مسلم روابط قریب تر ہو جائیں۔ (۱) دوسرے لفظوں میں وہ مسلمانوں اور اسلامی معاشروں کے درمیان پُل کی صورت اختیار کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ اس وسیلے سے اپنی سرگرمیوں کو اسلامی معاشروں میں وسعت دیکر من مانا فائدہ اُٹھا سکیں۔

بالواسطہ طریقے پر جو کہ بہت زیادہ خطرناک ہے اور زیریں ڈھانچہ مہیا کرتا ہے وہ اپنی حکومتوں پر دباؤ ڈالتے ہیں کہ اسلامی جمہوریۂ ایران کی سرگرمیوں کو روکا جائے یا اُس پر کڑی نگاہ رکھی جائے۔

گذشتہ برسوں میں ہم ایسے کئی معاملات سے دوچار ہوئے ہیں۔ یہ معاملات ہر نقطۂ نظر سے اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ یہ انقلابِ اسلامی کی وسعتِ اثر، حیثیت، اعتماد اور فکری قوت کے خلاف اُن کے خوف و اندیشے کا پرتو ہے۔ ایسی کسی بھی سرگرمی کے خلاف وہ فوراً ڈٹ جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ مغربی یورپ کے ملک جو بنیادی آزادیوں، انسانی حقوق، اقلیتوں کے حقوق کے مسائل اور اس طرح کی باتوں کے بارے میں بڑے بلند بانگ دعوے کرتے ہیں، اُنھوں نے بھی اپنے مفاد کی خاطر ہر جگہ ان تمام اتفاقات سے فائدہ اُٹھایا ہے اور اسلامی

---

(۱) ریوٹر کی رپورٹ کے مطابق اس کونسل کے ایک ذریعے نے اعلان کیا تھا کہ وہ اسلامی معاشروں سے اپنا ربط وضبط بڑھا رہا ہے اور اس کا مقصد جملہ مذاہب کے پیروکاروں کے درمیان اچھے تعلقات کا پیدا کرنا ہے۔ اس کا صدر دفتر جینیوا میں ہے اور تین سو سے زیادہ پروٹسٹنٹ، انجلیکن اور مشرقی راسخ العقیدہ گرجا اپنے چار ہزار ملئین اراکین کے ساتھ اسکی زیرِ نگرانی کام کر رہے ہیں۔

انقلاب کے خلاف مسلسل عمل پیرا ہیں۔ اس طرح اُنہوں نے اپنے مقاصد کے حصول میں ایسے ایسے اقدامات کئے ہیں جن کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی جمہوریہ پر جو الزامات و اتہامات اُنہوں نے عائد کئے ہیں، وہ خود اُن کے مرتکب ٹھہرے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر وہ یہ کہتے ہیں کہ ایران میں کسی کو آزادئ اظہار کا حق حاصل نہیں تو وہ خود ہی اس قانون کے خلاف عمل کرتے ہیں اور اگر وہ کسی مسلمان کو اپنے ملک میں اسلامی انقلاب کا مؤید و طرفدار پاتے ہیں تو اُسے فوراً ملک بدر کر دیتے ہیں۔ (۱)

دوسرا مسئلہ تناؤ اور جھگڑے کی فضا ہے جو صحت مند ثقافتی تحریکوں کی نشوونما اور ترقی کو روکنے کے لئے پیدا کی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ کھنچاؤ اور بدامنی کی فضا میں نہ تو کوئی شخص عام طور پر از خود کام کر سکتا ہے اور نہ ہی یہ سمجھ سکتا ہے کہ دوسرے کیا کام کر رہے ہیں۔

جہاں کہیں بھی اسلامی انقلاب نے ثقافتی نقطۂ نظر سے بہت جلد ترقی کی ہے یا اپنا گہرا اثر ڈالا ہے، مشرقی و مغربی استکبار نے وہیں گدلے پانی میں مچھلی کا شکار کھیلنے کے لئے مشکلات پیدا کی ہیں۔ اسکی ایک اہم اور نمایاں مثال مکّے میں خونین جُمعے کا المیہ ہے۔ (۲)

جیسا کہ ہم جانتے ہیں استکبار نے اس علاقے یعنی خلیجِ فارس اور مشرقِ وسطیٰ میں ہمیشہ تناؤ کی فضا پیدا کی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ ثقافتی انقلاب کی تحریک کو جو اس علاقے میں برتر حیثیت کی حامل ہے پھولتے پھلتے اور فروغ پاتے ہوئے دیکھنا نہیں چاہتا۔ اس

---

(۱)— بلجیئم میں چند ایرانی طلباء کو یہ سرکاری لیبل لگا کر مُلک بدر کر دیا تھا کہ وہ "غالی شیعہ اور حزب اللہ کے رُکن ہیں"۔ دوسری طرف بلجیئم کے اربابِ حکومت نے اسلامی جمہوریۂ ایران کے ثقافتی مرکز کو بند کر دیا تھا اور سرکاری طور پر ڈپلومیٹک مشن کو اطلاع دے دی گئی تھی کہ اُسے مسلمانوں سے رابطہ رکھنے یا مسلمانوں کے جلسوں یا اجتماعات میں حصّہ لینے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ حالانکہ اگر بلجیئم کے ایک جاسوس مبلّغ کو بھی بھارت سے نکال دیا جائے تو بلجیئم کے اخبارات سرورق پر یہ خبر شائع کر دیتے ہیں کہ آزادی، مذہب اور ۔۔۔۔ کو کُچل دیا گیا ہے کیونکہ بلجیئم کے رہنے والے ایک مبلّغ کو بھارت نے اپنے ملک سے نکال باہر کیا تھا۔

ایک دوسرے معاملے میں ترکی یونیورسٹی میں داخلہ لینے والے طلباء کو یہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ وہ لازماً ڈاڑھی منڈوائینگے اور سوٹ کے ساتھ نکٹائی استعمال کریں گے۔ خواتین تک کو بھی اسلامی انداز میں چادر اوڑھنے کا حق حاصل نہیں۔ یہاں کے اربابِ اختیار نے اعلان کر رکھا ہے کہ ترکی زبان میں اسلامی موضوعات پر شائع کتابوں کی درآمد ممنوع ہے۔ اس کے علاوہ ترکی کے اندر بھی اس قسم کی بے شمار پابندیاں لگی ہوئی ہیں۔

(۲)— اس اہم اور کم نظیر واقعے کا اسکی خصوصی اہمیت اور وسیع ابعاد کے پیشِ نظر مقالے کی صورت میں جائزہ لینا ضروری ہے۔ یہاں طولِ کلام سے بچنے کے لیے اس ضمن میں گفتگو سے احتراز کیا جاتا ہے۔

لئے تناؤ کھچاؤ کے شعلوں کو مسلسل ہوا دیتے ہوئے وہ اپنے خیال میں ملک کو فرسودگی کی جنگ میں مُبتلا کر کے اُسے کمزور بنانے پر تُلا ہوا ہے۔

ایک اور قابلِ توجہ مسئلہ انقلابِ اسلامی کے خلاف افواہ طرازیوں اور شکوک و شبہات پھیلانے کا ہے۔ یہ موضوعِ بحث بھی خاصا طویل ہے۔ مثال کے طور پر یہ افواہ پھیلائی گئی کہ ایرانیوں نے قرآنِ مجید کا ایک خاص نسخہ شائع کیا ہے یا یہ کہ شیعوں کا قرآن مجید ہی علیحدہ ہے۔ انقلاب کی ثقافتی حیثیت و اعتبار کو مجروح کرنے کے لئے استکبار اس قسم کی بے شمار افواہیں پھیلاتا رہتا ہے۔ مثلاً ایک اور حلقہ میں یہ افواہ گشت کر رہی ہے کہ ایران میں آثار قدیمہ کے عجائب گھر اور کتب خانے ویران کئے جا رہے ہیں اور پُرانی چیزوں (انٹیک) نیز ثقافتی ورثے کو تباہ کیا جا رہا ہے۔

دیگر اقدامات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انقلاب کی راہ میں روڑے اٹکائے جائیں اور اسلامی جمہوریہ کو کمزور بنا دیا جائے۔ یہ قدرتی امر ہے کہ جتنی زیادہ مشکلات سے کوئی ملک داخلی طور پر دست و گریبان ہو گا اُسی نسبت سے ثقافتی تحریک پر اُسکی گرفت عالمی سطح پر از خود ڈھیلی پڑتی جائے گی۔

ایک اہم ترین سازش مسلّط کردہ جنگ ہے کہ اس نظریئے کی رو سے قطعی طور پر اُس کا تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے عراقی حکومت کے نمائندے نے ایک بین الاقوامی کانفرنس میں صاف صاف کہا تھا: "ایرانی جمہوریہ اپنے انقلاب کو چونکہ خود عراق بر آمد کرنے کی خواہشمند تھی اس لئے ہم نے اپنے دفاع کی خاطر جنگ مول لی"۔ (۱) دوسرے لفظوں میں عراق کو یہ خوف تھا کہ آخرش ایک دن ایسا آئے گا جب یہ ثقافت اس کے لیے ڈراوے کا باعث بن جائے گی تو اس نے آئندہ کے احتمالی خوف سے بچاؤ کی خاطر اپنی طرف سے پہلے ہی دفاعی قدم اٹھا لیا۔ اس ضمن میں انقلاب کے مخالف ان چھوٹے چھوٹے گروہوں کی طاقت کو بھی ملایا جاسکتا ہے، جنہوں نے اسلام دشمن پالیسیوں کو پروان چڑھانے والوں کی تحریک سے مضبوط ہو کر عراق کا ساتھ دیا۔

آجکل دنیا میں غُربت و افلاس روز بروز رُو بہ ترقی ہے اور افریقہ میں تو خاص طور پر حالات

---

(۱)— ملاحظ کیجیئے عراقی حکومت کے نمائندے کی وہ تقریر جو اُس نے یونیسکو کے زیرِ اہتمام میکسیکو شہر میں "سیاست ھائے فرھنگی" کی کانفرنس منعقدہ ۱۹۸۲ء میں کی تھی۔

ناگفتنی ہیں۔

دنیا کے دیگر حصّوں میں بھی غُربت و افلاس نے قوموں کے گریبان پر ہاتھ ڈال رکھا ہے لیکن استکبار حسبِ معمول ان حالات سے، جو بجائے خود استکبار ہی کی پیداوار ہیں --- انقلابی تحریکوں اور ہمارے زمانے میں خاص کر اسلامی جمہوریۂ ایران کا مقابلہ کرکے --- ناجائز فائدہ اُٹھا رہا ہے۔ جب کبھی اسلامی جمہوریہ مسلمان عوام کی امداد کے لیے کوئی تحریک چلاتی ہے تو استکبار اس کا جوابی ردِّعمل پیش کرنے میں کبھی ڈھیل نہیں کرتا۔ (۱)

اس صورتِ حال میں طبعی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ وسیع اور کمر توڑ جنگ آخر اسلامی انقلاب کے خلاف کیوں شروع کی گئی ہے؟

ایک اور سوال جو پوچھا جاسکتا ہے یہ ہے کہ ان واقعات و حادثات پر اسلامی جمہوریۂ ایران کا ردِّعمل کیا ہے؟

جواباً یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس ثقافتی جنگ کی عظمت، اتنے بڑے حجم والے بجٹ، وسائل اور افرادی قوّت کے ساتھ، یہ ظاہر کرتی ہے کہ اسلامی انقلاب واقعی دنیا میں ایک مؤثر قوّت ہے جسے استکبار اور اس کے مفادات کے لئے خطرہ سمجھا جاتا ہے اور درحقیقت اسے یہ قوت حاصل ہے کہ ایک دنیا اس پر یقین رکھتی ہے۔ (۲)

روزنامہ نیویارک ٹائمز نے اپنی ایک اشاعت میں ایک مفصّل رپورٹ شائع کی ہے جو مختلف ممالک میں، جن میں مصر بھی شامل ہے، اسلام کے موجزن اور وسعت پذیر ہونے کے

---

(۱) --- جب اسلامی جمہوریۂ ایران مختلف ممالک کے سیلاب زدوں اور قحط زدوں کی امداد کرتی ہے اور امداد مہیّا کرنے والے ملکوں میں اسے اوّلیت کا شرف حاصل ہوتا ہے تو دوسروں کو فوراً اسلامی جمہوریہ کی موجودگی کا احساس ہونے لگتا ہے اور متعلقہ ملک سے کوئی رشتہ نہ رکھنے کے باوجود وہ بڑی بھاری تعداد میں امدادی اشیاء اُس ملک میں بھجوا دیتے ہیں۔

(۲) --- مثال کے طور پر انڈونیشیا کی آبادی، ایران کی آبادی سے تقریباً تین گُنا زیادہ ہے لیکن دنیا میں اس کا کوئی شمار نہیں۔ صرف انڈونیشیا ہی نہیں بلکہ دنیا کے ۹۵۰ ملئین مسلمان کسی گِنتی ہی میں نہیں اور یُوں بھی ان کی کیا اہمیت ہے! انڈونیشیا کے وزیرِ داخلہ نے ایک اجلاس میں جہاں مذہبی علماء بھی موجود تھے استاد مطہری (شہید)، صدر (شہید) اور علامہ طباطبائیؒ کی لکھی ہوئی بہت سی کتابیں اپنے سامنے رکھ لیں اور ان کے متعلق کہا کہ یہ سب اخلاق سوز کتابیں ہیں۔ اس فقرے کا مفہوم بالکل واضح ہے یعنی انڈونیشیا (ایک مسلم ملک) کا وزیرِ داخلہ مسلمان نہیں، عیسائی ہے۔

متعلق ہے۔

ریگن نے حال ہی میں یہ کام ھارورڈ یونیورسٹی کے سپرد کیا ہے کہ ایک بین الاقوامی کانفرنس بلاکر اور بہت سے علمائے اسلام اور سیاستدانوں کا ایک سیمینار منعقد کروا کے اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کی جائے کہ اسلام کی چڑھتی ہوئی سیلابی طاقت کو (جسے وہ اسلامی رجعت پسندی کا نام دیتے ہیں) کس طرح روکا جاسکتا ہے؟

بہر طور اس رویّے سے ظاہر ہے کہ وہ مذکورہ تحریک کا سامنا کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ اسی لئے انہوں نے اس مسئلے پر غور و فکر کرنا اور بہ نظرِ غائر اس کا مطالعہ کرنا شروع کر دیا ہے تاکہ اس کا کوئی مناسب حل تلاش کیا جاسکے۔ (۱)

قدرتی طور پر اسلامی جمہوریہ بھی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی ہوئی نہیں۔ اس نے بھی اچھے اقدامات کئے ہیں اور اب اس کی سرگرمیوں کی میزان (کم از کم کمیّت اور کبھی کیفیت کے لحاظ سے) پہلے برسوں کی نسبت بڑھ چکی ہے۔

ان اقدامات کے اثرات ہم اس وقت بھی دنیا کے گوشے گوشے میں دیکھ رہے ہیں۔

نیویارک ٹائمز کی جانب سے شائع کردہ رپورٹ میں ایک بڑا دلچسپ فقرہ ہے:۔

"درحقیقت یہ رپورٹ اسلامی انقلاب برآمد کرنے کی اس تحریک کی کامیابی کا ثبوت ہے جو انقلاب کی فیروزمندی کے ابتدائی ایام سے شروع ہو چکی تھی حالانکہ اس تحریک اور اس آئیڈیالوجی کو کئی لوگوں نے سنجیدگی سے نہیں لیا تھا اور کئی ایک نے تو اسکی مخالفت بھی کی تھی اور قومی مفاد کے منافی قرار دیا تھا۔ حضرت امام خمینیؒ کی ذات نے اس پالیسی کی بڑی قطعی اور زیرک انداز میں نہ صرف تائید کی بلکہ اس پر عمل بھی کیا۔ اپنے ایک بیان میں اُنھوں نے فرمایا: "ہم اپنے انقلاب کو پوری دنیا میں برآمد کر رہے ہیں کیونکہ ہمارا انقلاب اسلامی ہے تاکہ لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی آواز دنیا بھر میں گونج اُٹھے۔ یہ جنگ ہے اور جب تک جنگ جاری ہے اور اس کا رُخ دنیا بھر کے ہر خطے کے مستکبرین کی طرف ہے، ہمارا وجود

---

(۱)— مغربی جرمنی کی ایک خبر رساں ایجنسی کی اطلاع ہے کہ گذشتہ چند برسوں میں کم از کم ۳۰ ہزار اہلِ فرانس نے اسلام قبول کیا ہوگا اور فرانس اسلام کی طرف اپنے عوام کی رغبت کے مستقل عمل کا شاہد ہے۔ یہ میلان و رغبت اس حقیقت کی جانب اشارہ ہے کہ تمام کوششوں اور منظم منصوبہ بندیوں کے باوجود، یہ عمل اپنی پوری قوت سے جاری و ساری ہے اور یہی قوت اس تحرک کا سرچشمہ ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ ان میں اس عمل کو چیلنج کرنے کی سکت ہی نہیں ہے۔

بھی قائم ہے۔"

ایک اور بیان میں آپؒ نے فرمایا: "یہ جو آپ دیکھ رہے ہیں کہ اجنبی لوگ ایران کے خلاف اس قسم کا پراپیگنڈہ کر رہے ہیں اور ان کے گروہی ذرائع ابلاغ مسلسل ہمارے خلاف مصروفِ عمل ہیں، یہ محض اس لئے ہے کہ ہم اسلام پر قائم ہیں اور ہر جگہ اسلامی ثقافت کو پھیلانا چاہتے ہیں۔ مگر یہ لوگ ڈرتے ہیں کہ مبادا اسلام کو ان کے ملک میں فروغ حاصل ہو جائے اور پھر ان کے لئے کوئی دوسری جگہ باقی نہ رہے۔(۱)

اس طرح اسلامی انقلاب کے نفوذ کی بھی اور دوسروں کے اندیشوں کی بھی اور اس انقلاب کے خلاف ان کے جوابی ردِّ عمل کی بھی توجیہ ہو جاتی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ توقع تو نہیں کی جاسکتی کہ بین الاقوامی سطح پر اتنی عظیم ثقافتی طاقت کی تیاری اور اس کے مثالی اثر و نفوذ کے مقابلے میں استکباری دنیا ساکت اور بے حرکت بیٹھی رہے گی۔

اسمیں شک نہیں کہ دنیا ہماری پالیسی کے خلاف اپنا ردِّ عمل ظاہر کر کے رہے گی۔ حالات جو آجکل سطحِ جہاں پر نمودار ہو رہے ہیں، وہ بھی اس امر کے شاہد ہیں۔(۲)

مُسلّط کردہ جنگ

عظیم انقلاب کی فتح مندی کو زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ عراقی حکومت نے پہلے تو اسلامی جمہوریۂ ایران کے خلاف نفسیاتی، تبلیغاتی، سیاسی اور فوجی جارحیت کی ابتداء کی اور بالآخر اُس پر ظالمانہ جنگ مسلّط کر دی۔

ظاہر ہے کہ جارح عراقی حکومت کے اس فیصلے سے بڑھ کر جنگ کو اتنے بڑے پیمانے پر وسعت دینے کا کوئی اور ہی سبب ہو گا۔

---

(۱) صحیفۂ نور، ج ۱۷، ص ۸۳۔

(۲) یہ حصہ مصنف کی اُس تقریر کا خلاصہ ہے جو اُس نے تہران یونورسٹی کے ایک سیمینار میں کی تھی اور جسے بعد میں انٹرنیشنل اور پولیٹیکل سٹڈیز کے دفتر نے جو امور خارجہ کی وزارت سے ملحق ہے "سیمینار رپورٹ نمبر ۶" کے عنوان سے شائع کیا تھا۔

انقلابِ اسلامی ایرن کے مقابلے میں عالمی استکبار کی پھیلائی ہوئی متحدہ تحریک جو انقلاب کو ختم کرنے یا کم سے کم اسے ایران کی جغرافیائی حدوں تک محدود رکھنے کے لئے تھی وہی حقیقت میں عراقی حکومت کے لئے چند روز میں فتح کر لینے کی موہوم اور بے بنیاد اُمید کے تحت ہمارے ملک پر حملہ آور ہونے کی خاطر قطعی طور پر حوصلہ افزا بنی۔

ایک طرف سے ایران کی اقتصادی و فوجی ناکہ بندی اور دوسری جانب سُپر طاقتوں کی طرف سے عراقی حکومت کو ہر طرح کی امداد کی فراہمی اسی بات کا روشن ثبوت ہے۔ موجودہ حالات میں اسلامی جمہوریۂ ایران غیر ملکی طاقتوں پر انحصار کئے بغیر اور انقلاب کے ان اعلیٰ مقاصد سے جو اسلام کی عظیم ثقافت سے نمو پائے ہیں نیز اپنے بہادر جہاد آزماؤں کی عظیم خلاّقیتوں کی وسعت سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے مقدس دفاع کو کفر کے متحدہ محاذ کے مقابل اپنے آئینی حقوق کی حفاظت کے لئے جاری رکھے ہوئے ہے۔

فوجی جارحیت کا آغاز

عراقی فوج نے عالمی استکبار اور علاقائی رجعت پسندی کی بڑی وسیع پراپیگنڈہ کے ساتھ ہم آہنگ اور متحد ہو کر ۲۲ ستمبر ۱۹۸۰ء کو (۳۱ شہریور ماہ ۱۳۵۹) بین الاقوامی سرحدوں کے قانون کی خلاف ورزی کر کے اپنے بارہ مسلح اور پوری طرح لیس ڈویژنوں کے ساتھ حملہ کیا اور ایران کی اسلامی جمہوریہ کے علاقے میں ایک وسیع رقبے پر قبضہ جما لیا۔ اس جارحانہ حملے کے نتیجے میں سرحد کے نزدیک واقع دیہاتوں اور شہروں کے بے شمار لوگ تہِ تیغ ہوئے اور بہت سے زخمیوں کو جنگی قیدی بنا کر عراق نے اپنے فوجی کیمپوں میں داخل کر لیا۔ ان ایرانی جنگی قیدیوں کا ایک بڑا حصّہ آج بھی عراق کے پاس ہے۔

برّی افواج کے حملوں کے بعد اُسی دور میں عراق کی فضائیہ نے بیسیوں بمبار جنگی طیاروں سے ایران کے ہوائی اڈوں پر حملہ کر دیا اور اپنے اس جارح عمل سے تمام محاذوں پر کھُلی جنگ شروع کر دی۔

مسلّط کردہ جنگ کی ماہیت،

اسلامی انقلاب کے خلاف عالمی استکبار کی سازش جو اقتصادی، سیاسی، تبلیغاتی اور نفسیاتی جیسے مختلف پہلوؤں اور انجامِ کار نفسیات ہی کے پہلو پر محیط ہوتی ہے، اس عظیم سازش کی ابعاد کو تفصیل کے ساتھ بیان کرتی ہے جو اس طریقے سے کسی قوم یا کسی انقلاب کے خلاف عمل میں لائی گئی ہو۔

وجہ یہ ہے کہ اسلامی انقلاب نے ایران میں اسلام کو ایک نیا مفہوم دیا ہے جسکی روشنی میں دنیا بھر کے مسلمان سیاسی، معاشرتی اور ثقافتی شعبوں میں ایک قوتِ محرکہ بن کر اُبھر آئینگے۔

یہی سبب ہے کہ جب استکبار انقلاب کی فیروزمندی کے ڈیڑھ سال گذر جانے کے بعد اپنی سازشوں میں کامیاب نہ ہوسکا تو اُس نے جنگ مسلّط کرنے اور ہمارے اسلامی ملک پر عراق کی طرف سے ایک بھرپُور جارحانہ فوجی حملہ کروانے کے لیے اپنی توجہ ضروری اقدامات لینے پر مرکوز کردی۔ لہٰذا اس جنگ اور دوسری تمام جنگوں میں جو دنیا کے مختلف حصّوں میں لڑی جاتی ہیں، یہی بُنیادی فرق ہے۔

موجودہ جنگ میں جہاں فی الواقع "کفر" اور "اسلام" کے مابین معرکہ ہے، یہ صرف عراق ہی نہیں جو اسلامی جمہوریہ کے خلاف مصروفِ جنگ ہے بلکہ یہ تمام چھوٹے اور بڑے مستکبروں اور استکباری ریاستوں کا گٹھ جوڑ ہے جو ہمارے ملک کے مقابلے میں صَف آرا ہوچکا ہے۔

دوسری طرف یہ صرف اکیلا ایران ہی نہیں جو اس غیر منصفانہ جنگ میں دشمن کے تیروں کا نشانہ بنا ہوا ہے اور اپنا دفاع کررہا ہے بلکہ اصلاً یہ اسلام ہے جو اپنے دفاع میں جارحیت کے خلاف ڈٹا ہوا ہے کیونکہ اگر ایران ہی کو محض اپنی سیاسی تبدیلی اور عظیم اسلامی انقلاب کی بدولت اپنی تغییر حالت پر سوچ بچار کئے بغیر نشانہ بننا تھا تو اصولی طور پر کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ ایران اتنی استقامت اور ثابت قدمی کے ساتھ اتنی طویل مدّت کے لئے اپنی جگہ پر قائم رہ سکتا تھا۔

یہ وہی ایران تھا جو دوسری جنگِ عظیم کے دوران چند ساعتوں کے لئے بھی غیر ملکی فوجوں کی تابِ مقاومت نہ لاسکا اور غیر ملکی طاقتوں کی بالواسطہ یا بلاواسطہ موجودگی کے باوجود اس نے زیادہ دیر تک مغرب کی ثقافتی یلغار کی مزاحمت بھی نہیں کی اور استکبار کے بھاری بوجھ کو اپنے کندھوں پر اُٹھائے رہا اُسے پُر اثر آہ و فریاد کرنے کی ہمت بھی نہ ہوئی۔

اس طرح ہر اصطلاحی مفہوم میں یہ مقابلہ "اسلام" کا "کفر" کے ساتھ مقابلہ ہے۔ متحد ہو کر مسلّط کردہ جنگ کا فلسفہ اور عالمی استکبار کی طرف سے اِسکو طول دینا بھی ایران کے اسلامی معاشرے کے فکری و اعتقادی مظہر کے روزافزوں اثر و نفوذ اور اسکی وسعت پذیری کو روکنے کے لئے ایک پُر غضب اور تشدد آمیز طریقہ تھا۔

اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ مسلّط کردہ جنگ میں جو اسلام اور کفر کے مابین ایک معرکے کی حیثیت رکھتی ہے، عالمی استکبار نے عراق کی بعث پارٹی کی حکومت کو مدد دینے کے لئے جتنے بھی اقدامات کئے ہیں، ملّتِ ایران کے اُس عزمِ راسخ پر ان کا معمولی سا اثر تک بھی مرتب نہیں ہوا جو ملکی سلامتی کے دفاعی فرض کو جاری رکھنے سے متعلق ہے۔

اسلامی انقلاب کے رہبرِ کبیر امام خمینی (رضوان اللہ علیہ) نے اپنے ایک اہم اور تاریخی پیغام میں ۱۴۰۷ھ کے ایام حج کے موقع پر دنیا بھر کے مسلمانوں اور مستضعفین کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا:

"جہانخواروں (مستکبرین) اور اُن کے بیضمیر نوکر چاکروں کے نزدیک اس سے بڑا گناہ اور کیا ہوگا کہ کوئی شخص اسلام اور اس کی حاکمیت کے متعلق گفتگو کرے اور مسلمانوں کو عزّت و آزادی کے ساتھ ثابت قدم رہنے کی دعوت دے؟۔۔۔۔۔۔"

اسی خطابی پیغام کے دوسرے حصّے میں مسلّط کردہ جنگ کے متعلق آپؒ نے فرمایا:

"آج بلاشبہ تمام اسلامی اقوام و ممالک کی تقدیر ہماری تقدیر کے ساتھ جنگ میں گرہ زدہ ہے۔ اسلامی جمہوریۂ ایران ایسے مرحلے پر ہے کہ اسکی فتح تمام مسلمانوں کی فتح ہے اور خدانخواستہ شکست ہوئی تو وہ بھی جملہ اہلِ ایمان کی رسوائی و ناکامی کا باعث ہوگی۔ کامیابی کے آدھے راستے میں اگر کسی قوم، کسی ملک یا کسی بزرگ مکتبِ فکر کا ساتھ چھوڑ دینا بشریت کے اعلیٰ اصولوں اور اللہ کے رسولؐ کے خلاف خیانت کرنے کے مترادف ہے۔ لہٰذا ہمارے ملک میں جنگی بخار اُس وقت تک نہیں اُترے گا جب تک صدام زوال آشنا نہیں ہوتا اور

خدا نے چاہا تو یہ بہت جلد ہونے والا ہے۔"

اس جنگ کے نتائج کے متعلق عالمی استکبار کے احساسات کا اندازہ دنیا کے دونوں بلاکوں کے ان بیانات و رجحانات سے کیا جاسکتا ہے جو مسلّط کردہ جنگ میں ایران کی فتح کو مسدود کرنے کی ضرورت پر مبنی ہیں۔

یہ نکتہ کہ صدام عرب رجعت پسندوں اور عالمی استکبار کے نمائندے کی حیثیت سے اُن کا محافظ بن کر اسلامی انقلاب کے مقابلے میں آچکا ہے۔ تابِ مقاومت اور ثبات و استقامت کی قدر و قیمت اور ایرانی مسلمان قوم کے دلیر لڑنے والوں کی ہمتوں میں اضافہ کر دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی انقلاب کی رُوحانی کشش بھی بڑھ جاتی ہے۔

عالمی طاقتوں کی جنگ آرائیوں کے باوجود اسلامی جمہوریۂ ایران کے لئے ایران بلاشک و شبہ اس جنگ میں پیغام الٰہیہ کا مبلغ ہے اور یہ پیغام فتح حاصل ہونے تک اثبات و استقامت کا پیغام ہے اور یہ تو مسلّمہ امر ہے کہ استقامت کا یہی جذبہ سُپر طاقتوں کو زوال پذیر کر کے رہے گا۔ صبر کیجیئے! بے شک اللہ کا وعدہ سچّا ہوتا ہے۔

اقتصادی گھیراؤ

عالمی استکبار، بعض وجوہ کی بناء پر جن میں سے چند ایک کا ذکر پچھلے ابواب میں ہو چکا ہے، اسلامی انقلاب کے ساتھ گرمِ ستیز ہونے اور مقابلہ کرنے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا تھا اور یہ نبرد و مقابلہ ـــــ جبکہ انقلاب کے تمام خصائص اپنی جگہ بر قرار ہوں ـــــ حسبِ معمول جاری رہتا ہے۔ اس قسم کے تمام مقابلوں میں ایک مقابلہ وہ تھا جس سے ایرانی اقتصاد پر سخت ضرب پڑی تھی کیونکہ اگر کسی ملک کی اقتصادی حالت ہی مفلوج ہو کر رہ جائے تو پھر وہ قوم بڑی تیزی اور آسانی کے ساتھ ابتری کے گڑھے میں گر جاتی ہے۔ نفرتیں شدید تر ہو جاتی ہیں۔ معاشرتی کھنچاؤ بڑھ جاتے ہیں اور اربابِ اختیار کے ہاتھوں سے اختیارات تک چھن جاتے ہیں۔ اس طرح مختلف شعبوں میں ابتری، کھنچاؤ اور بدامنی کی مستقل موجودگی کسی نظام کی اصل کو پارہ پارہ کر دیتی ہے۔

امریکی استکبار جو ایران میں نئے اور انقلابی نظام کی نشوونما کو اپنے توسیع طلب اغراض کے منافی سمجھتا ہے تہران میں سابق امریکی سفارت پر قبضہ کرنے کے بہانے ۴ نومبر ۱۹۷۹ء کو (۱۳ آبانماہ ۱۳۵۸ شمسی) ایک جاسوسی گروہ (جو بظاہر امریکی سفارت کاروں پر ہی مشتمل تھا) کو یرغمال بنالیا گیا۔ اس کے نتیجے میں، ۷ اپریل ۱۹۸۱ء کو (۱۸ فروردین ماہ ۱۳۵۹ شمسی) ایران کے ساتھ اپنے سیاسی روابط توڑ دینے کا اعلان بھی کر دیا اور اس کے فوراً بعد ہی ایران کا اقتصادی محاصرہ بھی کر لیا گیا۔

اس طرح مذکورہ تاریخ ہی سے امریکہ نے ایران کو اپنی برآمدات کا سلسلہ بند کر دیا جبکہ امریکی کمپنیاں اقتصادی ناکہ بندی کے اعلان سے پہلے ہی ایران کے ساتھ اپنے تجارتی تعلقات منقطع کر چکی تھیں۔ اسی طرح ۲ اُردیبہشت ماہ ۱۳۵۹ شمسی کو انگلستان کے سوا یورپ کی مشترکہ منڈی کے تمام رُکن ممالک نے اسلامی جمہوریہ کا اقتصادی بائیکاٹ کرنے کا عہد کر لیا اور اس پر عمل درآمد کی راجع بہ ماضی تاریخ ۵ نومبر ۱۹۸۰ء کا اعلان کر دیا گیا۔

جمی کارٹر نے جو اس وقت امریکہ کا صدر تھا، اقتصادی ناکہ بندی کی اس پالیسی پر عمل کرتے ہوئے ایران کو امریکی برآمدات بند کر دینے کے علاوہ جس میں پہلے سے خریدے ہوئے فاضل پُرزے بھی شامل تھے اور اسلحہ نیز غیر فوجی ساز و سامان خریدنے کے عوض جو رقم ادا کی جا چکی تھی، اُسے بھی روکتے ہوئے، یہ اعلان کیا کہ ایران کا آٹھ بلئین ڈالر کے برابر محفوظ سرمایہ اور جمع زرِمبادلہ جو امریکہ میں پڑا ہے منجمد کر لیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی اپنی حکومت کی طرف سے یہ بھی اعلان کروا دیا کہ امریکی فرموں، امریکہ میں مقیم باشندوں اور یرغمال شدہ افراد کے خاندانوں کو ایران کے منجمد کئے ہوئے زرِمبادلہ کے وسائل سے ادائگیاں کی جائیں گی۔

اقتصادی بائیکاٹ کے ابتدائی مراحل میں اسلامی جمہوریۂ ایران کے خلاف امریکی عدالتوں میں بہت سے مقدمات غیر فیصل شدہ پڑے ہوئے تھے جن کی تعداد بعد میں مزید مقدمات کے دائر ہو جانے کی وجہ سے بڑھ کر ۳۸۴۲ تک جا پہنچی۔

مذکورہ بائیکاٹ کے منفی اثرات، ملک میں اقتصادی شعبوں کی قریبی غیر ملکی وابستگی کے پیشِ نظر ——— جو اسلامی انقلاب سے قبل کے معاشرے سے ناقص اقتصادی نظام اور مروّجہ مصرفی رجحان کی شکل میں بطور ورثہ ملے تھے ——— قدرتی طور پر بہت سخت اور

ضرر رساں سمجھے گئے۔

سال ۵۷-۱۳۵۶ شمسی (۱۹۷۸ء) یعنی گذشتہ عہدِ حکومت کی زندگی کے آخری سال میں امریکی اربابِ اختیار کے جاری کردہ بیانات کے مطابق ایران اور امریکہ کے مابین اشیاء کے تبادلہ کی مجموعی رقم ۶ء۶ بلئین ڈالر سے متجاوز ہو چکی تھی جس میں سے ۶ء۳ بلئین ڈالر امریکہ سے ایران میں درآمدات سے متعلق تھے اور ۹ء۲ بلئین ڈالر کا تعلق امریکہ کو ایرانی برآمدات سے تھا۔ (۱)

لہٰذا اس طرح کے اقتصادی کارناموں اور امریکہ کے ساتھ تبادلہ اشیاء نیز مغربی یورپ کے دیگر ممالک کے ساتھ بھی اسی نوع کے تبادلوں کے پیشِ نظر امریکی آقاؤں نے بھانپ لیا کہ اگر امریکہ اور اس کے مغربی حلیفوں کی طرف سے مکمل بائیکاٹ کا نفاذ ہو جائے تو اسلامی جمہوریۂ ایران کا نوزائیدہ اقتصاد اس کے سامنے ٹھہر نہیں سکے گا اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی آشفتگی و ابتری جو مصرفی و غذائی اشیاء میں کمی کے باعث بحران کی صورت اختیار کرلے گی وہ اسے شیطانِ بزرگ کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دے گی۔

ظاہر ہے کہ یہ صورتِ حال انقلاب سے پہلے کے دور میں مغرب پر انحصار کرنے والے صارف معاشرے کو اشیاء کی کمیابی کو دور کرنے کے لئے فوراً اعصابی دباؤ اور اضطرابی تلاش سے برانگیختہ کر دیتی لیکن اصل نکتہ جسے مغرب کے باخبر اور صاحبِ نظر بھی نہ پا سکے وہ ایران کے معاشرتی ابعاد خصوصاً عوام الناس کے درمیان اسلامی فکر و ثقافت کی ترقی و نشو و نما میں گہری اخلاقی اور روحانی تبدیلیاں تھیں۔

استکباری طاقتوں نے اسلام کی انقلابی ثقافت کو کم مایہ جاننے کے سبب ایرانی عوام کی اس نفرت و حقارت کو سمجھا ہی نہیں جو غیر ملکی طاقتوں کے سامنے گذشتہ حکومت کی فروتنی اور فرمان پذیری کے خلاف پوری طرح ان کے دلوں میں جاگزیں ہو چکی تھی اور نہ ہی سیاسی آزادی میں اُن کی طرف سے کی جانے والی فیاضانہ اور پُرخلوص امداد اور نہ اسلامی جمہوریۂ ایران کے اقتصادی لحاظ سے خود کفیل ہونے کی اُنہیں کوئی خبر تھی۔

ایران کی حکومت اور عوام کے عزمِ صمیم کے نتیجے میں جو استکباری چالوں کے خلاف جنگ پر مبنی تھا، اقتصادی بائیکاٹ کے نافذ ہونے کے دو سال بعد یعنی ۱۹۸۱ء

---

(۱) — یہ برآمدات عام طور پر تیل کی مصنوعات پر مشتمل تھیں۔

(۱۳۶۰ شمسی) میں ایران اور امریکہ کے مابین تجارتی روابط اتنے کم ہو گئے تھے کہ امریکی وزراتِ تجارت نے اس کے اعداد و شمار تک شائع کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔

بہر حال یہ اقتصادی محاصرہ یرغمالیوں کی رہائی تک جاری رہا اور ۱۲ اسفند ۱۳۵۹ (۳ مارچ ۱۹۸۱ء) کو جب اسے منسوخ کر دیا گیا تو بہت سی امریکی فرموں نے رفتہ رفتہ ایران کو غذائی اجناس اور دیگر اشیا بر آمد کرنے کی کئی ایک تجاویز پیش کیں لیکن اس نوع کے روابط کا قیام چونکہ اسلامی جمہوریہ کی پالیسی کے مطابق نہیں تھا، اس لیے ان تمام تجاویز کو رد کر دیا گیا۔

گردشِ وقت نے آخر یہ ثابت کر دیا کہ اس قسم کی سازشوں کے عمل مسلمانوں خصوصاً ایران کی مسلمان مخلص قوم کے عزمِ راسخ میں بھی کوئی ضعف پیدا نہیں کر سکتے بلکہ اس کے بر عکس اسلام کی بنیادی تعلیمات پر ایمان و یقین کی قوت نے سیاسی آزادی اور اقتصادی خود کفالت حاصل کرنے کے لئے ہمارے اندر ایک ولولہ انگیز تحریک پیدا کر دی ہے۔

اس جنگ کے باوجود جو عراق نے ایران پر مسلّط کی ہے اور عالمی استکبار کُھلے دل سے وسیع پیمانے پر امداد دے کر جسکی حوصلہ افزائی کر رہا ہے، اِن تمام سختیوں اور مشکلات نے عوام کی خلّاقیت اور جہاد آزمائی کے جوہر نمایاں کرنے میں بڑا کردار ادا کیا ہے۔ اسی کے نتیجے میں اسلامی جمہوریۂ ایران نے مختلف النوع ابعاد کے کئی ایک دائروں از قبیل زراعت، امورِ سیاسی، معاشرتی اور فوجی وغیرہ میں بڑی قابلِ قدر اور مؤثر ترقی کی ہے جو صرف ایران سے دلچسپی رکھنے والی پارٹیوں ہی کے لئے نہیں بلکہ اسلامی انقلاب کے مخالفین کے لئے بھی باعثِ حیرت و ستائش ہے۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ اقتصادی اور تکنیکی آزادی نصیب نہ ہونے سے سیاسی آزادی بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ اگر اسلامی جمہوریۂ ایران سوچی سمجھی منصوبہ بندی کے ساتھ اقتصادی آزادی کی طرف اپنی پیش رفت جاری نہ رکھ سکی تو عالمی استکبار اس ملک کے اقتصاد پر دباؤ ڈال کر کچھ عرصہ بعد اسلامی انقلاب کو اُس کے اپنے اصلی راستے سے، جو مشرق و مغرب کے تسلّط کے خلاف اعلانِ جنگ ہے، منحرف کر دے گا اور انجامِ کار آگے چل کر اُسے کسی ایک موجود بڑی طاقت کے سامنے جُھکنا پڑے گا۔

جب سپر طاقتیں کسی مُلک کی اقتصادی نبضیں اپنے ہاتھوں میں تھام لینے کی حالت میں

ہوں تو اُس وقت سیاسی آزادی کی قدر و قیمت محض نعرہ بازی سے زیادہ اور کچھ نہیں ہوتی۔ لیکن خوش قسمتی سے گردش وقت، اسلامی انقلاب کی اپنائی ہوئی پالیسی، حضرت امام خمینی رحمۃ اللہ علیہ کی بے مثال رہبری اور مختلف دائروں میں خود کفیل ہونے کی پیشرفت نے کفر کے جملہ سربراھوں اور استکبار کو مایوس و درماندہ کر دیا ہے۔

NAJAFI BOOK LIBRARY
Shop No. 11,
M... Heights
Mirza Kaleej
Baig Road,
Soldier Bazar
Karachi.
MASOOMEEN WELFARE TRUST (R)

فصلِ پنجم: چند جملوں میں

o ـــــ عام طور پر انقلابات کی خصوصیات کے متعلق دو نظریے بیان کئے جاتے ہیں۔

الف۔۔ جملہ معاشرتی انقلابات میں بلا لحاظِ شکلِ ظاہری اُن کی اپنی اقتصادی و مادّی ماہیت ہی اُن پر حکمران ہوتی ہے۔

ب۔۔ جملہ انقلابات کے رگ و ریشے اقتصادی اور مادّی زمینوں ہی میں نہیں ہوتے۔ معاشرے میں محرومی اور خوش حالی کا وجود بھی انقلاب کو معرضِ وجود میں لانے کی شرطِ اصلی نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ انسانی تحریکات اور مذہب بھی فیصلہ کُن عامل اور انقلاب آفرینی کا سبب بن جائے۔

o ـــــ استکباری نظاموں کا اسلامی انقلاب کے مقابلے میں آنے کا سبب **اسلامی** جمہوریۂ ایران کے نظام کی اپنی آئیڈیالوجی سے وابستگی ہے

o ـــــ اسلامی انقلاب کے مقابلے میں استکباری نظاموں کی خصوصیات حسبِ ذیل باتوں سے عبارت ہوتی ہیں۔

۱۔۔ اسکی جامعیت

۲۔۔ سازشوں کی منصوبہ بندی

۳۔۔ تشدّد و تمرّد

اسلامی انقلاب کے خلاف استکبار کی ثقافتی جنگ لڑنے کی خصوصیات درجہ ذیل باتوں سے عبارت ہوتی ہیں۔

۱۔۔ دراز مدّت ہونا

۲۔۔ بنیادی اور انتہا پسند ہونا

۳۔۔ بظاہر حق بجانب اور قانونی ہونا

۴۔۔ بالواسطہ ہونا

o ——— گذشتہ صدی میں استکبار کا ایک حربہ مسلمانوں کے درمیان شیعہ سُنّی کا فرقہ وارانہ جھگڑا پیدا کر کے نفرت کا بیج بونا تھا تاکہ امّتِ مسلمہ کے درمیان تفرقہ پڑ جائے۔ اسی حربہ کو ایرانی انقلاب کے خلاف دوبارہ آزمایا جارہا ہے۔

o ——— خطرناک جنگ جسے استکبار ہوا دے رہا ہے وہ اسلام بمقابلہ اسلام ہے۔

o ——— حکومتِ حجاز ثقافتی غلبہ حاصل کرنے اور افریقہ میں وہابیت کی تحریک کو وسعت دینے کے لئے دو دھاری تلوار سے کام لے رہی ہے۔

الف — سیاسی اقدامات کے ذریعے اور افریقی ممالک سے روابط استوار کر کے

ب — ان ممالک کو اپنے مالی اداروں کے ذریعے مالی امداد مہیّا کر کے

o ——— مغربی لبرلزم (Liberalism) اسلامی انقلاب کے خلاف ثقافتی جنگ کا ایک دوسرا محور بھی ہے۔

o ——— اس جنگ میں لبرلزم کے لیور (بیرم) بشری حقوق، اقلیت کے حقوق، عورتوں کے حقوق، بُنیادی اسامیاں اور اس قسم کے دیگر حربے ہیں جنھیں بین الاقوامی فورم میں اسلامی انقلاب کے خلاف استعمال کیا جاتا ہے۔

o ——— ثقافتی جنگ جاری کرنے کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔

الف — براہِ راست لیکن محدود اقدامات کی شکل میں جیسے یونیورسٹیوں، مذہبی اداروں، مسجدوں اور خاص مقاصد کے لئے طلباء کی تربیت گاہوں کا قیام۔

ب — بالواسطہ لیکن غیر محدود اقدامات کی شکل میں جیسے دوسری حکومتوں پر دباؤ ڈالنا کہ وہ اسلامی جمہوریہ کی ثقافتی سرگرمیوں کی راہ میں روڑے اٹکاتے رہیں۔

o ——— مسلّط کردہ جنگ خاص طور پر اسلام کے جمہوری نظام اور اسلامی انقلاب جو دشمن کی نظر میں رجعت پسندانہ اسلام ہے، کے پھیلاؤ کو مسلم ممالک میں روکنے کے لئے اس علاقے میں ایک سازش کے تحت شروع کی گئی ہے۔

NAJAFI BOOK LIBRARY
Managed by Masoomeen Welfare Trust (R)
Shop No. 11, M.L. Heights,
Mirza Kaleej Baig Road,
Soldier Bazar, Karachi-74400, Pakistan

فہرستِ منابع و مآخذ

۱— قرآن مجید۔

۲— منصوری، جواد: ویژگیهای امپریالیسم، تھران، حزب جمھوری اسلامی چاپ دوم

۳— منصوری، جواد: نظری بہ سیاست خارجی جمھوری اسلامی ایران، مؤسسہ انتشارات امیر کبیر، تھران ۱۳۶۵۔

۴— ڈاکٹر معین، محمد: فرہنگ فارسی، چاپ سوم، انتشارات امیر کبیر

۵— ڈاکٹر داوری اردکانی، رضا: انقلاب اسلامی و وضع کنونی عالم، انتشارات مرکز فرہنگی علامہ طباطبائی۔

۶— ڈاکٹر علومی، رضا: اصول علوم سیاسی، جلد اوّل، انتشارات مؤسسہ مطالعات و تحقیقات اجتماعی۔

۷— ڈاکٹر بہار، مہدی: میراث خوار استعمار، انتشارات امیر کبیر، چاپ پانزدہم۔

۸— برانٹ، ویلی: جہان مسلّح، جہان گرسنہ، ترجمہ از ہرمز ہمایون پور سازمان انتشار و آموزش انقلاب اسلامی۔

۹— آدمیت، فریدون: امیر کبیر و ایران

۱۰— ڈاکٹر الہٰی، ہمایون: دیکتاتوری کارتلہا، انتشارات امیر کبیر۔

۱۱— شوادران، بنجامن: خاورمیانہ نفت و کشورہائے بزرگ ترجمہ از عبدالحسین شریفیان

۱۲— روحانی، فؤاد: تاریخ ملّی شدن نفت ایران، انتشارات کتاب ھای جیبی۔

۱۳— روزنامہ اطلاعات

۱۴— شہید مطّہری، مرتضیٰ: پیرامون انقلاب اسلامی، انتشارات صدرا

۱۵— صحیفۂ نور، تھران، مرکز مدارک فرہنگی انقلاب اسلامی (وابستہ بہ وزارت فرہنگ و ارشاد اسلامی)

۱۶— ڈاکٹر گنجی، منوچہر: سازمان ملل متحد در تئوری، جلد اوّل، انتشارات کتابہای جیبی۔

۱۷— آشنائی با سازمانہای بین المللی۔ انتشارات وزارت امور خارجہ جمھوری اسلامی ایران۔

۱۸— گزارش سیمینار ۴، ۵۔ انتشارات دفتر مطالعات سیاسی و بین المللی وزارت امور خارجہ
۱۹— سی ام، وود، ہاوس: عملیات چکمہ، ترجمہ فرح ناز شکوری، انتشارات نشرِ نو۔
۲۰— سمپسون، انتھونی: بازار اسلحہ۔
۲۱— وود نسون، ماکسیم: اسرائیل و اعراب، ترجمہ ابراہیم دانای۔
۲۲— مسروان، شرایئبر، ژان ژاک: تکاپوی جہانی، ترجمہ عبدالحسین نیک گہر۔
۲۳— ھالیدی، فرد: دیکتاتوری و توسعہ سرمایہ داری در ایران ترجمہ فضل اللہ نیک آئین
۲۴— عنایت، حمید: اندیشۂ سیاسی در اسلام معاصر ترجمہ بہاء الدین خرمشاہی۔
۲۵— آل احمد، جلال: در خدمت و خیانت روشن فکران
۲۶— رائین، اسماعیل: فراموش خانہ و فراماسیونری در ایران، انتشارات امیر کبیر
۲۷— مکی، حسین: مدّرس قہرمان آزادی، انتشارات بنگاہ ترجمہ و نشر کتاب۔
۲۸— مدرسی چہاردھی: سید جمال الدین و اندیشہ ھای او، انتشارات پرستو۔
۲۹— تیموری، ابراھیم: قرارداد ۱۸۹۰ رژی تا تحریم تنباکو اولین مقاومت منفی در ایران، انتشارات کتاب خانۂ سقراط۔
۳۰— طباطبائی، علّامہ محمد حسین: ترجمۂ المیزان۔

الشہید سیّد محمد باقر الصدرؒ کے افکار و تعلیمات کا مجموعہ

ہمارا پیام

(ترجمہ: رسالتنا)

○ —— فکری، سیاسی اور تمدنی انقلاب کا قرآنی پیغام۔

○ —— نوجوانوں کے نام سید محمد باقر الصدرؒ کا پیغام۔

○ —— عالمِ دین کے قلم سے سیاست اور قرآنی سیاست کے زاویے سے تعلیم اسلام۔

اگر آپ آج مسلمانوں کو درپیش مسائل پر سوچنا چاہتے ہیں۔

—— اسلامی انقلاب کا فلسفہ اور اس کے امکانات سے باخبر رہنا چاہتے ہیں۔

—— دنیا کے افکار اور علمائے اسلام کی پیش قدمیوں سے مطلع رہنا چاہتے ہیں ——

تو —— کتاب کا مطالعہ فرمائیے۔

دیدہ زیب سرورق	سفید کاغذ	آفسیٹ طباعت	قیمت ۔/ روپے